تاریخِ عاشورا

(تحریکِ کربلا کے پس منظر و پیش منظر کا محققانہ جائزہ)

ڈاکٹر ابراہیم آیتی

جامعۂ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

سبیلِ سکینہ
حیدرآباد لطیف آباد، یونٹ نمبر [illegible]

تاریخِ عاشورا

(تحریکِ کربلا کے پس منظر و پیش منظر کا محققانہ جائزہ)

BOOK FAIR
IBNE ZEHRA
INSTITUTE

ڈاکٹر ابراھیم آیتی

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ - کراچی - پاکستان

ترجمہ ---------------- مُستجاب احمد انصاری

نظرثانی ---------------- رضا حُسین رضوانی

کتابت ---------------- اشرف راحت

مصحح ---------------- کاظم علی گجراتی

مطبع ---------------- زمزم پیکیجز کراچی

طبع ---------------- ششم۔ ۲۰۰۴ء

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں: یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ ہذا کی پیشگی اجازت حاصل کئے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل، تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریۃً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لئے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیۃ اللہ العظمٰی سید ابو القاسم موسوی خوئیؒ کا قائم کردہ یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان اب حضرت آیۃ اللہ العظمٰی سید علی سیستانی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں دنیا بھر میں معتبر اور مستند اسلامی لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی، فرانسیسی، سواحلی، گجراتی اور دیگر زبانوں میں سیکڑوں کتابیں شائع کرچکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کرچکی ہیں۔ نشر واشاعت کا یہ سلسلہ انسانیت کو صراط مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔

اس کے علاوہ جامعہ ہذا تقریباً ۵۰۰ مدارس و مکاتب میں زیر تعلیم بچوں اور جوانوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کررہا ہے۔

دعوت اسلام ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لئے ہم سب کو باہمی تعاون کرنا چاہئے۔ ادارہ آپ سب کو اس کار خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں عام کیا جاسکے۔

دعا ہے کہ خداوند منان بحق محمدؐ و آل محمدؐ ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نفسی

وکیل حضرت آیۃ اللہ العظمٰی سیستانی دام ظلہ العالی

قارئینِ گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیماتِ اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ اِس ادارے کی مطبوعات کی تیاری کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اُجاگر کرنا ہے۔ اِس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اِس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گرانقدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اِس کتاب کا مطالعہ اُسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا بھی ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آرا تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اِس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے۔

"(اے رسول!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو۔"

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار : سیکریٹری نشر و اشاعت

انتساب

ان جری اور سرفروش مردان خدا کے نام
جنھوں نے ساحلِ فرات پر
اپنے چراغِ زندگی کو گُل کر کے
قندیلِ اسلام کو فروزاں رکھا
تاکہ اس کی تابانی سے بزمِ کائنات منور رہے۔
شمعِ شہادت کے ان پروانوں نے
احیائے اسلام اور ولائے اہلبیت علیہم السلام کی خاطر
اپنے خون میں ڈوب کر
تاریخِ اسلام کا وہ رنگین باب رقم کیا
جس کا غلغلہ چار دانگِ عالم میں یوں بلند ہوا
کہ ملوکیت کے چہرے کو داغ داغ کر گیا۔

سلام ہو سالارِ شہیداں حسینؑ ابن علیؑ پر، ان کے فرزندِ دلبند پر، ان کے جاں نثار بھائیوں پر اور انکے طفلِ شیر خوار پر۔ سلام بے پایاں ہو اُن پاک ارواح پر جنھوں نے کمالِ دلیری اور خلوص کے بے پناہ جذبے کے ساتھ آپکی ہمرکابی میں اپنی جانیں دینِ اسلام پر قربان کر دیں، قرآن اور اہلبیتؑ کی حرمت کی خاطر اپنے سر کٹوا دیے، اپنے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کی اور زمینِ کربلا کو اپنے لہو سے لالہ زار بنا دیا جنھوں نے خندہ پیشانی سے موت کا استقبال کیا، اپنے جسم کے ٹکڑوں سے دامنِ خاک کو عظمت بخشی، اپنی روحانی کشش سے لوگوں کے دل جیت لیے اور اپنے مزاروں کو قبلہ گاہِ اہلِ معرفت بنا دیا۔

فہرست

مقدمہ	۱۱
امیر شام کا نفوذ	۵۹
یزید کی خلافت	۶۳
امامؑ کے نام اہل کوفہ کے خطوط	۶۹
مسلمؑ بن عقیل کی کوفہ روانگی	۷۰
مسلمؑ بن عقیل کی شہادت	۷۷
محمد بن حنفیہ	۸۳
محمد بن حنفیہ کے لیے امامؑ کا وصیّت نامہ	۸۵
امامؑ کے قیام کی وجوہات	۸۸
صلح امام حسنؑ	۹۰

معاویہ کے نام امام حسینؑ کا خط	۹۳
یزید کا تعارف	۹۴
امامؑ کا قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر تھا	۱۰۱
حضرت سیّد الشہداءؑ کے مناقب	۱۰۶
فرزدق کی امامؑ سے گفتگو	۱۱۰
امامؑ عالیمقام کا خطبہ	۱۱۹
امام حسینؑ کا کربلا میں ورود	۱۲۸
ام البنین کے بیٹوں کے لیے امان نامہ	۱۳۱
شب عاشورا میں امامؑ کا خطبہ	۱۳۴
امامؑ نے جب اشعار کہے	۱۳۶
صبح عاشورا	۱۴۰
صبح عاشورا امامؑ کی دعا	۱۴۱
لشکرِ یزید سے امامؑ کا خطاب	۱۴۲
تحریکِ کربلا اور منفی اندازِ فکر	۱۴۸
سانحۂ کربلا کیوں بھلایا نہ جا سکا؟	۱۵۵
کوفہ میں امام سجادؑ کا خطبہ	۱۶۲
دمشق کی مسجد میں امام سجادؑ کا خطبہ	۱۷۶
اہل بیتؑ کا سفر کوفہ و شام	۱۷۸
تحریکِ کربلا تحریف سے محفوظ رہی ہے	۱۸۱

ابوسفیان کا عظمتِ پیغمبرؐ کا اعتراف	۱۸۳
کلمات امیرالمومنینؑ	۱۸۷
منصور دوانیقی کا وصیت نامہ	۱۹۰
تحریکِ کربلا کیوں ناقابلِ فراموش ہے؟	۱۹۳
تحریکِ کربلا کی گرامی قدر خواتین	۱۹۶
حضرت زینبؑ کا ابن زیاد کو جواب	۲۰۲
تاریخ بہت طاقتور ہے	۲۰۵
دربار یزید میں حضرت زینبؑ کا خطبہ	۲۰۹
تاریخ کا کیا فائدہ ہے؟	۲۱۲
سنت الٰہی ناقابل تغیر ہے	۲۱۵
قانون الٰہی پر امام علیؑ کا خطبہ	۲۲۰
دعوت ذوالعشیرہ	۲۲۵
اصحابِ حسینؑ منزل یقین پر	۲۲۸
آل ابی طالبؑ جو کربلا میں شہید ہوئے	۲۳۰
اسلامی تربیت کا اثر	۲۳۳
انصار مدینہ کی بیعت	۲۳۷
مدینہ کے تاریخی ایام	۲۴۲
قتلِ حسین پر اظہارِ مسرت	۲۴۳
اہل بیتؑ کی مدینہ واپسی	۲۴۷

نعمان بن بشیر ۲۵۰
قریش کا رسولؐ خدا سے سلوک ۲۵۲
اوس اور خزرج ۲۵۴
تاریخ عاشورا کی سند ۲۵۸
مسجد شام میں دیے گئے خطبے کی تفصیل ۲۶۸
مدینہ واپسی پر امامؑ کا خطبہ ۲۷۲
جابرؓ اور عطیہؓ کی کربلا آمد ۲۷۵
مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں ۲۷۸
روزِ اربعین ۲۸۵
ہر مسلمان اسلام شناس نہیں ہوتا ۲۸۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

کربلاؔ تاریخ انسانی کا ایک فقید المثال واقعہ ہے۔ محرم الحرام سنہ ۶۱ھ کی دسویں تاریخ کو ابو عبد اللہ امام حسینؑ نے جو عظیم الشان قربانی پیش کی اور جس صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا وہ ہر اس شخص کے لیے مشعلِ راہ ہے جو اپنی تحریک پر کامل یقین رکھتا ہو اور اس کی کامیابی کا خواہاں ہو۔ آپ نے تمام عواقب کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے اعزہ واقربا، احباب ورفقاء اور خود اپنی جان ومال غرضیکہ سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور اپنے عزم واستقلال کی بدولت تمام بنی نوعِ انسان کو رہتی دنیا تک ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ جب انسان اس محیر العقول جنگ کے حالات پڑھتا ہے تو اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے ہیں جن میں سے ایک غور طلب اور اہم سوال یہ ہے کہ امام حسینؑ نے جو غیر معمولی اقدام کیا اسکا اصل منشا کیا تھا۔ آیا وہ یزید کی بیعت سے گریزاں تھے؟ کیا انھوں نے کوفیوں

کی درخواست پر یہ قدم اٹھایا تھا یا ان کے قیام کا مقصد آجکل کی اصطلاح میں انقلاب لانا تھا۔ انہیں یہ معلوم تھا یا نہیں کہ وہ قتل کر دیے جائیں گے؟ آیا ان کے ذہن میں پہلے سے طے شدہ کوئی پروگرام تھا جس کے مطابق وہ عمل کر رہے تھے۔ یا وہ ہر صورتِ حال کے متعلق وقت کے وقت فیصلہ کرتے تھے؟ راستے میں مسلمؑ بن عقیل کی شہادت کی خبر ملتے پر انہوں نے اپنے ہمراہیوں سے کیوں کہا کہ تم چلے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو اور پھر بعد میں امداد کیوں طلب کی؟ شب عاشورا میں سب کو چلے جانے کو کیوں کہا؟ حبیب ابنِ مظاہر کو قبیلۂ بنی اسد سے مدد طلب کرنے کیوں بھیجا؟ عبیداللہ بن حُر جعفی سے قصر بنی مقاتل میں کیوں مدد مانگی؟ شبِ عاشورا میں فرزندانِ عقیل سے یہ کیوں کہا کہ تم چلے جاؤ یہی کافی ہے کہ مسلم مارے گئے؟ ضحاک بن عبداللہ مشرقی اسکے دوست زہیر بن قین سے مدد کیلئے اصرار کیوں کیا اور یہ کیوں کہا کہ تم آخر دم تک میرے ساتھ رہو؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ امام عالیمقامؑ انجام سے بے خبر تھے؟ کیا انھوں نے پہلے سے اپنے ذہن میں کوئی نقشہ ترتیب نہیں دیا تھا؟ کیا ان کا اقدام اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں تھا؟ جس آدمی کو معلوم ہو کہ وہ سر کٹوانے جا رہا ہے کیا وہ اپنے زن و فرزند اور شیر خوار بچوں کو بھی اپنے ساتھ مرنے کے لیے لے جاتا ہے؟

ان سوالوں کے جواب میں بہت سی بے بنیاد، غلط اور واہی تباہی باتیں کہی گئی ہیں۔ کچھ نے کہا ہے کہ چونکہ امام حسینؑ یزید کی بیعت کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے وہ خوف کی وجہ سے یہ سمجھ کر مدینہ سے مکّہ چلے آئے کہ مکہ جائے امن ہے۔ آپ وہیں قیام کرنا چاہتے تھے لیکن اتفاق ایسا

ہوا کہ اہل کوفہ نے انھیں بلاوے پر بلاوا بھیجا اور بھرپور امداد کا یقین دلایا۔ آپ کو خود بھی اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی کعبہ کی حرمت کو نظر انداز کر کے حملہ ہی نہ کر بیٹھے لہٰذا آپ نے اہلِ کوفہ کی دعوت قبول کر لی اور کربلا کی طرف روانہ ہو گئے مگر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ آپ خود بھی قتل ہوئے، آپ کے فرزند بھی مارے گئے اور اہلِ بیتؑ بھی اسیر ہوئے۔

کچھ دوسرے لوگ سمجھتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ انجام ہوگا ورنہ وہ ہرگز ایسا اقدام نہ کرتے۔

بعض کا خیال ہے کہ رسول اکرمؐ سے اپنی نسبی قرابت کی بنا پر امام حسینؑ کو اعتماد تھا کہ کوئی انھیں گزند پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا اور اسی وثوق کی بنا پر انھوں نے یہ خطرناک اقدام کیا یا پھر ان کو قوی اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے کوئی اقدام نہ بھی کیا تو ابنِ زیاد یا کوئی دوسرا انہیں ضرور قتل کر دے گا لہٰذا انہوں نے ذلت کی موت پر جہاد کو ترجیح دی۔

کچھ کہتے ہیں کہ یہ اقدام اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا تو تھا لیکن چونکہ حکمِ خداوندی تھا اس لیے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

کچھ مخالفین جو ہر کس و ناکس کو اپنا اولی الامر سمجھتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے حکومت کی خواہش اور ریاست کے لالچ میں یہ خطرہ مول لیا۔ ہاں حاکمانِ وقت کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ انہیں اس بے دردی سے قتل کرتے بلکہ اگر ترغیب اور ترہیب سے کام لیتے تو بہتر تھا۔

دراصل ان تمام سوالات کا صحیح جواب یہ ہے کہ معاویہ کے دورِ حکومت کی ابتدا ہی سے کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ اس تحریک کی ضرورت محسوس

ہونے لگی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات کی شدت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اگر امام حسینؑ یہ قدم نہ اٹھاتے تو ڈر تھا کہ خود دینِ اسلام خطرے میں پڑ جاتا۔

ان اسباب میں سب سے بڑھ کر تو خلیفہ کے انتخاب کا وہ انوکھا طریقہ تھا جس کی سابق میں کوئی نظیر نہیں تھی۔ معاویہ نے اس صلح نامے کی شرائط کو نظر انداز کر کے جو امام حسنؑ کے ساتھ طے پایا تھا یزید کے لیے بیعت لی۔ پھر عمّال و حکّام کے نام فرمان جاری ہوا کہ جس کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ دوستدارِ علیؑ اور محبِ اہل بیتؑ ہے اس کا وظیفہ بند کر دیا جائے اور فوجی اور شہری وظیفہ پانے والوں کی فہرست سے اس کا نام خارج کر دیا جائے[1]۔ دوسرا فرمان یہ جاری ہوا کہ جس پر ہوا دارِ علیؑ ہونے کا شبہ ہو اسے سزا دی جائے اور اس کا گھر تباہ کر دیا جائے۔ یہ حکم اتنا سخت تھا کہ بقول ابنِ ابی الحدید معتزلی، شیعہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور اس پر بھی خود اپنے غلاموں اور کنیزوں سے خوفزدہ رہتے تھے کہ مبادا کوئی چغلی نہ کھائے۔ جو کوئی کسی سے ناراض ہوتا شکایت کر دیتا کہ فلاں شخص دوستدارِ علیؑ ہے اور پھر اسکی شامت آجاتی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ سختی عراق میں ہوئی جہاں کا والی زیاد بن سُمیّہ تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہر جگہ جمعہ کے خطبوں اور دیگر موقعوں پر امام علیؑ پر ان کی درخشندہ اسلامی خدمات کے باوجود سب و شتم کیا جاتا اور معاویہ اور یزید کی تعریف و توصیف کی جاتی۔ عراق کے والی زیاد بن سُمیّہ کو یہ بھی حکم ملا کہ

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید (جلد ۳۔ صفحہ ۱۵)

جس شخص کے متعلق معلوم ہو جائے کہ شیعہ ہے اس کی شہادت قبول نہ کی جائے اور اگر وہ کسی شخص کو پناہ دے تو اس کی دی ہوئی پناہ کا اعتبار نہ کیا جائے۔

حجر بن عدی، رشید ہجری اور ان کے دوسرے گیارہ ساتھیوں پر کب کیا بلائیں نازل نہیں ہوئیں۔ ان میں سے چھ بہترین افراد قتل ہوئے۔ کئی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ کئی کو زندہ درگور کر دیا گیا۔ اگر کوئی زور سے سانس بھی لیتا تو اسے قتلِ عثمان میں ملوث قرار دے دیا جاتا۔ سادہ لوحوں کی تو ہر زمانے ہی میں کثرت رہی ہے۔ لوگ یقین کر لیتے کہ خونِ ناحق میں شریک واقعی اسی سزا کے مستحق ہیں۔

ایک طرف تو بنی امیہ کے حامی زہر پاشی کر رہے تھے اور دوسری طرف خارجی جو علیؑ اور معاویہ دونوں سے دشمنی رکھتے تھے معاویہ کے بارے میں تو مارے ڈر کے خاموشی اختیار کر لیتے، ہاں امیر المومنینؑ کے خلاف دیدہ دلیری سے زہر اگلتے۔ اس کے نتیجہ میں امام علیؑ اور ان کے پیروکاروں کے خلاف بغض اور نفرت کی ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ جب حضرت سید الشہداؑ نے یوم عاشورا کو اپنے کوفہ کی طرف آنے کا مقصد بیان کرنے اور اتمام حجت کے بعد مخالفین سے پوچھا کہ تم آخر میرے قتل کے درپے کیوں ہو تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں آپ کے والد سے بغض ہے۔

مصیبت یہی نہیں تھی کہ عوام کی اکثریت نومسلم ہونے کے سبب بہ آسانی مخالفانہ پروپیگنڈے کا شکار ہو گئی تھی بلکہ ناواقفیت کی وجہ سے اکثر لوگوں کو صورتِ حال کا صحیح اندازہ تک نہیں تھا۔ وہ صرف یہی جانتے تھے کہ معاویہ

ایک بزرگ صحابی اور کاتبِ وحی ہیں۔ اسی لیے ان لوگوں نے نہ صرف جنگ صفین کے موقع پر ان کے خلاف معرکہ آرائی سے گریز کیا بلکہ امام حسن مجتبیٰؑ کو بھی صلح پر مجبور کیا۔

نصر بن مزاحم نے "کتاب صفین" میں اپنی سند سے اسماء بن حکم فزاری سے روایت کی ہے کہ ہم صفین میں حضرت عمار بن یاسرؓ کے لشکر میں شامل تھے۔ ایک دن ظہر کا وقت تھا' ہم نے سرخ چادر نیزوں پر تانی ہوئی تھی اور اس کے سایہ میں آفتاب کی تپش سے پناہ لے رکھی تھی کہ ناگاہ ایک شخص لشکر کی صفوں کو چیرتا ہوا ہمارے پاس آیا اور پوچھا کہ تم میں عمار بن یاسرؓ کون ہے؟ حضرت عمارؓ نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ اے ابوالیقظان! (حضرت عمارؓ کی کنیت) "مجھے ایک بات کہنی ہے' سب کے سامنے کہوں یا تنہائی میں؟"

حضرت عمارؓ نے کہا: "سب کے سامنے کہو تو بہتر ہے۔"

اس شخص نے کہا کہ: "جب میں اپنے گھر سے چلا تو مجھے یقین تھا کہ معاویہ اور ان کے ساتھی گمراہی کے راستے پر ہیں مگر یہاں آیا تو دیکھا کہ وہ بھی ہماری ہی طرح اذان دیتے ہیں۔ ان کا مؤذن بھی اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتا ہے۔ وہ بھی ہماری ہی طرح نماز پڑھتے ہیں اور ہماری ہی طرح دعا مانگتے ہیں۔ ان کی کتاب بھی قرآن ہے۔ انکے اور ہمارے رسولؐ ایک ہی ہیں۔ جب میں نے یہ صورت دیکھی تو مجھے تعجب ہوا اور بے چینی ہونے لگی۔ صبح کو میں امیر المومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورتِ حال بیان کی تو آپ نے فرمایا: کیا تم عمار بن یاسرؓ سے ملے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے کہا کہ ان سے ضرور ملاقات کرو اور جو وہ کہیں مان لو۔ اب

میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ دیکھوں آپ کیا کہتے ہیں ؟"

عمار بن یاسرؓ نے کہا کہ : "وہ سامنے صاحب سیاہ پرچم دیکھ رہے ہو؟ یہ عمرو بن العاص ہے۔ میں نے تین مرتبہ بدر، احد اور حنین میں رسولِ خداؐ کی معیت میں اسی پرچم کے خلاف جنگ میں حصہ لیا ہے۔ اب یہ چوتھی بار جنگ میں شرکت کر رہا ہوں اور اس دفعہ حالت کچھ پہلے سے بدتر ہی ہے۔"[1]

اسی کتاب میں نصر بن مزاحم ہی کی روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود کے کچھ ساتھی جن میں عبیدہ سلمانی وغیرہ شامل تھے امیرالمومنینؑ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب آپ صفین تشریف لے جا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ہم آپ کے ساتھ صفین چلنے کے لیے تو تیار ہیں لیکن آپ کے لشکر میں اس وقت تک شامل نہیں ہوں گے جب تک ہمیں یقین نہ ہو جائے کہ کون سا گروہ حق پر ہے۔ ایسے ہی کچھ اور لوگ بھی امیرالمومنینؑ کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں اس جنگ کے بارے میں شک ہے۔[2]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت تذبذب میں مبتلا تھی اور معاویہ بن ابی سفیان کو بزرگ صحابی سمجھ کر ان کے خلاف جنگ سے کتراتی تھی۔ اب تو واقعۂ صفین کو بھی بیس سال گزر چکے تھے۔ معاندانہ پروپیگنڈا زوروں پر تھا۔ امام علی بن ابی طالبؑ پر جو شیعہ سنی ہر دو فریق کی روایات کے مطابق سب سے پہلے ایمان لائے تھے سب وشتم کا بازار گرم تھا۔ کچھ لوگ تو شاید

---

[1] کتاب صفین طبع دوم مصر صفحہ ۳۲۰ وطبع ایران صفحہ ۱۶۶

[2] کتاب صفین طبع مصر صفحہ ۱۱۵ وطبع ایران صفحہ ۶۲

حضرت علیؑ کو گالیاں دینا ایسا فرض سمجھتے تھے کہ نماز کی نماز چھوٹ جائے لیکن ان کی گالیاں قضا نہ ہوں۔ رسول خدا اپنی حیاتِ طیبہ میں فرمایا کرتے تھے:

"جب بدعت پھیل جائے اور اس امت میں بعد میں آنے والے پہلے آنے والوں پر لعنت بھیجنے لگیں تو جس کے پاس علم ہو (سنت اور بدعت میں فرق کر سکتا ہو) اسے اپنے علم کو ضرور پھیلانا چاہیے۔ علم کو چھپانے والا ایسا ہی ہے جیسا اس چیز کو چھپانے والا جو اللہ نے محمدؐ پر نازل کی ہے۔"[1]

امام حسینؑ اس سلسلے میں درگزر کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دین کی حفاظت کے لیے اللہ کی طرف سے مامور سمجھتے تھے اور اسی لیے اپنے دہ سالہ دورِ امامت میں کبھی بالکل خاموش نہیں بیٹھے۔ معاویہ اور ان کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی اور جہاں تک ممکن تھا وہ اپنی مراسلت کے مضمون سے حج کے موقع پر مکہ اور مدینہ میں لوگوں کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کچھ سرکاری مال یمن سے شام لے جایا جا رہا تھا، امام حسینؑ نے اسے راستے میں ضبط کر کے فقرائے بنی ہاشم میں تقسیم کر دیا تھا اور ایک عتاب آمیز خط میں معاویہ کو اس واقعہ کی اطلاع بھی دیدی تھی[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے آپ کا ارادہ انقلاب لانے کا تھا ورنہ یہ بات امامؑ کے شایانِ شان نہ ہوتی۔ وہ برابر اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے سعی کرتے رہتے تھے اور اسے اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے کہ حتی الامکان انقلاب کے لیے راہ ہموار کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مراسلت، خطبوں اور تبلیغ کے مختلف ذرائع

---

[1] جامع الصغیر جلد ۱۔ صفحہ ۳۱ از معاذ بن جبل۔

[2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۴ صفحہ ۳۲۷۔

کو بروئے کار لاتے رہتے تھے۔

یہاں تک کہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے جو فرض انہیں سونپا گیا تھا اسے پورا کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقصد سے راست اقدام کرنے کا وقت آگیا۔

ہم نے کہا ہے کہ امام حسینؑ اس اقدام کے لیے اللہ کی طرف سے مامور تھے۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو یعقوب کلینی نے الکافی میں بہ سندِ معتبر ضریس کناسی کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ ضریس کہتے ہیں کہ حمران بن اعین شیبانی نے امام باقرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ میری جان آپ پر قربان، آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امیر المومنین اور حسنین علیہم السلام کی زندگی میں کیا کیا واقعات پیش آئے انھوں نے جہاد کیا لیکن ناکامی ہوئی اور آخر ظالموں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے یونہی مقدر تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اللہ کے حکم سے کیا۔ امام علی اور حسنین علیہم السلام نے اس سابقہ علم کی بنا پر جو انہیں رسولؐ خدا کی طرف سے ملا تھا اور رسولؐ خدا کے ارشاد گرامی کے مطابق جہاد کیا اور جن ائمہؑ نے سکوت اختیار کیا وہ بھی سابقہ علم اور امر ربی کے مطابق کیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے پہلے سے ہر امام کے فرائض حکم الٰہی کی بنا پر متعین فرما دیے تھے اور ہر امام نے اپنے زمانے میں اسی کے مطابق عمل کیا۔

ہو سکتا ہے کسی کو اس قسم کی احادیث کی صحت کے بارے میں تردّد ہو یا انہیں اخبارِ آحاد تصور کرے یا ان کے مطلب کے بارے میں کوئی خدشہ ہو، پھر بھی یہ بات تو عقلاً ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا رہبر و پیشوا وہی ہو سکتا ہے جو خود مومن اور

احکامِ شرعیہ کا پابند ہو اور ظاہر ہے کہ اگر اسلامی حکومت اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ آجائے اور وہ طاقتور ہو جائیں تو وہ اسلام کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے اور یزید ــــ جس کے باپ معاویہ نے اپنے اقتدار کے زمانے میں اس کے لیے سب سے بیعت لی ــــ وہی شخص ہے جس نے اسلامی احکام کو بالعموم اپنے پاؤں تلے روندا۔ اس نے منصب خلافت تک پہنچنے سے پہلے جو مخرب اخلاق اور کفر آمیز اشعار کہے ان کا ذکر اہلِ سنت اور اہلِ تشیع دونوں کی کتابوں میں موجود ہے۔

یعقوبی اور بعض دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ جس سال معاویہ نے یزید کو بلادِ روم کی فتح کے لیے بھیجا تھا اسلامی لشکر غذقذونہ نامی مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا وہاں عیسائیوں کی ایک خانقاہ تھی جس کا نام دَیرِ مران تھا۔ یزید اس خانقاہ میں ام کلثوم نامی ایک عورت کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول رہتا تھا۔ اسی دوران میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی اور مسلمان لشکری خزاں دیدہ پتوں کی طرح گرنے اور مرنے لگے۔ ہر چند لوگوں نے اصرار کیا کہ یہاں سے جلد از جلد کوچ کرنا چاہیے لیکن یزید نے کسی کی بات پر کان نہیں دھرا بلکہ کچھ شعر کہے جن کا مطلب یہ تھا کہ جب تک ام کلثوم میری آغوش میں ہے مجھے کسی کی پروا نہیں، کچھ بھی ہوا کرے مجھے کیا غم۔

یزید سے شراب کی تعریف میں بھی بیہودہ اشعار منقول ہیں۔ یزید کو عیاشی اور خوش گزرانی کے سوا کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت عیسائیوں کی خانقاہوں میں گزارتا تھا جو اس زمانے میں پانچویں کالم کا درجہ رکھتی تھیں۔ لہو و لعب میں اسے اس درجہ مشغولی تھی کہ خود معاویہ نے اسے سرزنش کی تھی۔ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ جلد ۶ صفحہ ۳۸۷ میں نقل کیا ہے کہ جب بار بار یہ اطلاع ملی کہ یزید عیش و عشرت میں

پڑا ہوا ہے تو معاویہ نے اسے لکھا:

"میرے کانوں تک جو تیرے متعلق خبروں کے مشتاق رہتے ہیں واضح طور پر ایسی خبریں پہنچی ہیں جو مایوس کن ہیں اور جن سے صدمہ ہوا سنا ہے تو نے معیوب روش اختیار کر لی ہے اور فضائل و مکارم کے حصول کی جگہ غلط کاریوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ کاش تو جب ہوا تھا تب ہی نہ ہوتا۔ لڑکپن میں تجھے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی اور تجھ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں مگر افسوس! جوان ہو کر تو نے رُلا دیا۔" اس مکتوب سے یزید کی سیرت پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔

معاویہ نے ایک ایسے فرد کو جس کے وجود میں تمام خرابیاں جمع ہو گئی تھیں اور جو (جیسا کہ بعد میں بالکل واضح ہو گیا) فسق و فجور اور برائی کا جرثومہ تھا اور جسے اسلام اور خدا کے احکام کا قطعاً کوئی علم نہ تھا مسلمانوں کے لیے رسولِ اکرمؐ کے جانشین کی حیثیت سے پیش کیا اور ان لوگوں پر مسلط کر دیا جن کی تلواروں سے مرعوب ہو کر اسی یزید کے اَب و جد نے اسلام قبول کیا تھا حالانکہ رسولِ خداؐ کی رحلت کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور ابھی صحابہ بقیدِ حیات تھے بلکہ آنحضرتؐ کی کچھ ازواج بھی زندہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں ہو جو خدا اور رسولؐ پر اعتقاد نہ رکھتا ہو نماز نہ پڑھتا ہو بے محابا شراب پیتا ہو اور شعائرِ دینی کی توہین کرتا ہو تو اسلام اور قرآن کی فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔ اس صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ حسینؑ بن علیؑ جیسا باخدا شخص اس بات پر تیار ہو جائے کہ اس کی نظروں کے سامنے ان جرائم کا ارتکاب کیا جائے اور وہ اپنے نانا کے دین کو ہر کس و ناکس کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے دیکھے اور اپنی خاموشی سے ان سب چیزوں کی تائید کرے یا بیعت اور تعاون کی خاطر ہاتھ آگے بڑھائے؟

ہرگز نہیں!

ان حالات میں تنہا امام حسینؑ ہی نہیں تھے جو یزید کی بیعت پر آمادہ نہیں تھے بلکہ کوئی بھی مسلمان جو قرآن کا علم اور خدا پر یقین رکھتا ہو اس سے بیعت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی چنانچہ کوفہ اور بصرہ کے متعدد لوگ اور تمام اہل مدینہ شروع ہی سے یزید کے مخالف تھے۔

امام حسینؑ اچھی طرح جانتے تھے کہ ابوسفیان کی اولاد بنیادی طور پر اسلام اور محمدؐ بن عبداللہ کے ذکر کے باقی رہنے کے خلاف ہے۔ ان لوگوں نے شمع اسلام کو بجھانے کے لیے جتنی کوشش کر سکتے تھے کی ہے اور اس بات پر قطعاً رضامند نہیں ہیں کہ رسولِ اکرمؐ کا نام باقی رہے اور اگر خلافت ابوسفیان کی اولاد کے پاس رہ گئی تو اسلام کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔

مندرجہ ذیل قصے پر توجہ فرمائیں:

مسعودی نے مروج الذہب (مطبوعہ بولاق مصر) کی دوسری جلد کے صفحہ ۳۶۶ پر مامون کے حالات کے سلسلے میں ذکر کیا ہے اور ابن ابی الحدید نے بھی اس کی جانب اشارہ کیا ہے کہ مطرف بن مغیرہ نے کہا:

میں اور میرا باپ شام میں معاویہ کے مہمان تھے۔ میرا باپ اکثر معاویہ کے دربار میں جاتا تھا اور اس کی تعریف کرتا تھا۔ ایک رات جب وہ معاویہ سے مل کر لوٹا تو بے حد پریشان اور غمگین تھا۔ جب میں نے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب میں کہا: یہ شخص یعنی معاویہ بہت برا آدمی ہے بلکہ دنیا میں بدترین انسان ہے۔ میں نے پوچھا: کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا: میں نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ اب جب کہ تم اپنی مراد کو پہنچ گئے ہو اور اسلامی خلافت تمہیں حاصل ہو گئی

ہے بہتر ہوگا کہ تم اس آخری عمر میں لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آؤ اور بنی ہاشم کے ساتھ اس قدر بدسلوکی نہ کرو کیونکہ آخر وہ تمہارے رشتہ دار ہیں اوراب ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہی جس کی بنا پر تمہیں خوف ہو کہ وہ تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے ۔معاویہ نے کہا ہیہات! ہیہات! ابوبکر نے خلافت کی اور عدل سے کام لیا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ ہوا کہ وہ مر گیا اور اس کا نام بھی مٹ گیا۔ اسی طرح عمر اور عثمان بھی مر گئے اور گو انہوں نے لوگوں سے اچھا سلوک کیا مگر افسوس کہ ان دونوں کا نام بھی دنیا میں باقی نہ رہا لیکن برادر ہاشم (یعنی رسول اکرمؐ) کا نام ہے کہ ہر روز دنیائے اسلام میں پانچ مرتبہ آواز بلند ہوتی ہے کہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ جب تینوں خلیفوں کا نام مٹ گیا اور محمدؐ کا نام زندہ ہے تو اس کے بعد کونسا کام کرنے کو رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ محمدؐ کا نام بھی مٹ جائے۔

یہ قصہ مسعودی نے زبیر بن بکار کی کتاب موفقیات سے لیا ہے جو ایک قابل اعتماد بنیادی تصنیف ہے۔ ان حالات میں کیا حسینؑ بن علیؑ کے لیے ممکن تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہیں کہ اسلام اور قرآن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے اور انہیں نیست و نابود کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور اس کے باوجود خاموش رہیں، ہرگز نہیں!

ان دنوں خلافتِ اسلامی نے قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا رنگ اختیار کرلیا تھا معاویہ اسے اپنے خاندان میں موروثی بنانا چاہتے تھے لیکن اس سلسلے میں دو بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو یزید کی نالائقی جو ایک بدنام شخص تھا اور اس زمانے کی سربرآوردہ شخصیتیں اس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھیں۔ دوسرے

امام حسن مجتبیٰؑ کا وجود باوجود جن سے شرائطِ صلح میں یہ طے پایا تھا کہ معاویہ اپنے بعد کسی کو خلافت کے لیے نامزد نہیں کریں گے۔ پہلی رکاوٹ کا توڑ تو یہ سوچا گیا کہ لوگوں کو داد و دہش سے قابو میں لایا جائے اور جہاں یہ ممکن نہ ہو ڈرا دھمکا کر، وظیفے بند کر کے اور ملازمت سے برخاست کر کے مخالف آوازوں کو کچل دیا جائے۔ یہ کام بڑی تیزی سے مکمل کر لیا گیا۔

دوسری رکاوٹ دور کرنے کے لیے اس نے امام حسن مجتبیٰؑ کو قتل کرانے کا فیصلہ کیا اور آخرکار ایک عجیب دھوکا بازی کے ساتھ اشعث بن قیس کی بیٹی جعدہ کے ذریعے انہیں زہر دلا دیا۔ اب اس نے سمجھا کہ میدان صاف ہو گیا ہے اور اسے یہ احساس نہیں تھا کہ امام حسن مجتبیٰؑ کے بعد بھی کوئی رکاوٹ پیش آئے گی۔ بعد میں اسے خیال آیا کہ تمام اسلامی مملکت میں مدینہ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور وہاں امام حسینؑ جیسی شخصیت کی موجودگی میں کوئی بھی یزید کی بیعت کرنے پر تیار نہ ہوگا لہٰذا مجبور ہو کر اس نے ایک اور فریب سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اسلامی مؤرخین کا کہنا ہے کہ امام حسن مجتبیٰؑ کی وفات کے بعد معاویہ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ یزید کو ولی عہد مقرر کیا جائے اور اس کے لیے لوگوں سے بیعت لی جائے چنانچہ تمام اسلامی قلمرو کے گورنروں کو مکتوب بھیجے گئے۔ انہی میں سعید بن عاص اموی والیِ مدینہ کو لکھا گیا کہ تمام مہاجرین و انصار اور ان کی اولادیں جو مدینہ میں موجود ہیں ان سے سختی کیساتھ بیعت لیجائے اور کوئی رو رعایت نہ کیجائے۔ البتہ ان چند اشخاص پر دباؤ ضرور ڈالا جائے مگر زبردستی نہ کی جائے: عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور حسینؑ بن علیؑ۔ معاویہ کی چٹھی ملتے ہی سعید بن عاص نے اہل مدینہ کو بیعت کی دعوت دی مگر سب نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک یہ چند

اشخاص بیعت کے لیے آمادہ نہیں ہوں گے ہم بھی یزید کی بیعت کے لیے تیار نہیں سعید نے معاویہ کو لکھا کہ اہل مدینہ ان چند اشخاص کے زیر اثر ہیں اور جب تک یہ بیعت نہیں کریں گے کتنی بھی کوشش کیوں نہ کی جائے اہل مدینہ سے بیعت لینا ممکن نہیں۔ معاویہ نے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں۔ کسی سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں میں خود کچھ فکر کرتا ہوں۔ اسی سال معاویہ نے حجِ بیت اللہ کا عزم کیا اور شامیوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ مدینے پہنچے۔ ملاقات کے بعد موقع پر ان حضرات سے اظہار ناخوشنودی کیا اور عتاب آمیز گفتگو کی۔ انہوں نے جو یہ نامناسب رویہ دیکھا' الگ الگ عمرہ کے لیے مکہ روانہ ہو گئے لیکن امیر معاویہ نے موسمِ حج تک مدینے ہی میں قیام کیا اور اسی دوران میں اہل مدینہ کو نرم کرنے کے لیے ان پر عطایا اور ہدایا کی بارش کر دی۔

اس کے بعد خود بھی بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں جب لوگ ملنے کے لیے آئے تو عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور حضرت سید الشہداءؑ سے بڑے تپاک اور احترام سے ملاقات کی اور ان سب کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ حکم دیا کہ سب کے لیے سواری حاضر کرو اور ہر ایک کا نام اس کی شخصیت کے مناسب لقب کے ساتھ لیا۔ حسینؑ بن علیؑ کو سیّد شباب المسلمین کہا۔ عبداللہ بن زبیر کو ابن عم رسولؐ اللہ کہا اور عبدالرحمٰن کو مولائے قریش وغیرہ وغیرہ۔

مناسکِ حج کی بجا آوری کے بعد ان سب کو ایک جگہ طلب کیا۔ سب نے امام حسینؑ سے کہا کہ آپ معاویہ سے بات کیجیے لیکن امام حسینؑ آمادہ نہیں ہوئے۔ عبداللہ بن زبیر سے کہا تو آپ مان گئے۔ سب معاویہ کے پاس پہنچے۔ معاویہ تعظیم اور احترام کا جو حق تھا وہ بجا لائے اور کہا تم نے دیکھا کہ میں تم پر کس قدر مہربان

ہوں، تم میرے خون و جگر ہو اس لیے میں تم سے لطف و عنایت کا برتاؤ کرتا ہوں۔ اب یزید تمہارا بھائی اور ابنِ عم ہے۔ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ خلافت پہ اس کا نام ہو جائے باقی سب معاملات تمہارے ہاتھ میں رہیں۔ تم جو چاہو وہ ہو۔ امر و نہی کا سب اختیار تمہیں ہی رہے گا۔ یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ معاویہ نے پھر کہا جواب دو۔ پھر بھی کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ تیسری مرتبہ معاویہ نے ابن زبیر کی طرف رُخ کر کے کہا تم بولو۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا: معاویہ! تم تین میں سے ایک کام کر سکتے ہو یا تو جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کسی کو اپنا جانشین نامزد کیے بغیر دنیا سے تشریف لے گئے تم بھی یہی کرو۔ لوگ خود کسی کو خلیفہ مقرر کریں گے یا ابوبکر کی طرح کسی ایسے شخص کو جس سے تمہارا کوئی رشتہ نہ ہو اور وہ اس کام کا اہل بھی ہو خلیفہ نامزد کردو یا پھر عمر کی طرح شوریٰ پر چھوڑ دو۔ معاویہ نے کہا: کیا ان تین کے علاوہ کوئی اور بھی صورت ہے؟ عبداللہ بن زبیر نے کہا کہ نہیں۔ معاویہ نے دوسروں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا وہی جو عبداللہ بن زبیر نے تجویز پیش کی ہے۔ معاویہ نے کہا بہت اچھا میں کل بات کروں گا مگر کسی کو مجھے بیچ میں ٹوکنے کا حق نہیں۔ اگر میں سچ کہوں گا تو میرا ہی فائدہ ہے جھوٹ بولوں گا تو خود ہی بھگتوں گا لیکن اگر کوئی مخالفت کریگا تو جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ اگلے دن عام جلسہ ہوا جس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو تمام بلادِ اسلامی سے حج کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان چند صاحبوں کو بھی بلا لیا گیا ہر ایک کے سر پہ دو دو مسلح سپاہی تعینات کر دیے گئے۔ معاویہ منبر پہ گئے اہلِ شام انکے اطراف میں جمع ہو گئے۔ معاویہ نے خطبہ دیا اور کہا:

میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بے بنیاد باتیں بہت کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ

حسینؑ بن علیؑ، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر نے یزید کے لیے بیعت نہیں کی۔ یہ حضرات یہاں موجود ہیں۔ یہ لوگ نمایاں ترین اور سربرآوردہ ترین ہیں۔ ان کے بغیر کوئی کام مستحکم ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ ہوتا ہے۔ میں نے خود ان سے بیعت کے لیے کہا اور دیکھا کہ کسی نے بھی کوئی مخالفت نہیں کی۔ سب نے یزید کے لیے بیعت کرلی۔ اس موقع پر اہل شام نے چیخ کر کہا: یہ لوگ کوئی چیز نہیں۔ اگر یہ مخالفت کرتے ہیں تو ہمیں حکم دیجیے ہم ابھی ان کی گردن ماردیں گے۔ معاویہ نے کہا حیرت ہے لوگ قریش کے اس قدر خلاف کیوں ہوگئے کہ ان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ چپ رہو، پھر ایسی بات نہ کہنا۔ یہ کہہ کر معاویہ منبر سے اتر آئے اور ان کے کارگزاروں نے لوگوں سے بیعت لینا شروع کردی۔ بعدازاں معاویہ سوار ہو کر مکہ سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد لوگ گروہ در گروہ حسینؑ بن علیؑ اور دوسروں کے پاس آنے شروع ہوئے اور لگے اعتراض کرنے کہ آپ تو کہتے تھے ہم بیعت نہیں کریں گے پھر کیسے رضامند ہو گئے۔ انہوں نے بہت کہا کہ ہم نے بیعت نہیں کی ہے۔ معاویہ نے غلط کہا، دھوکہ دیا مگر لوگوں نے کہا کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو اسی جلسہ میں تردید کیوں نہیں کی۔ انہوں نے ہر چند کہا کہ مخالفت کرتے تو مارے جاتے، مگر کچھ اثر نہیں ہوا۔

یہ قصہ ابنِ عبد ربہ اُندلسی کی عقد الفرید جلد دوم صفحہ ۲۴۸، ابن قتیبہ کی

الامامۃ والسیاسۃ جلد اول صفحہ ۱۴۸ اور امالی قالی صفحہ ۱۷۷ میں مذکور ہے۔

مؤرخ یعقوبی نے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کی وہ گفتگو نقل کی ہے جو اس وقت ہوئی جب سعید بن العاص والیٔ مدینہ نے بیعت کی تجویز پیش کی۔ یعقوبی کہتا ہے کہ سعید بن العاص نے بیعت کی تجویز پیش کی تو انہوں نے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم ایسے شخص کی بیعت کر لیں جو بندروں اور کتوں سے کھیلتا ہے، جو شرابی ہے، رندِ خراباتی ہے تو ہم خدا کو کیا جواب دیں گے؟

ابنِ جوزی کہتے ہیں کہ مدینہ کے کچھ لوگ یزید کی رفتار و کردار کا جائزہ لینے کے لیے شام گئے۔ واپسی پر انہوں نے بیان کیا کہ ہم ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں جو بے دین ہے، شرابی ہے، ساز بجاتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔

حنظلہ غسیل الملائکہ کا بیٹا عبداللہ کہا کرتا تھا کہ یزید ایک ایسا شخص ہے جو اپنی ماں، بیٹی اور بہن کو بھی نہیں بخشتا اور شراب پیتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا۔

مسعودی مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ یزید سیہ مست مشہور تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سب مسلمانوں کا فرض تھا کہ اس کی بیعت سے پرہیز کریں کیونکہ بیعت کا مطلب اس کی حرکتوں کی تائید اور اس کی جملہ مساعی میں شرکت تھا۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی کیسا بھی برتاؤ کرے مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے چپ چاپ بیٹھے دیکھتے رہیں چاہے اسلام ہی مٹ جائے اور دینِ خدا مذاق بن جائے۔ اس مقام پر خاموشی اس خاموشی کی مانند ہے جو سیّد مرتضیٰ داعی رازی نے تبصرۃ العوام میں ایک صوفی، مردوئے سے نقل کی ہے۔[1]

---

[1] اس بارے میں کتاب تبصرۃ العوام کے سولہویں باب میں مقالات صوفیہ ملاحظہ فرمائیں۔ فحش ہونے کی بنا پر یہ قصہ نقل نہیں کیا گیا۔

امام حسینؑ ایسے موقعوں پر سکوت کو حرام سمجھتے تھے۔ ایک حدیث میں جو انہوں نے کوفہ کے راستے میں لشکرِ حُر سے بیان کی اپنے جدّامجد حضرت رسول اکرمؐ سے یہ جملہ نقل کیا تھا کہ اگر کوئی اس قسم کی باتیں دیکھے اور خاموش رہے تو اللہ کا حق ہے کہ اسے ٹھکانے لگا دے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت سیدالشہداءؑ نے معاویہ کی زندگی کے آخری چند سالوں میں بلادِ اسلامی میں منتشر صحابہ اور ان کی اولاد کو خطوط لکھ کر دعوت دی تھی۔ کم وبیش ایک ہزار صحابہ اور تابعین منیٰ میں جمع ہوئے تھے۔ آپ نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے حامیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ تمہیں لازم ہے کہ اس مجلس میں جو گفتگو ہو واپس جا کر اسے اپنے ہم وطنوں سے بیان کرو۔

اس کے بعد آپ نے اپنے والدِ بزرگوار کے فضائل و مناقب ایک ایک کر کے بیان کیے اور لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کی۔ تحف العقول میں جو خطبہ درج ہے اس کے فقروں کے دروبست اور طرزِ خطاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی موقع کا ہے اور یہیں سے انقلاب کی تخم ریزی شروع ہوئی تھی۔ بات کو واضح کرنے کے لیے ہم اس خطبہ کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں۔ امام عالیمقامؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں آیاتِ الٰہی سنا کر کہا:

صاحبو! تم علم، نیکی اور خیرخواہی کے لیے مشہور رہو۔ لوگوں کے دلوں میں تمہاری عظمت ہے۔ شریف تمہارا احترام کرتے ہیں اور کمزور تمہاری عزت کرتے ہیں۔ وہ بھی جن پر تمہارا کوئی احسان نہیں،

تمہیں اپنے سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

تم اللہ سے بھلائی کے متمنی ہو مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں غضبِ الٰہی میں گرفتار نہ ہو جاؤ کیونکہ تم خدا کے فضل سے ایسے درجے پر ہو جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ تمہاری لوگوں میں عزت ہے لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ خدا سے کیے ہوئے وعدے توڑے جا رہے ہیں مگر تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی، حالانکہ تمہارے آباء سے کیے ہوئے وعدوں کی اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو تم بے چین ہو جاتے ہو۔ رسولؐ اللہ کی امانت کو کوئی پوچھتا نہیں۔ بستیوں میں اندھے، گونگے، اپاہج پڑے پھرتے ہیں جن پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ تم اپنی ذمہ داریوں کی پروا نہیں کرتے اور جو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ ظلم کو نظر انداز کر کے اور ظالموں سے تعاون کر کے اپنے بچاؤ کی فکر کرتے ہو۔ انہی باتوں سے اللہ نے منع کیا ہے اور دوسروں کو بھی منع کرنے کے لیے کہا ہے لیکن تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ سب سے زیادہ مصیبت تو تمہاری ہی ہے کیونکہ جو مرتبہ تمہیں ملنا چاہیے تھا اور جو علماء کا حق تھا تم اس سے زبردستی محروم کر دیے گئے ہو۔ کاش تم سمجھتے۔

پھر امامؑ نے فرمایا:

دراصل انتظام و انصرام اور اجرائے احکام کا کام علماء کے ہاتھ میں ہونا

چاہیے تھا جو حلال و حرام سے واقف اور اللہ کی طرف سے ان کاموں کے نگراں ہیں مگر تم سے تمہارا مرتبہ چھین لیا گیا اور یہ اس لیے ہوا کہ تم حق سے دور ہو گئے اور واضح دلائل کے باوجود سنت کے بارے میں تم میں اتفاق نہیں۔ اگر تم اپنی ذمہ داری محسوس کرتے اور تکلیف برداشت کرتے تو سب اختیارات تمہارے ہی ہاتھ میں ہوتے لیکن تم نے اپنی جگہ ظالموں کو دیدی اور سب اختیار انھیں سونپ دیا جو مشتبہ طریقوں پر چلتے اور اپنی بیہودہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اس لیے تم پر مسلط ہو گئے کہ تم موت سے بھاگتے تھے اور تمہیں زندگی عزیز تھی جو بہرحال فانی ہے۔ تم نے کمزوروں کو ان کے ہاتھ میں دیدیا تو کچھ بیچارے غلام بن کر رہ گئے اور کچھ نانِ جویں کو محتاج ہو گئے۔ اب وہ سارے ملک میں من مانی کرتے ہیں اور اپنی خواہشات پر چل کر رسوائی سمیٹتے ہیں۔ برے لوگوں کے طریقے اپناتے ہیں اور خدا کی پروا نہیں کرتے۔ ہر بستی میں منبر پر ان کا خطیب چیختا ہے۔ وہ خدا کی زمین کے بلاشرکت غیرے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں اور سب لوگ ان کے زیردست ہیں۔ وہ جس پر چاہیں ہاتھ ڈالیں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ سرکش، ہٹ دھرم اور غریب آزار ہیں۔ کچھ خدا و یوم آخرت سے بیگانہ، کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ملک ایسے ظالموں کے ہاتھوں میں ہے جن کا کام صرف لوٹ کھسوٹ ہے اور ایسے لوگ حاکم بنے بیٹھے ہیں جنہیں مومنوں پر رحم نہیں آتا۔ اب ہمارا ان کا فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

یہ خطاب ان لوگوں سے تھا جو عوام میں مقبول اور ممتاز تھے اور اس لیے ان کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ تھی مگر وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کر رہے تھے اس لیے ملامت کے مستحق تھے۔ اب یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں

امام عالیمقامؑ نے دعوت دیکر بلایا تھا اور ان سے منیٰ میں خطاب فرمایا تھا جو حرم میں داخل ہے اور جائے امن ہے۔ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ آپ مدینہ میں وہاں کے بقیہ باقیہ مہاجرین و انصار سے جو اس وقت سربرآوردہ سمجھے جاتے تھے باقاعدہ منبر پر جاکر خطاب کریں اور حاکم وقت معترض نہ ہو۔ بعد کے مضمون سے بھی ہماری بات کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرے قرائن کی موجودگی میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خطاب مکہ میں معاویہ کی وفات کے بعد کیا گیا ہو۔

اس خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید کی بیعت کا قضیہ پیش آنے سے پہلے ہی آپ کو انقلاب لانے کا خیال تھا اور آپ صرف مناسب موقع کے انتظار میں تھے اس لیے آپ کی تحریک کا آغاز اسی دعوت سے سمجھنا چاہیے جو آپ نے صحابہ و تابعین کو منیٰ میں دی تھی۔ اس زمانے کے حالات کے پیش نظر مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنا اور لوگوں کو حق کی طرف بلانا کوئی آسان کام نہ تھا اور یہ کام محض مراسلت، تقریروں اور پیغاموں سے انجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

اسی لیے امام حسینؑ نے چاہا کہ ایسا انقلاب برپا کیا جائے کہ تمام بلادِ اسلامی کے لوگوں پر یہ بات آشکارا ہو جائے کہ یزید کے برسراقتدار رہنے کی صورت میں اسلام کی بقا کو سنگین خطرہ ہے۔ جن لوگوں کے آباء و اجداد بیس سال سے زیادہ مدت سے معاویہ کو رسول اکرمؐ کا ایک بزرگ صحابی سمجھتے آرہے تھے یا کم از کم اس کے جھوٹ اور نفاق کے بارے میں مذبذب تھے انہیں گفتگو، پیغام اور تقریروں سے بیدار کرنا اور صحیح اسلامی حکومت کے بارے میں کچھ سمجھانا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ معاویہ کے مبلغ ہر شہر و دیار میں پروپیگنڈا کرنے اور لوگوں کو سیدھے راستے سے بھٹکانے میں مصروف تھے۔

حجر بن عدی، رشید ہجری اور عمرو بن حمق خزاعی جیسے لوگ مارے جا رہے تھے اور کسی کو لب کشائی کا یارا نہ تھا بلکہ اس کے برعکس عوام تو ان ہی لوگوں کو مجرم سمجھتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ تحریک اتنے بڑے پیمانے اور مؤثر انداز میں ہو کہ اس کا انقلابی اثر مدتوں فراموش نہ کیا جا سکے حتیٰ کہ حالات درست ہو جائیں اور بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے اور چونکہ بنی امیہ کی بالعموم اور ابوسفیان کی اولاد کی بالخصوص یہ دیرینہ آرزو تھی کہ لوگ رسول اکرمؐ کا نام لینا اور حقیقی اسلام کو پہچاننا چھوڑ دیں لہٰذا ان کی نیت ظاہر ہو جائے اور لوگ انہیں پہچان لیں اور ان کے مخالفین کے ساتھ مل جائیں اور جنگ شروع ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ امامؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ مدینہ سے روانگی کے وقت جو وصیت نامہ لکھ کر آپ نے محمد بن حنفیہ کو دیا تھا اس میں توحید و رسالت اور حشر و نشر کے اقرار کے بعد لکھا تھا:

اِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ اَشِرًا وَّ لَا بَطِرًا وَّ لَا مُفْسِدًا وَّ لَا ظَالِمًا وَ اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّةِ جَدِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اٰمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهٰی عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اَسِیْرُ بِسِیْرَةِ جَدِّیْ وَ اَبِیْ۔

"یعنی میں سرکشی اور جنگ و جدل کے ارادے سے نہیں نکل رہا ہوں اور نہ ہی میرا مقصد فساد پھیلانا یا کسی پر ظلم کرنا ہے بلکہ میں تو اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں۔ میری غرض فقط امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اپنے اَب و جد کی پیروی ہے۔"

جب آپ نے روانگی کا تہیہ کر لیا تو آپ کئی بار اپنے نانا کے روضے پر گئے اور یہ

جملہ کہا:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّ الْمَعْرُوْفَ وَاُنْكِرُ الْمُنْكَرَ"

"خدایا مجھے نیکی پسند ہے اور برائی سے نفرت ہے۔"

امام حسینؑ نے یہ جانتے ہوئے جہاد شروع کیا تھا کہ آپ تو ضرور قتل ہوں گے اور آپ کے زن و فرزند بھی اسیر ہو جائیں گے لیکن آپ کی جد و جہد کے نتیجے میں اسلام اور اس کے احکام باقی رہیں گے اور باطل قوتوں کا قلع قمع ہو جائے گا۔ یزید جیسے سابق خلفاء کی روایت کے برخلاف لوگوں پر مسلط کیا گیا تھا یہ عمل دہرا نہیں سکے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ اس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید برسر اقتدار آ جائے اور معاویہ کی سکیم دھری رہ جائے گی۔ لوگ خواب سے بیدار ہو جائیں گے۔ ان میں اسلامی شعور پیدا ہو گا اور بنی امیہ رسوا ہو جائیں گے اور آپ کا لاشہ ہمیشہ ظلم و ستم کے ایوانوں میں زلزلہ برپا رکھے گا۔

ممکن ہے اس موقع پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اللہ تعالےٰ تو فرماتا ہے کہ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ "یعنی اپنی جانوں کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو" اس کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ امام سے بڑھ کر ان باتوں کو کون سمجھ سکتا ہے! ان کا فعل تو خود حجت ہے۔ رہی یہ بات کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں تو ابو عبداللہ کا جہاد اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ راہِ خدا میں مارا جانا بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے تو پھر رسول اکرمؐ کے اکثر غزوات بھی اسی شمار میں آ جائیں گے۔ اسلام کی ابتدائی جنگوں میں جب مسلمان ابھی بہت کمزور تھے، یہ حکم تھا کہ بیس آدمی دو سو کا مقابلہ

کریں۔ اس لحاظ سے یہ بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہونا چاہیے حالانکہ کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں سمجھتا۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ راہِ خدا میں جہاد نہ کرو کیونکہ اگر مارے جاؤ گے تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والے قرار پاؤ گے۔ یہ آیت تو اس موقع پر نازل ہوئی تھی جب مسلمانوں کو حکم تھا کہ جنگ کی صورت میں اپنی حیثیت کے مطابق ساز و سامان ہتھیار، خوراک اور سواری مہیا کریں۔ بظاہر کچھ لوگ اس سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لینے لگے تھے اور جتنا مال خرچ کرنا چاہیے تھا اتنا مال خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے چنانچہ اس موقع پر یہ آیت اتری:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ

یعنی "راہِ خدا میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو (کنجوسی یا کنجوسی کے سبب) ہلاکت میں نہ ڈالو"

یہ مطلب اس روایت سے ظاہر ہے جو ایک بزرگ صحابی حذیفہ بن الیمان سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت "نَزَلَتْ فِی النَّفَقَةِ" انفاق کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس روایت کو ابنِ ابی حاتم اور بخاری نے حذیفہ اور اعمش سے، اور سیوطی نے ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء، ضحاک، حسن بصری، قتادہ، سدّی اور مقاتل بن حیان سے نقل کیا ہے۔ یہ سب صحابہ اور تابعین میں سے ہیں۔

ایک دوسری روایت میں اسلم بن یزید ابو عمران کہتے ہیں کہ محاصرۂ قسطنطنیہ کے دوران ہمارے لشکر کے ایک سپاہی نے دشمن کی صفوں پر بڑی بے جگری سے

حملہ کرکے دشمن کی صف میں شگاف ڈال دیا۔ ہماری طرف سے کچھ لوگوں نے چیخ کر کہا کہ یہ شخص اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس آیت کے معنی بہتر جانتے ہیں۔ تم ایسے ہی تکے مارتے ہو۔ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہیں رسول اکرمؐ کی مہمانداری اور مصاحبت کا شرف حاصل ہے۔ جب اسلام نے ترقی کر لی تو ہم یہ سمجھ کر رسول اکرمؐ کی امداد میں تساہل برتنے لگے کہ اسلام کو تو فروغ حاصل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں اپنے بیوی بچوں کی فکر کرنی چاہیے۔ ہم رسولِ اکرمؐ کی اعانت میں ٹال مٹول کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

"وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" فَكَانَتِ التَّهْلُكَةُ فِي الْاِقَامَةِ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَتَرْكِ الْجِهَادِ۔

یعنی "راہِ خدا میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بیوی بچوں میں اپنے مال کو خرچ کرنے اور ترکِ جہاد میں ہلاکت تھی پس ہلاکت ترکِ جہاد میں ہے، جہاد میں نہیں۔"

یہ روایت ابوداؤد سجستانی، ترمذی، نسائی، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، ابنِ جریر طبری، ابن مردویہ، ابویعلیٰ اور ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں، یزید بن ابی حبیب عن اسلم کے طریق سے نقل کی ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

ایک اور روایت ابواسحاق سبیعی سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے براء بن عازب سے دریافت کیا کہ اگر میں لڑائی کے دوران میں اکیلا

دشمن پر حملہ کر دوں اور مارا جاؤں تو کیا یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہوگا؟

براء نے کہا: نہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۔ (سورۂ نساء-آیت ۸۴)

یعنی "اللہ کی راہ میں لڑو۔ تم فقط اپنے نفس کے ذمے دار ہو"

اس کے بعد براء نے کہا کہ یہ آیت جنگ کے موقع پر انفاق کے بارے میں ہے۔ یہ روایت ابن مردویہ اور حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں بیان کی ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین (شیخ محمد بن اسماعیل بخاری اور شیخ مسلم بن حجاج نیشاپوری) کے معیار کے مطابق ہے۔

اسی قسم کا قول تفسیرِ برہان میں تفسیرِ عیاشی کے حوالے سے حذیفہ بن الیمان کی روایت میں نقل کیا گیا ہے۔ سید بن طاؤس نے بھی لہوف میں اس آیت کے یہی معنی بیان کیے ہیں اور انہی روایات سے استناد کیا ہے۔

اس کے علاوہ اس ہلاکت والی آیت کے سیاق وسباق سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دفاعی جہاد کے بارے میں ہے۔ سیاق وسباق پر ایک نظر ڈالنے سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ راہِ خدا میں جان دینے کو شریعت کی اصطلاح میں ہلاکت سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ قرآن پاک شہدائے اسلام کے بارے میں فرماتا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا ۚ
بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ○ (سورۂ آلِ عمران-آیت ۱۶۹)

یعنی "تم گمان بھی نہ کرو کہ کشتگانِ راہِ خدا مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کی طرف سے رزق پاتے ہیں۔"

نہج البلاغہ کے خطبے میں جو امیر المومنینؑ نے واقعہ صفین کے موقع پر اپنے اصحاب کے سامنے دیا تھا، فرمایا:

"مغلوب ہو کر زندہ رہنے میں تمہاری موت ہے اور غالب آ کر مر جانے میں زندگی۔"

وہ زندگی جو انسان کو ہر کس و ناکس کے سامنے جھکا دے ہزار بار مرنے اور ہلاک ہونے سے زیادہ سخت اور بدتر ہے۔ امام حسینؑ اپنے پدرِ بزرگوار اور برادرِ نامدار کی طرح سادہ طور پر شہید ہو جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بہت ممکن تھا کہ ایسی شہادت پر کوئی توجہ بھی نہ دیتا اور امامؑ کا خون رائیگاں چلا جاتا۔

وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ امام عالیمقامؑ اپنے انجام سے آگاہ نہیں تھے۔ ان روایات سے قطع نظر جن میں آیا ہے کہ جو امام یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا پیش آنے والا ہے وہ حجت نہیں ہو سکتا اور یہ کہ سب امام جانتے ہیں کہ انہیں کب موت آئے گی اور ان کا مرنا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔

خود سید الشہداءؑ کی شہادت کا مسئلہ خانوادۂ بنی ہاشم خصوصاً امیر المومنینؑ کے گھرانے میں معلوم و معروف تھا۔ ام سلمہؓ، ام ایمن وغیرہ نے خود رسولؐ اللہ سے سنا تھا کہ حسینؑ کربلا میں شہید ہوں گے۔

علاوہ ازیں اس خطبے میں جو آپ نے اپنی روانگی سے قبل رات کو حرم کعبہ میں دیا تھا، آپ نے فرمایا تھا: "خُطَّ الْمَوْتُ عَلٰی وُلْدِ آدَمَ" یعنی موت بنی آدم کا مقدر ہے۔ اگر آپ کو اپنی شہادت کا علم نہ ہوتا تو آپ یہ نہ فرماتے کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ گویا صحرائی بھیڑیے نواویس و کربلا کے درمیان میرے جسم کے ٹکڑے کیے ڈال رہے ہیں۔" اسی طرح اور بہت سے موقعوں پر آپ کی گفتگو

سے واضح ہو جاتا ہے کہ سارا معاملہ روزِ روشن کی طرح حضرت امام حسینؑ کے علم میں تھا۔ اس سے انکار، سخن سازی اور کٹ حجتی کے سوا کچھ نہیں۔

محمد بن حسن بن فروخ صفّار نے بصائر الدّرجات کے آغاز میں اور اسی طرح کلینی نے الکافی میں بیان کیا ہے کہ اہلِ کوفہ میں سے ایک شخص ثعلبیہ میں امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا (بظاہر اس نے امامؑ کو کوفہ جانے سے منع کیا تھا اور خوف دلایا تھا) تو امامؑ نے فرمایا:

> "اگر تم سے مدینہ میں ملاقات ہوئی ہوتی تو اپنے نانا کے پاس جبرئیل کے وحی لانے کے آثار تمہیں اپنے گھر میں دکھاتا۔ اے کوفی بھائی! علوم کا سرچشمہ تو ہمارے پاس ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اور لوگ تو جانتے ہوں اور ہم ناواقف ہوں۔"
>
> نیز آپ نے مدینہ سے روانگی کے وقت فرمایا تھا:
>
> "مَنْ لَحِقَ بِیْ مِنکُمْ اُسْتُشْهِدَ وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنِّیْ لَنْ یَبْلُغَ الْفَتْحَ"
>
> "جو میرے ساتھ چلے گا، شہید ہوگا اور جو پیچھے رہ جائے گا اسے کامیابی میں حصہ نہیں ملے گا۔"

اور اگر کوئی یہ کہے کہ سید مرتضیٰ رحمہ اللہ سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا: امام حسینؑ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ مارے جائیں گے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے یہ نقل ہوا ہے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ مارے جائیں گے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب انہیں معلوم تھا کہ میں مارا جاؤں گا تو پھر وہ اپنے بیوی بچوں کو کیوں ساتھ لے گئے اور انہیں کیوں قید کرایا تو اس کا جواب

وہی ہے جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان کا مقصد اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو قتل کرانا نہیں تھا۔ ان کے قیام کا مقصد لوگوں کی توجہ بنی امیہ کی برائیوں کی طرف مبذول کرانا تھا اور انہیں یہ بتانا تھا کہ بنی امیہ کی حکومت اسلامی حکومت نہیں ہے اور ان کا مقصد اسلام کو اور بالخصوص حضرت محمدؐ بن عبداللہ کے نام کو مٹانا اور نیست و نابود کرنا ہے لہٰذا انہوں نے صحیح پروگرام کے مطابق قدم اٹھایا اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ بنی امیہ یہ نہیں چاہتے کہ بنی ہاشم کا ایک فرد بھی زندہ رہے حتیٰ کہ طفلِ شیر خوار کو بھی تیر کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے اور اہلبیتِ پیغمبرؐ کے ساتھ اتنی سختی کرتے ہیں جتنی ترکی اور دیلم کے مشرک قیدیوں کے ساتھ بھی نہیں کی جاتی اور ان کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اسلام اور آثارِ نبوت کو نابود کر دیں اور حکومت پر قبضہ جمائے رکھیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، لوگ بنی امیہ کی حرکتوں سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ وہ زیادہ تر غلط فہمی میں مبتلا تھے اور انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ معاویہ کو جس نے اپنی زیادہ تر عمر کفر و شرک کے اندھیرے میں گزاری تھی اور فتح مکہ کے موقع پر بہ امر مجبوری ظاہرا طور پر ایمان لے آیا تھا عمار بن یاسرؓ ذوالشہادتین اور ابن تیہان بلکہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ہم پلہ سمجھتے تھے۔ ربیع بن خثیم جو ایک مشہور و ممتاز تابعی تھے اور جن کا شمار زہادِ ثمانیہ میں ہوتا ہے۔ جنگ صفین کے موقع پر امیرالمومنینؑ کے پاس آئے اور کہا:

"یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِنَّا شَکَکْنَا فِیْ هٰذَا الْقِتَالِ عَلٰی مَعْرِفَتِنَا بِفَضْلِكَ"

"اے امیرالمومنینؑ! ہم آپ کے مرتبے اور فضل و کمال سے تو واقف

ہیں لیکن ہمیں اس جنگ کے بارے میں شک ہے کہ حق کس طرف ہے۔"

اسی قسم کے لوگ اور بھی بہت تھے جن پر عوام کی نظریں لگی رہتی تھیں اور جن کی لوگ اتباع کرتے تھے۔ رائے عامہ کو پوری طرح گمراہ کر دیا گیا تھا، خصوصاً اہلِ شام اور وہ لوگ جو معاویہ کے زیر اثر عجیب غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔

نصر بن مزاحم نے بیان کیا ہے کہ ہاشم مرقال اور کوفہ کے قاریوں کی ایک جماعت دشمن کے ساتھ جنگ میں مشغول تھی کہ ایک غسانی جوان میدان میں آیا اور رجز پڑھنے اور امام علیؑ پر لعنت کرنے لگا۔ ہاشم مرقال نے کہا کہ: اے جوان! خدا سے ڈر۔ آخر خدا کو منہ دکھانا ہے۔ وہاں ہر بات کا جواب دینا پڑے گا۔ اس نے پلٹ کر کہا:

"لِاَنَّ صَاحِبَکُمْ لَا یُصَلِّیْ کَمَاذُکِرَ لِیْ وَاِنَّکُمْ لَا تُصَلُّوْنَ"

"میں ضرور تم سے لڑوں گا کیونکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارا امیر نماز نہیں پڑھتا، نہ تم پڑھتے ہو۔"

ہاشم نے اسے سمجھایا اور اس کی غلط فہمی دور کی تو وہ واپس چلا گیا۔[1]

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ امام حسینؑ کی تحریک کے آغاز سے بیس برس قبل لوگ امیر المومنینؑ کے فضائل و مناقب میں اتنی احادیث کے باوجود آپ کے مرتبے سے ناواقف تھے۔ بیس سال بعد تو حالات بالکل ہی دگرگوں ہو چکے تھے۔ معاویہ نے اسلامی حقائق کو مسخ کرنے کے لیے پروپیگنڈا کیا۔ تمام اسلامی علاقوں میں اس کے

---

[1] کتاب صفین طبع ثانی مصر صفحہ ۳۵۴

کارندے اس کے احکام کو عملی شکل دے رہے تھے اور دین کی بنیاد بالکل ڈھے گئی تھی۔ جائز چیزیں ناجائز ہو گئی تھیں اور ناجائز، جائز ہو گئی تھیں اور یزید کی حکومت میں تو آثارِ اسلامی کے بالکل ہی مٹ جانے کا امکان تھا۔ خود امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا:

"إِذَا بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلَ يَزِيْدٍ فَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ"۔

یعنی "جب امت پر یزید جیسے حکمران مسلط ہو جائیں تو اسلام کا خدا ہی حافظ ہے"۔

اور وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ امام عالیمقام عؑ کو کوفیوں نے دعوت دی تھی اور چونکہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ مبادا حرم ہی میں قتل کر دیے جائیں اور حرم کی بے حرمتی ہو اس لیے آپ نے کوفیوں کی دعوت قبول کر لی اور وہیں سے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اگر کوفی دعوت نہ دیتے تو شاید آپ یہ اقدام نہ کرتے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دراصل کوئی تحریک تھی ہی نہیں بلکہ ایک مجبوری کا فیصلہ تھا۔ اس سلسلے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر مسلمؑ ابن عقیل کی شہادت کی خبر ملنے پر تو یقین ہو گیا تھا کہ کوفی وفادار نہیں ہیں اور ان سے مدد کی کوئی امید نہیں۔ پھر آپ وہیں سے واپس ہو کر صحرا میں روپوش کیوں نہ ہو گئے۔ اس وقت تک تو لشکرِ حُر بھی نہیں پہنچا تھا بلکہ اس لشکر سے مڈبھیڑ کے بعد بھی واپس ہو سکتے تھے۔ آپ اس لشکر کا مقابلہ بھی کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے وہ آتشیں خطبہ کیوں دیا جو طبری وغیرہ نے نقل کیا ہے جس میں آپ نے کہا تھا:

مَنْ رَأَى سُلْطَانًا جَائِرًا مُسْتَحِلًّا لِحَرَمِ اللهِ

نَاكِثًا لِعَهْدِ اللهِ ..... الخ

"جو شخص ظالم فرمانروا کو حرام چیزوں کو حلال کرتے اور اللہ کے عہد کو توڑتے دیکھے ..... الخ"

اگر صرف اہلِ کوفہ کی دعوت قبول کرنے کا سوال تھا تو پھر آپ نے مکّہ سے روانہ ہونے سے پہلے بصرہ کے پانچ سرداروں یزید بن مسعود نہشلی، مالک بن مسمع، احنف بن قیس، منذر بن جارود اور مسعود بن عمرو کو خطوط کیوں لکھے اور ان سے امداد کیوں طلب کی؟

معلوم یہی ہوتا ہے کہ آپ ایسا انقلابی قدم اٹھانا چاہتے تھے جس کی گونج پورے عالمِ اسلامی میں سنائی دے اور مغرور دشمن اپنی کامیابی کے نشے میں اہلِ بیتِ پیغمبرؐ کو مختلف شہروں میں پھرائے تاکہ لوگ انہیں نزدیک سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ بنی امیہ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں رکھتے اور آلِ رسولؐ کی مظلومیت عالم آشکارا ہو جائے تاکہ بنی امیہ کی جڑیں کٹ جائیں، ورنہ گزشتہ بیس سال کے یکطرفہ پروپیگنڈے کے بعد انہیں حق و باطل میں تمیز کا موقع کہاں ملتا۔ شامیوں نے تو شاید حسنینؑ کا نام بھی کبھی عزت و احترام سے نہیں سنا تھا اس لیے عوام کو بیدار کرنے کی اور کوئی صورت بجز اس کے نہیں تھی کہ علیؑ بن حسینؑ اسی منبر سے جس پر سے علیؑ ابن ابی طالب کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا رہا تھا۔ علیؑ کے فضائل و مناقب بیان کریں اور اہلِ شام میں یزید کے خلاف شورش پیدا کی جائے تاکہ ان کے والد اور بھائیوں کے قتل کا قصہ برسوں ہر محفل اور ہر مجلس میں موضوعِ سخن رہے۔

جب امیر المومنینؑ محرابِ مسجد میں شہید کیے گئے تو شامی حیرت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اچھا! علیؑ نماز بھی پڑھتے تھے جو مسجد میں آئے اور وہاں محراب

ہیں مارے گئے۔

ممکن ہے کہ کوئی اعتراض کرے کہ اگر واقعی آپ کا تحریک چلانے کا خیال تھا تو پھر آپ نے روزِ عاشور یہ کیوں کہا کہ "مجھے جانے دو میں کسی امن کی جگہ چلا جاؤں گا"۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ طبری میں اس قسم کی ایک روایت ضرور موجود ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ امامؑ نے یہ فرمایا تھا کہ میں تحریک ہی سے دستکش ہو جاتا ہوں اور اب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کروں گا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کوفیوں نے آپ کو دعوت دے کر بلایا تھا اور اب وہ اپنی دعوت سے پھر گئے تھے اس لیے آپ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی باتوں اور خطوط پر پشیمان ہو تو کوئی بات نہیں، میں واپس چلا جاتا ہوں۔ یہ نہیں کہ تحریک ہی سے دستبردار ہوتا ہوں۔

رہی یہ بات کہ آپ نے مختلف لوگوں سے مدد کیوں طلب کی تو وجہ یہ ہے کہ جن کو آپ نے مدد کے لیے دعوت دی تھی وہ عموماً ایسے عراقی تھے جو اپنے شہر اور دیار میں صاحب اثر و رسوخ تھے۔ اب چاہے وہ مدد کے لیے حاضر ہوئے ہوں جیسے زہیر بن قین اور ضحاک وغیرہ یا حاضر نہ ہوئے ہوں، سب ہی آتشِ انقلاب کو بھڑکانے میں موثر ثابت ہوئے۔ ضحاک مشرقی کو دیکھیے، انہوں نے عاشورا کے واقعات بچشم خود دیکھے اور بعد میں ہر شخص کے سامنے کوفہ میں ان واقعات کو نقل کرتے رہے۔ روزِ عاشورا کے اکثر واقعات ضحاک ہی سے منقول ہیں۔ یہ صاحب صحیح معنوں میں وقائع نگار اور امامؑ کے پبلک ریلیشن آفیسر ثابت ہوئے ورنہ جسے یقین ہو کہ مرنے کے لیے جا رہا ہوں اسے کسی کی چند ساعت کی رفاقت سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ ایک دوسرے صاحب عبید اللہ بن حر جعفی تھے جو صفین

میں معاویہ کے ساتھی اور خونِ عثمان کے بدلے کا مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ اگرچہ امام کی مدد کے لیے حاضر نہیں ہوئے اور معذرت کر دی لیکن جب اہلبیتؑ کوفہ سے شام کے لیے روانہ ہوئے تو ابنِ زیاد نے اشرافِ کوفہ کے ایک ایک فرد کو بلایا اور ان کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ عبیداللہ بن حر نہیں آئے۔ چند روز بعد کوفہ میں آکر ابنِ زیاد سے ملے۔

ابنِ زیاد نے پوچھا: "تم کہاں تھے؟ تم نے ہماری مدد کیوں نہیں کی؟"

کہا: "میں بیمار تھا۔"

ابنِ زیاد نے کہا: "تمہارا دل بیمار تھا یا جسم؟

کہا: "دل تو قطعی بیمار نہیں تھا، ہاں میں خود ضرور بیمار ہو گیا تھا چند روز میں اللہ نے شفا دی۔"

ابنِ زیاد نے کہا: "تو جھوٹ بولتا ہے۔ تو ہمارے دشمن کے ساتھ تھا۔"

عبیداللہ نے کہا: "اگر میں تمہارے دشمن کے ساتھ تھا تو تمہیں معلوم ہی ہوگا، چھپ تو سکتا نہیں۔"

راوی کہتا ہے کہ ابن زیاد سے آنکھ بچا کر عبیداللہ بن حر باہر کھسک گئے۔ ابھی گھوڑے پر سوار ہی ہوئے تھے کہ ابن زیاد کو خیال آگیا۔ اس نے کہا، یہ عبیداللہ کہاں چلا گیا، اسے بلاؤ۔ پاسبانوں نے عبیداللہ کو باہر تلاش کر کے ان سے کہا کہ تمہیں امیر بلا رہے ہیں، ان کے پاس چلو۔ عبیداللہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کہا امیر سے کہہ دو کہ اب کبھی میں اپنی خوشی سے اس کے پاس نہیں آؤں گا۔ وہاں سے نکل کر سیدھے احمر بن زیاد طائی کے مکان پر آئے۔ وہاں انکے اور دوست احباب بھی اکٹھے ہوئے اور سب ملکر کربلا پہنچے۔ وہاں قبورِ شہداء کی زیارت کی اور رنج و غم

کا اظہار کیا۔ کچھ شعر امامؑ کے مرثیے کے کہے۔ شاید یہی پہلے شخص تھے جو امامؑ کی قبر کی زیارت کے لیے گئے اور جنہوں نے امامؑ کا مرثیہ کہا۔

بعد میں مختار کی ہمراہی میں امامؑ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے نکلے اور آخرِ دم تک حکومتِ وقت کی مخالفت میں سرگرم رہے۔ صاحبِ رجال نجاشی نے ان کا شمار سلفِ صالحین میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب میں امیرالمومنینؑ کے خطبات جمع کیے تھے۔

ایک اور صاحب جن سے امامؑ نے مدد طلب کی تھی زہیر بن قین تھے۔ یہ اشرافِ کوفہ میں سے تھے اور اپنے قبیلہ بجیلہ میں با اثر تھے، چونکہ یہ بھی جنگِ صفین کے موقع پر طالبانِ قصاصِ عثمان میں سے تھے اور بعد میں بھی کوفہ میں حکومت کے طرفداروں میں رہے تھے اس لیے جب یہ امامؑ سے مل گئے تو دوسروں پر اس کا اچھا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ ان کے مارے جانے سے کوفہ کے کئی قبیلوں کو صدمہ ہوا اور اس کے نتیجے میں انھوں نے حکومتِ وقت کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا اور انتقام لینے کے لیے موقع کے منتظر رہنے لگے۔ صرف زہیر ہی کا قتل قبیلہ بجیلہ اور اس سے وابستہ دوسرے قبائل کے غیظ و غضب کا سبب نہیں ہوا بلکہ کوفہ اور بصرہ کے جتنے لوگ امامؑ کی ہمراہی میں مارے گئے ان کے قتل نے اکثر قبائل کو صدمہ پہنچایا کیونکہ یہ سب اعیان و اشراف میں سے تھے۔ ان کی موت سے ان دونوں شہروں کے اکثر قبیلے سوگوار ہو گئے اور ان کا خون حکومت کو بہت مہنگا پڑا۔ اسی دن سے شیعانِ کوفہ کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ انھوں نے ایک خفیہ پارٹی بنالی۔ ہر شب کسی ایک کے گھر میں جمع ہو کر شہداء کو یاد کرتے اور گریہ و بکا کرتے چپکے چپکے لوگوں سے حکومت کی مخالفت اور خونِ حسینؑ کا بدلہ لینے کا عہد لیتے۔ روز بروز ان لوگوں

کی تعداد بڑھتی گئی اور عراق کے سیاسی حالات خطرناک سے خطرناک تر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ تین سال بعد جب یزید ہلاک ہو گیا تو ان کی تحریک کھل کر سامنے آگئی۔ عمرو بن حریث کو جو کوفہ کا عامل تھا گرفتار کر کے باہر نکال دیا گیا۔ لوگوں نے مسجد کوفہ میں جلسہ کیا جس میں سب سردارانِ قریش شریک ہوئے اور عارضی حکومت کے لیے چند اشخاص کا نام تجویز کیا گیا جن میں سے ایک بقول طبری[1] عمرو بن سعید تھا یا جیسا کہ حاج فرہاد مرزا نے قمقام میں لکھا ہے عمر بن سعد تھا۔ یہ سن کر قبیلہ ہمدان کی عورتیں باہر نکل پڑیں اور گریہ و زاری کی صدائیں بلند کر دیں۔ بعد میں قبیلہ نخع، ربیعہ اور کہلان کی عورتیں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ شمشیر بستہ مرد ان کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔ عورتوں نے مسجد میں منبر کے گرد جمع ہو کر گریہ و بکا کیا اور کہا کہ یہی کافی نہیں کہ عمر بن سعد نے زہراؑ کے لال کو قتل کر دیا؟ اب وہ ہمارے سر پر سوار ہونا اور کوفہ کا امیر بننا چاہتا ہے۔ ان خواتین نے کوفہ میں باقاعدہ مصائب سید الشہداءؑ کی یاد تازہ کی۔ اس سے پہلے کوفہ کی جامع مسجد میں شہدائے کربلا کی یاد میں مجلس عزا منعقد نہیں ہوئی تھی۔

بصرہ میں بھی کوفہ کی طرح ہنگامہ ہوا۔ ہر طرف سے ابن زیاد کی مخالفت شروع ہو گئی اور اسے بھیس بدل کر وہاں سے شام کی طرف بھاگنا پڑا۔ مکہ میں عبداللہ بن زبیر نے اپنے لیے بیعت لینا شروع کر دی۔ شام میں ایسا عجیب انقلاب آیا کہ امیر معاویہ کی وہ ساری کوششیں بیکار ہو گئیں جو انہوں نے اپنے

---

[1] غالباً یہ دوسرا نام ہی صحیح ہے۔ طبری کو تسامح ہوا ہے یا کتابت کی غلطی ہے کیونکہ عمرو بن سعید نامی کوئی شخص امام حسینؑ کے قتل میں شریک نہیں تھا۔

خاندان میں خلافت مستحکم کرنے کے لیے کی تھیں اور تین چار سال کی منحوس یزیدی حکومت کے بعد پھر آلِ ابی سفیان میں سے کسی کو مسندِ خلافت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔

اب رہی یہ بات کہ آپ نے اپنے اصحاب کو چلے جانے کی اجازت کیوں دی اور اس پر اصرار کیوں کیا تو یہ ظاہر ہے کہ امامؑ کسی ایسے شخص کو جو دنیاوی لالچ میں آپ کے ساتھ ہو گیا تھا دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ جو لوگ آپ کے ساتھ جان دینے پر آمادہ ہوں، وہ اپنے عقیدے پر بالکل پختہ ہوں اور جو کچھ کریں کورکورانہ نہ کریں، علیٰ وجہ البصیرت کریں۔ کسی پر کوئی زبردستی نہ کی جائے۔ یہ بھی اسلام کی ایک خصوصیت ہے کہ اسلام کے سب سپاہی بیدار اور ہوشیار ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں[1] یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ حق و باطل میں کس قدر فرق ہے۔ جھوٹے مدعی اپنے مریدوں کو کبھی آسانی سے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے لیکن مردانِ حق کا یہ شیوہ نہیں۔ وہ لوگوں کو اجازت دیتے ہیں کہ اپنی مرضی کے مطابق جو راستہ چاہیں اختیار کریں۔ صرف انہیں یہ بتادیتے ہیں کہ خیر کا راستہ یہ ہے اور شر کا راستہ وہ ہے۔

اس سفر سے حضرت سید الشہداءؑ کا مقصد ریاست و سلطنت حاصل کرنا نہیں تھا کہ جس طرح بھی ہو سکتا ان سب کو جو آپ کے ساتھ آگئے تھے مختلف حیلے بہانوں سے اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے اور کسی کو جدا نہ ہونے دیتے۔ آپ نے صاف فرما دیا تھا:

---

[1] ملاحظہ فرمائیں کتاب "فلسفہ شہادت" مؤلفہ مرتضیٰ مطہری۔ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی۔

اَلَا وَاِنِّیْ لَاَظُنُّ یَوْمَنَا مِنْ هٰؤُلَآءِ الْاَعْدَآءِ غَدًا وَاِنِّیْ قَدْ اَذِنْتُ لَکُمْ فَانْطَلِقُوْا جَمِیْعًا فِیْ حِلٍّ لَیْسَ عَلَیْکُمْ مِنِّیْ ذِمَامٌ وَهٰذَا اللَّیْلُ قَدْ غَشِیَکُمْ فَاتَّخِذُوْهُ جَمَلًا۔

"میرے خیال میں کل دشمن سے جنگ ہو گی۔ میں نے اپنی بیعت کی پابندی تم پر سے اٹھالی ہے۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر چلے جاؤ۔"

آپ کے اصحاب اور بنی ہاشم نے بھی کیا خوب جواب دیا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ شَرَّفَنَا بِالْقَتْلِ مَعَکَ وَلَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا بَاقِیَةً وَکُنَّا فِیْهَا مُخَلَّدِیْنَ لَاٰثَرْنَا النُّهُوْضَ مَعَکَ عَلَی الْاِقَامَةِ فِیْهَا"

"اللہ کا شکر کہ جس نے ہمیں آپ کی معیت میں شہادت کا شرف عطا کیا۔ اگر بالفرض محال دنیا جاودانی بھی ہوتی تو بھی اس دنیا میں زندہ رہنے پر ہم آپ کے ساتھ مرنے کو ترجیح دیتے۔"

اس کے علاوہ امامؑ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان لوگوں کا امتحان لیں اور ان پر اتمام حجت کردیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون برضا و رغبت ہمارے ساتھ ہے اور کون مجبوراً ساتھ دے رہا ہے تاکہ کل کوئی پشیمانی کا اظہار نہ کر سکے اور یہ نہ کہہ سکے کہ میں تو پھنس گیا تھا اور نہ دشمن ناہنجار کے مقابلے میں کمزوری دکھائے۔ نیز دشمن بھی یہ نہ کہہ سکے کہ حسینؑ بن علیؑ نے ریاست و دنیاداری کے لالچ میں اپنے ساتھیوں

کو دھوکا دیا۔ چنانچہ آپ نے صاف صاف فرمادیا:

"تَفَرَّقُوْا فِیْ سَوَادِکُمْ وَمَدَائِنِکُمْ فَاِنَّ الْقَوْمَ یَطْلُبُوْنِیْ وَلَوْ اَصَابُوْنِیْ لَذَهَلُوْا عَنْ طَلَبِ غَیْرِیْ۔"

یعنی "تم اپنے اپنے شہروں اور دیہاتوں کو چلے جاؤ۔ یہ لوگ صرف مجھے قابو میں لانا چاہتے ہیں اور اگر مجھے قابو میں کر لیں تو پھر انہیں کسی اور سے کوئی غرض نہیں۔"

یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ "اچھا برا جو راستہ بھی لوگ اختیار کریں، سوچ سمجھ کر اختیار کریں۔"

خلاصہ یہ کہ امام حسینؑ نے وہ کام کیا کہ ان کا لاشہ تا ابد اسلام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بن سکے اور آپکی قبر اور آپکا مزار ظلم و ستم کی ہر منظم کوشش کیلئے مستقل خطرہ بنا رہے۔

بنی امیہ اور بنی عباس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ لوگوں کو حضرت سید الشہداءؑ کے روضے کی زیارت سے باز رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے روضے کی اطراف میں چوکیاں اور قلعے قائم کیے اور مسلح فوجی مقرر کیے۔ نگرانی اتنی شدید تھی کہ کم ہی ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی زائر بچ کر نکل جائے۔ عموماً ایذا رسانی اور قتل و تعذیب سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ خلفاء کی طرف سے دباؤ جتنا بڑھتا جاتا تھا اتنی ہی لوگوں کی مزاحمت شدت اختیار کرتی جاتی تھی اور جتنا مزاحمت میں اضافہ ہوتا تھا اتنی ہی انتظامیہ کی پریشانی بڑھتی تھی اور پہرہ چوکی کا انتظام سخت تر کر دیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں کتنے ہی ہاتھ کاٹے گئے، کتنے ہی سر تن سے جدا کیے گئے اور کتنے ہی جسموں کے ٹکڑے اڑا دیے گئے لیکن خلفا کا مقصد پورا نہ ہوا۔

عباسی دور میں بار بار حسینؑ ابن علیؑ کی قبر کو ویران کیا گیا، پانی چھوڑا گیا اور ہل چلا دیے گئے لیکن حکومت کی طرف سے ذرا سی ڈھیل کا احساس ہوتے ہی لوگوں نے مرمت کر لی یا نئی عمارت بنا لی۔ روضۂ مطہرہ کی تاریخ کے مطالعے سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ کب اور کس نے اس کی ویرانی کا حکم دیا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس نے دوبارہ تعمیر کرایا اور کس نے مرمت اور تعمیر کے اخراجات برداشت کیے۔ اسی سے لوگوں کی جاں نثاری اور خلوص کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دربار حسینؑ کی زیارت سے لوگوں کو باز رکھنے کی اس کے سوا کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ظالمانہ حکومتیں لوگوں میں زیارت کے شوق و جذبے اور تربت حسینؑ پر لوگوں کے اجتماع کو اپنی سیاست بلکہ اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتی تھیں۔

زائر حسینؑ خوب جانتا ہے کہ حسینؑ شہید راہ عدالت ہیں۔ انھوں نے ظلم و ستم کو روکنے کے لیے جان دی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے سر کٹوایا۔ انھوں نے مرنا منظور کیا مگر غاصبانہ حکومت کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے استبداد اور ظلم کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اسی لیے کوئی خلیفہ بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ حسینؑ بن علیؑ کی طرف اتنی توجہ ہو کہ لوگ ان کی زیارت اور عزاداری کے لیے جان کی بازی لگا دیں۔

حکومت کے پہرے چوکیوں کی سختی کے باوجود شب کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر لوگ روضۂ حسینؑ پر پہنچتے تھے اور دن نکلنے سے پہلے غاضریہ یا نینوا چلے جاتے تھے، جو کربلا کے قریب ہی واقع ہیں۔ مندرجہ ذیل واقعے سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

ابو الفرج اصفہانی نے اپنی کتاب مقاتل الطالبیین میں ایک شخص

محمد بن حسین اشنانی سے روایت کی ہے کہ میں خوف کے باعث مدت سے حسینؑ بن علیؑ کی زیارت سے محروم تھا۔ بالآخر میں نے کہا ہرچہ بادا باد، میں زیارت کے لیے ضرور جاؤں گا۔ میں اور ایک عطر فروش دونوں تیار ہو گئے اور زیارت کے لیے چلے۔ ہم دن میں چھپے رہتے اور رات بھر چلتے یہاں تک کہ غاضریہ کے نواح میں پہنچ گئے۔ وہاں سے رات کو نکل کر جب پہرہ دار سو رہے تھے، آہستہ آہستہ ابو عبداللہؑ کی قبر مطہر تک پہنچے۔ ویرانی کی وجہ سے قبر کی صحیح نشاندہی نہیں ہو سکتی تھی۔ تلاشِ بسیار کے بعد قبر ملی۔ قبر کا تعویذ ایک طرف ٹوٹا ہوا اور آدھا جلا ہوا پڑا تھا اور قبر کے چاروں طرف پانی کھڑا تھا۔ کچھ حصے میں زمین نرم ہو کر دھنس گئی تھی اور گڑھوں نے خندق کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بارے قبرِ مطہر کی زیارت کی اور اس کی خوشبو سے مشامِ جاں کو معطّر کیا۔ میں نے اپنے عطر فروش ساتھی سے پوچھا کہ یہ کونسی خوشبو ہے؟ اس نے کہا واللہ باللہ میں نے ایسی خوشبو اس سے پیشتر کبھی نہیں سونگھی تھی۔ آخر قبر سے رخصت ہوئے اور جگہ جگہ نشانیاں چھوڑ آئے۔ پھر جب متوکل قتل ہو گیا تو ہم اور آلِ ابی طالبؑ کے کچھ افراد زیارت کے لیے گئے اور یا ہمی مدد سے دوبارہ پہلی سی قبر بنا دی۔

اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ زیارتِ امام حسینؑ کا کس قدر اہتمام کرتے تھے۔ امام حسینؑ حق و باطل کے فرق کا معیار سمجھے جاتے تھے اور جو حسینؑ کی مخالفت کرتا تھا، چاہے عزاداری اور زیارت سے روکنا ہی کیوں نہ ہو، اسے ظالم سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سید الشہداءؑ کے بعد ائمہ اہلبیتؑ نے قبرِ حسینیؑ کی زیارت کی بڑی ترغیب دلائی ہے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ اطہارؑ زیارتِ سید الشہداءؑ کو اسلام کا ایک جزو لاینفک

تصور کرتے تھے۔ سفرِ حج کے وجوب کے لیے تو جان کا خوف نہ ہونا ایک ضروری شرط ہے چنانچہ سب فقہاء نے یہی فتویٰ دیا ہے لیکن زیارتِ حسینؑ کے بارے میں ائمہؑ نے کہا ہے کہ جتنا زیادہ خوف ہو اور دشمن کی طرف سے جتنی زیادہ ممانعت ہو، زیارت کا اتنا ہی زیادہ ثواب ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ حج کی اس قدر عظمت کے باوجود جان کے خوف کی صورت میں حج تو نہ کیا جائے اور زیارتِ کربلا کی اس وقت بھی تاکید ہو جب نوّے فیصد مارے جانے کا اندیشہ ہو۔[1] اس لیے یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ائمہ اطہارؑ ایسے موقعوں پر حج بیت اللہ کی بقاء زیارتِ حسینؑ ابن علیؑ سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اس کے سوا ان روایات کا کوئی محل نہیں ہو سکتا۔

پیغمبرِ اکرمؐ سے مشہور روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

"حُسَيْنٌ مِنِّي وَأَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ۔"

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔"

اس کا مطلب صرف یہی نہیں کہ حسین میرے جسم کا ٹکڑا ہے کیونکہ ہر بچہ اپنے نانا، دادا کا جگر گوشہ تو ہوتا ہی ہے۔ فرض کیجیے کہ اس جملے کے پہلے حصے کے یہی عام معنی مراد لیں تو پھر دوسرے حصے کا یعنی "أَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ" "میں حسینؑ سے ہوں" کا کیا مطلب ہو گا؟ اس لیے اس حدیث کے صحیح معنی یہی ہیں کہ رسول الثقلینؐ نے فرمایا کہ حسینؑ کا وجود مجھ سے ہے اور میرے دین کی بقاء حسینؑ سے ہے۔

---

[1] کامل الزیارات۔ محمد ابن قولویہ صفحہ ۲۶۱

سید الشہداءؑ کی شہادت کے بعد علویوں نے بنی امیہ اور بنی عباس کے خلاف جتنی لڑائیاں لڑیں ان میں سے بیشتر میں علویوں کا نعرہ "یَا لِثَارَاتِ الْحُسَیْن" - "خونِ حسینؑ کا بدلہ" ہی تھا۔ علوی اکثر قبرِ مطہر پر جمع ہو کر ایک دوسرے سے بیعت لیتے تھے۔ اسی وجہ سے خلفاء امامؑ کے مرقد مطہر سے خائف رہتے تھے اور ان کے ظلم وستم کے ایوانوں میں زلزلہ برپا رہتا تھا۔ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر زیارت پر پابندی لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ بنی امیہ شہادت امامؑ کے بعد ستر سال تک برسر اقتدار رہے۔ اس پورے عرصے میں ان کے عمال اور عہدیدار زیارت کی مزاحمت کرتے رہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اموی انتظامیہ نے حسینؑ کو قتل کیا تھا اس لیے زیارتِ حسینؑ امویوں کے لیے رسوائی اور شرم کا موجب تھی۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے لیکن بنی عباس تو خود مجرم نہیں تھے۔ وہ زیارتِ حسینؑ ابن علیؑ کے اس قدر مخالف کیوں تھے؟ زیادہ سختی تو بنی عباس ہی نے کی۔ اس سلسلے میں لوگوں کے ہاتھ کاٹے اور سر اڑائے۔ بنی امیہ کو تو ستر سال میں بھی ایسی جرأت نہیں ہوئی لیکن بنی عباس نے قبرِ مطہر کو ویران کرنے، وہاں پانی چھوڑنے اور ہل چلوانے میں کوتاہی نہیں کی، یہ سب کیوں؟ اسی لیے تاکہ وہ لاشۂ حسینؑ سے بھی خوفزدہ تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ شہدائے عاشورا کی تربت سے باہوش زائرین کے کانوں میں صاف یہ صدا آتی ہے کہ:

"اے گزرنے والے! ہمارے ہم کیشوں تک یہ پیغام پہنچا دو کہ ہمارے اس لیے ٹکڑے کر دیے گئے کہ ہم نے جفا پیشہ حکومت کا مقابلہ کیا۔ ہمیں ظالم انتظامیہ نے خون میں نہلایا، ہم نے حاکمانِ وقت کو ان کی

بدعنوانیوں سے روکنے کی کوشش کی تو انھوں نے ہمیں ذبح کردیا۔ ہم
نے اسلامی آئین کی بات کی تو ہمارے پرخچے اڑادیے گئے۔ ہمارے
جسموں کو گھوڑوں کے سموں تلے روندا گیا لیکن ہم مزاحمت کرتے رہے۔
ہم نے کینہ پرور دشمن کو دنیائے انسانیت میں رسوا کردیا اور اسلامی قانون کی
حفاظت کے لیے جاں نثاری اور فداکاری کا ایک نیا باب دنیا والوں
کے لیے کھول دیا۔ اے آنے والو! اب تم اپنے دین کی قدر پہچانو اور
اسے کوڑیوں کے مول نہ بیچو۔ اس کی حفاظت اور حمایت کے لیے ہم
جیسے لاکھوں انسانوں کا خون بہا ہے۔ خونِ شہداء کا احترام کرو۔
اپنے دین کی عظمت کو سمجھو اور دین داری میں غفلت نہ کرو۔ زیارت
کا مطلب یہی ہے کہ زائر یہ سمجھے کہ وہ کس کی زیارت کر رہا ہے؟
اس کا مقام کیا ہے، اس کا پیغام کیا ہے اور وہ کیوں اس
مرتبے پر پہنچا ہے؟"

علی اکبر غفاری

"جو شخص اپنے آپ کو سیّد الشّہدار امام حسین علیہ السّلام کا سچا اور مخلص پیرو سمجھتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شجاع، غیّور اور فداکار ہو نہ کہ بُزدل اور کاہل۔ اسے چاہیئے کہ مسلمانوں کے حالات کی اصلاح اور دین کی سربلندی کی خاطر رضا کارانہ طور پر مال و دولت اور رتبہ و منصب غرضیکہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے اور وہ جو کچھ بھی رکھتا ہو اسے اس عظیم مقصد کی خاطر ٹھکرا دے۔"

آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی
کی کتاب بیان سے ماخوذ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ بَارِئِ الْخَلَائِقِ اَجْمَعِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ۔

اب ہم سید الشہداء امام حسینؑ کی تحریک پر جو اسلامی تاریخ کا ایک درخشندہ ترین باب ہے، ایک نظر ڈالتے ہیں اور ایک سال سے بھی کم مدّت میں جو واقعات پیش آئے انہیں مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعات کمیّت کے لحاظ سے مختصر سہی لیکن کیفیّت کے لحاظ سے زوال ناپذیر اور بہت پر اثر ہیں۔

اسلامی اور غیر اسلامی تاریخ کے ہر باب میں ایسی تحریف ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے جس سے تاریخی واقعات کی شکل ہی بدل جاتی ہے اور آنے والے محققین کے لیے تحقیق کا کام بہت دشوار ہو جاتا ہے کبھی یہ تحریف نادان طرفداروں کی طرف سے ہوتی ہے اور کبھی کینہ پرور مخالفوں کی طرف سے۔ تاریخ کا کون سا

صفحہ ہے جو ایسی دستبرد سے بچا ہو اور خیانت کار ہاتھوں نے اس کا چہرہ مسخ نہ کر دیا ہو۔

صرف امام حسینؑ کی تحریک کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کسی بدباطن دشمن کو اس میں تحریف کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ تحریک اس قدر واضح، روشن اور ناقابل تنقید رہی ہے کہ آپ کے والد علیؑ اور آپ کے بھائی حسنؑ کے دشمنوں کو بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور دل و جان سے تحسین و آفرین کرنی پڑی۔ جن حالات میں اس تحریک کا آغاز ہوا اور اس وقت کی اسلامی حکومت کی جو حالت تھی اس نے اس تحریک کی ضرورت کو سمجھنے میں مدد دی ہے چنانچہ جس نے بھی اس تحریک پر قلم اٹھایا ہے اس نے اس کے رہنماؤں کی عظمت، بزرگی، شجاعت، صاف گوئی، مردانگی، حریت پسندی اور آزاد منشی کا اعتراف کیا ہے لیکن سخت افسوس کی بات ہے کہ جاہل طرفداروں اور ضرورت سے زیادہ پرجوش دوستوں کی طرف سے بہت سی بے بنیاد باتیں، بے سرو پا قصے، گمراہ کن جھوٹ بھی اس تحریک سے متعلق تحریروں اور تقریروں میں شامل ہو گئے ہیں۔ کربلا کی تاریخ کو ہر قسم کے جھوٹ، افسانہ طرازیوں اور بے اساس باتوں سے پاک اور منزہ رکھنا سالارِ شہیداں کی بارگاہِ مقدس کی ایک بڑی خدمت ہے لیکن اس کام کی انجام آوری کی توقع عوام اور کم سواد لوگوں سے نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ مصیبت خود انہی لوگوں کی لائی ہوئی ہے۔ ایسے ہی لوگ اس انقلابِ مقدس کے خلاف کام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق کو باطل کے ذریعے اور سچ کو جھوٹ کے ذریعے پھیلایا جا سکتا ہے، امانت کو خیانت کے ذریعے اور تقویٰ کو بے تقوائی سے رواج دیا جا سکتا ہے۔ امام حسینؑ کی تحریک کو کمزور روایتوں اور لغو اور بے اصل باتوں سے الگ

رکھنا اور جو کچھ تیسری، چوتھی صدی ہجری کے مصنفین نے لکھا ہے اسی پر اکتفا کرنا صرف صاحب بصیرت اور باتقویٰ عالموں کا کام ہے اور یہ ان کا فرض ہے کہ اپنی زبان اور اپنے قلم سے سچ بولیں اور اپنی تحریر و تقریر میں جھوٹ اور افسانہ طرازی سے پرہیز کریں۔ اگر ایسا ہو تو تاریخ اسلامی کے اس روشن اور مقدس باب کی بنیاد حق و راستی اور تحریر و تقریر کی امانت پر قائم ہوگی۔ اسلامی تاریخ کے اس عظیم ترین واقعہ کی قدر و قیمت اور اس کے رہبرِ عالی وقار کی عظمت پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہوگی اور ہماری مجالسِ عزا میں بھی عظمت، وقار، خلوص، جاں نثاری، جہاد، استقامت اور جوانمردی کے آثار جلوہ گر ہوں گے۔

امیر شام کا نفوذ

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے تقریباً پچاس سال، حضرت امیرالمومنین[1] علیہ السلام کی شہادت سے بیس سال اور امام حسنؑ کی شہادت سے دس سال بعد وسطِ ماہ رجب ۶۰ھ میں معاویہ بن ابی سفیان نے اس دنیا سے کوچ کیا۔ معاویہ نے کم و بیش ۴۲ برس

---

[1] یہ لقب شیعوں میں فقط حضرت علیؑ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دمشق میں امارت وخلافت کی۔ پانچ سال کے قریب خلیفۂ دوم کی طرف سے اور تقریباً بارہ سال خلیفۂ سوم کی طرف سے امیرِ شام رہے۔ پانچ سال سے کچھ کم امیرالمومنینؑ کے دورِ خلافت میں اور چھ ماہ کے قریب امام حسنؑ کی خلافت کے دوران میں بھی شام پر معاویہ کا قبضہ رہا اور علیؑ اور حسنؑ بن علیؑ سے آویزش جاری رہی۔ بیس سال سے کچھ کم خلافتِ اسلامی معاویہ کے قبضے میں رہی اور اپنی عمر کے اواخر میں انھوں نے اپنے بیٹے یزید کے لیے مسلمانوں سے خلافت کی بیعت لی۔ معاویہ خاندانِ بنی امیہ کے پہلے خلیفہ تھے۔ اس خاندان میں کل چودہ سفیانی اور مروانی خلفاء ہوئے جن کے ہاتھ میں ایک ہزار مہینے تک اسلامی حکومت کی باگ ڈور رہی۔

معاویہ کو اپنے زمانۂ خلافت میں حالات پر ایسا مکمل قابو حاصل تھا کہ وہ اس صلحنامے کی جو انھوں نے امام حسنؑ سے کیا تھا صریح خلاف ورزی پر بھی قادر تھے۔ مثلاً اس صلحنامے میں ایک شرط یہ تھی کہ شیعیانِ علیؑ کو ستایا نہیں جائے گا، انہیں قتل نہیں کیا جائے گا اور سب کو امان ملے گی۔ اس صلحنامے میں حجر بن عدی کا نام خاص طور پر درج تھا مگر اس بات پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ معاویہ نے حجر بن عدی اور ان کے چھ ساتھیوں کو مروا دیا۔ ان میں سے ایک کو تو زیاد بن ابیہ نے عراق میں زندہ درگور کر دیا۔ ان صاحب کا نام عبدالرحمٰن بن حسان عنزی تھا۔ معاویہ کو ایسا اقتدار حاصل تھا کہ وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے اور کسی کو چون وچرا کی مجال نہیں تھی۔

چوتھی صدی ہجری کے ایک بڑے مؤرخ اور جغرافیہ داں علی بن حسین مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھا ہے کہ صفین سے واپسی میں ایک شخص

اونٹ پرسوار دمشق میں آیا۔ ایک شامی اس سے الجھ پڑا کہ یہ اونٹنی تو میری ہے۔ جنگِ صفین کے دوران لوٹ میں چلی گئی تھی، تیرے ہاتھ لگ گئی۔ ان کا جھگڑا طول پکڑ گیا اور اوپر تک جا پہنچا۔ دونوں معاویہ کے پاس پہنچے۔ شامی نے پچاس گواہ پیش کیے کہ اونٹنی اس کی ہے۔ معاویہ نے پچاس آدمیوں کی شہادت پر فیصلہ دیدیا کہ اونٹنی شامی کی ہے اور کوفی کو مجبور کیا کہ اس کے حوالے کر دے۔ عراقی نے کہا کہ اللہ آپ کو نیکی دے، یہ اونٹ ہے اونٹنی نہیں۔ معاویہ نے کہا: میں نے فیصلہ دیدیا ہے اب میرا حکم بدل نہیں سکتا۔

جب بھیڑ چھٹ گئی تو معاویہ نے کوفی کو بلایا اور پوچھا کہ تیرا اونٹ کتنے کا تھا؟ اور اونٹ کی قیمت سے زیادہ رقم اس کو دلوادی اور اس سے کہا کہ علیؑ کو جا کر بتلا دینا کہ میرے پاس ان سے جنگ کے لیے ایک لاکھ آدمی ایسے ہیں جو اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر میں اونٹ کو اونٹنی یا اونٹنی کو اونٹ کہوں تو بھی چون و چرا نہیں کرتے۔

یہ داستان بیان کرنے کے بعد مسعودی لکھتا ہے کہ لوگ معاویہ کی اس قدر اطاعت کرتے تھے کہ اس نے جنگِ صفین کے لیے روانگی کے موقع پر بدھ کے دن نماز جمعہ کی اذان دلوادی اور لوگوں کے ساتھ مل کر نماز جمعہ پڑھی اور کسی نے نہ کہا کہ آج بدھ ہے، نماز جمعہ کیوں ادا کی جارہی ہے۔

مسعودی نے ایک اور قصہ لکھا ہے جسے ہم "النصائح الکافیہ لمن یتولی معاویہ" نامی کتاب سے نقل کرتے ہیں:

عمار بن یاسرؓ جنگِ صفین میں معاویہ کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ رسول اللہؐ نے (حسب روایت بخاری وغیرہ) مسجد کی تعمیر کے موقع پر دوسروں سے

زیادہ کام کرتے دیکھ کر کہا:

"عَمَّارٍ!! تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةِ، يَدْعُوهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيَدْعُونَهُ إِلَى النَّارِ"۔

عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کریگا۔ عمارؓ ان لوگوں کو جنت کی طرف بلا رہا ہوگا اور وہ لوگ اسے دوزخ کی طرف بلا رہے ہونگے۔

عمار کے قتل نے واضح کردیا کہ کون حق کی راہ میں لڑ رہا ہے اور کون طاغوت کی راہ میں، معاویہ نے اسی مشکل سے بچنے کے لیے کہا کہ عمار کو ہم نے قتل نہیں کیا۔ اس کے قاتل علیؑ ہیں جو انہیں جنگ میں گھسیٹ لائے۔ جب علیؑ سے معاویہ کا یہ قول نقل کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح تو سید الشہداء حمزہؓ کے قاتل جناب رسولؐ اللہ ٹھہرتے ہیں جو انہیں مشرکین سے جنگ کے لیے لے گئے تھے۔

معاویہ کو تو اطمینان تھا کہ وہ کیسی ہی غیر معقول بات کہیں لوگ مان لیں گے اس لیے انہوں نے یہ سن کر کہا، ٹھیک ہے عمارؓ کے قاتل ہم ہی ہیں لیکن رسولؐ اللہ کے کلام میں "فِئَةٌ بَاغِيَةٌ" کا لفظ ہے۔ باغیہ کے معنی ظالم نہیں طالب ہیں۔ ہم دم عثمان کے طالب ہیں۔ قصاص چاہتے ہیں۔ پس رسولؐ اللہ نے جو فرمایا اس کے معنی ہیں کہ عمارؓ کو وہ گروہ قتل کرے گا جو دم عثمان کے مطالبے کے لیے نکلے گا اور اس میں کوئی بری بات نہیں۔

یہ بھی لغویات تھی کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ عمار کو وہ گروہ قتل کرے گا جو انہیں دوزخ کی طرف بلا رہا ہوگا اور عمارؓ اسے جنت کی طرف بلا رہے ہونگے۔

لیکن معاویہ کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان کے پیروکاروں کو کسی دلیل اور حجت سے قائل نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارا مقصد معاویہ کی حکومت کی تاریخ

بیان کرنا نہیں، صرف قارئین کو اس زمانے کے حالات کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اگر کوئی اس حکومت کے مزید حالات کا مطالعہ کرنا چاہے تو یہی کتاب " النصائح الکافیہ لمن یتولی معاویہ" دیکھے اور اول سے آخر تک پڑھے اور پھر انصاف کرے۔

یزید کی خلافت

جب یزید مسند خلافت پر بیٹھا تو ولید بن عتبہ بن ابی سفیان امیر مدینہ تھا۔ عمرو بن سعید بن عاص امیر مکہ تھا۔ نعمان بن بشیر امیر کوفہ اور عبید اللہ بن زیاد امیر بصرہ تھا۔

یزید نے سب سے پہلے یہ طے کیا کہ حسینؑ بن علیؑ، عبداللہ بن زبیر، اور عبداللہ بن عمر سے جنھوں نے اس کی ولی عہدی تسلیم نہیں کی تھی، بیعت لی جائے چنانچہ مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ کو لکھا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ان تینوں سے بیعت لی جائے۔ ولید نے اس مقصد کے لیے مروان بن حکم کو بلایا اور اس سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ ولید اور مروان کے درمیان اگرچہ ناچاقی تھی لیکن اس موقع پر ولید نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا۔ مروان نے کہا ابھی ان تینوں کو بلاؤ اگر بیعت منظور کریں تو بہتر ورنہ اس سے پیشتر کہ انھیں معاویہ کی موت کی اطلاع ملے، قتل کردو ورنہ اگر انہیں یہ خبر مل گئی تو ہر ایک خلافت کا دعویدار بن جائے گا۔ ہاں عبداللہ بن عمر کی طرف سے زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ لڑنے بھڑنے والے آدمی نہیں۔

ولید نے عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیر کے پاس بھیجا۔ وہ دونوں مسجد میں تھے۔ عبداللہ نے ولید کا پیغام پہنچایا۔ انھوں نے

کہا۔ تم چلو، ہم ابھی آتے ہیں۔ امامؑ نے عبداللہ بن زبیر سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے اور یہ بے وقت کا بلاوا یزید کی بیعت کے لیے ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے جوانان بنی ہاشم (اپنے آدمیوں) کو بلایا اور کہا کہ مسلح ہو جاؤ۔ مجھے اس وقت ولید نے بلایا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے گا جو میں نہیں کر سکوں گا۔ اس صورت میں مجھے اس پر بھروسہ نہیں، تم میرے ساتھ آؤ۔ جب میں دروازے میں داخل ہو جاؤں تو تم باہر ٹھہرے رہنا اور جب میں اندر سے پکاروں تو فوراً اندر چلے آنا تاکہ وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

امامؑ ولید کے پاس گئے۔ مروان بھی وہاں موجود تھا۔ ولید نے معاویہ کی موت کی اطلاع دی اور یزید کی بیعت کا حکم سنایا۔ امامؑ نے کہا کہ یہ تو ظاہر ہے کہ خفیہ بیعت سے تو تم مطمئن نہیں ہو گے۔ یہی چاہو گے کہ میں مجمع عام میں بیعت کروں۔ ولید نے کہا۔ ہاں یہ تو صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا تو پھر کل تک ٹھہرو، میں فیصلہ کروں۔ ولید نے کہا، اچھا آج تشریف لے جائیے، کل مجمع کے ساتھ آئیے اور بیعت کر لیجیے۔ مروان بولا: اگر آج تم نے حسینؑ ابن علیؑ کو بیعت کیے بغیر جانے دیا تو پھر یہ قابو میں نہیں آئیں گے۔ بڑی خونریزی ہو گی، انہیں بیعت کیے بغیر نہ جانے دو اور اگر نہ مانیں تو گردن مار دو۔

مروان کی بات سنتے ہی امامؑ اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا: اے دعی ابن دعی تو مجھے مارے گا یا کہ ولید؟ قسم خدا کی تو جھوٹا ہے۔ یہ کہکر امامؑ نے اپنی راہ لی اور اپنے آدمیوں کو ساتھ لیکر گھر چلے آئے۔ مروان نے ولید سے کہا، تم نے میری بات نہ سنی۔ بخدا! اب یہ کبھی تمہارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ ولید نے کہا، یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے میرا دین برباد کرنے والی تجویز پیش کی تھی۔ بخدا اگر ساری دنیا کا مال و متاع بھی میرے

قدموں میں ڈال دیا جائے تو بھی میں حسینؑ بن علیؑ کو قتل کرنا پسند نہیں کروں گا۔ اگر حسینؑ بن علیؑ یزید کی بیعت سے انکار کریں تو میں انہیں مار ڈالوں؟ سبحان اللہ! میرا تو خیال ہے کہ جس کی گردن پر حسینؑ بن علیؑ کا خون ہوگا وہ روزِ قیامت بڑا ہی بدنصیب ہوگا۔

مروان کو ولید کی گفتگو پسند نہیں آئی۔ اس نے کہا: اگر تمھارا ایسا خیال ہے تو پھر ٹھیک ہے۔

اگلے روز ۲۸ ر رجب ۶۰ھ کو ہفتہ کا دن تھا، ولید نے پھر امامؑ کو بیعت کے لیے بلایا۔ انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آج اور ٹھہرو، کل فیصلہ کروں گا اور اسی رات ۲۹ ر رجب ۶۰ھ کو اپنی ازواج، بھائیوں، بھتیجوں اور بیشتر افراد خانوادہ کے ساتھ مدینہ سے چلے گئے اور حضرت موسیٰؑ بن عمران کے الفاظ میں "قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ" کہتے ہوئے مکہ کا راستہ لیا۔ جب امامؑ سے کہا گیا کہ کاش آپ بھی ابنِ زبیر کی طرح کسی غیر معروف راستے سے جاتے تاکہ کسی کو آپ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ مل سکتا تو آپ نے فرمایا: بخدا میں غیر معروف راستے سے نہیں جاؤں گا، جو اللہ کو منظور ہے وہی ہوگا۔ غرض ۳ ر شعبان جمعہ کی شب آپ مکہ پہنچے اور حضرت موسیٰؑ کے قصے کو یاد کر کے کہا:

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

مکہ میں حجاج امامؑ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ابنِ زبیر بھی ہر روز حاضرِ خدمت ہوتے۔ انہیں معلوم تھا کہ فرزندِ پیغمبر کے ہوتے ہوئے کوئی ان سے بیعت نہیں کریگا۔ امامؑ کا مرتبہ ہر لحاظ سے ان سے بلند ہے۔

معاویہ کے مرنے کی خبر سارے عراق میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ حسینؑ ابن علیؑ اور عبداللہ بن زبیر، یزید کی بیعت سے انکار کر کے مکہ چلے گئے ہیں۔

شیعہ بزرگان سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر جمع ہوتے۔ معاویہ کی موت پر خدا کا شکر ادا کیا۔ سلیمان بن صرد نے کہا کہ معاویہ تو دنیا سے جا چکے اور حسینؑ ابن علیؑ بھی یزید کی بیعت سے انکار کر کے مکہ روانہ ہو گئے۔ اب تم لوگ جوان کے اور امامؑ کے والد کے شیعہ ہو، اگر امامؑ کی مدد کرنے اور ان کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو اور ان کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو تو انہیں خط کے ذریعے اطلاع دیدو۔ اور اگر ڈرتے ہو کہ ان کی مدد نہیں کر سکو گے تو انہیں دھوکا مت دو اور بلا وجہ ان کی جاں نثاری کا دم مت بھرو۔ سلیمان بن صرد کو معلوم تھا کہ جب تک قربانی اور جاں نثاری کا موقع نہیں آتا، لوگ حق و باطل کی تمیز میں غلطی نہیں کرتے اور خوب سمجھتے ہیں کہ راستگو کون ہے اور دروغ گو کون! رہبر کون ہے اور رہزن کون! لیکن صرف اسی وقت تک جب تک انکے اپنے نفع و نقصان کا معاملہ بیچ میں نہ آتے اور اہل حق کی اعانت اور اہل باطل سے جنگ میں خود انہیں نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہو، لیکن جب آزمائش کی گھڑی آتی ہے اور حق و باطل سامنے آکھڑے ہوتے ہیں تو زیادہ تر لوگ باطل کا ساتھ دینے لگتے ہیں اور چونکہ حق کی اعانت بغیر قربانی اور فداکاری کے نہیں ہو سکتی اس لیے لوگوں کی رائے بدل جاتی ہے اور وہ حق کو چھوڑ کر باطل کے طرفدار بن جاتے ہیں۔ سلیمان بن صرد خوب جانتے تھے کہ اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا کہ آج لوگوں کے احساسات کیا ہیں۔ کل جب حسینؑ ابن علیؑ بنی امیہ سے مقابلے کے لیے کھڑے ہوں گے اور بنی امیہ کی پوری طاقت ان کے قتل کے

درپے ہوگی، اس وقت ان کی اعانت دشوار ہو جائے گی تو یہی لوگ ان سے منہ پھیر لیں گے۔ اپنے خطوط فراموش کردیں گے، اپنے گھروں کے دروازے بند کرینگے بلکہ ان کے مخالفوں اور دشمنوں کی صف میں شامل ہو جائیں گے، ان کے قتل کو واجب شرعی سمجھتے ہوئے خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کی خاطر انھیں موت کے گھاٹ اتارتے سے بھی نہیں ہچکچائیں گے اور ان کے قتل کے بعد دیندار لوگ رو بہ قبلہ ہو کر نعرہ لگائیں گے:

"اَللّٰهُ اَكْبَر، اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

جیسے کہ انہوں نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ سلیمان نے شیعہ بزرگان پر اتمام حجت کیا اور کہا کہ انجام پر اچھی طرح نظر کرلو اور جو حالات پیش آئیں گے انہیں سوچ لو کہ واقعی پورے اطمینانِ قلب کے بعد امامؑ کو اپنی مدد کا یقین دلا کر عراق بلا رہے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آج تو جوش میں آکر خط لکھ دو، عہد و پیمان کرو، قسمیں کھاؤ اور کل جب فرزندِ رسولؐ حرمِ خدا سے سرزمین عراق پہنچیں اور دشمن انہیں گھیرے میں لیکر بیعت کے لیے دباؤ ڈالے اور موت کی دھمکی دے تو تم ان کی نصرت سے ہاتھ اٹھالو اور اپنے عہد و پیمان کو بھول جاؤ۔

شیعہ اکابرین نے بیک آواز کہا کہ: ہم جہاد اور جاں نثاری کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ ہم اپنے امام کے لیے جان دیدیں گے۔

سلیمان نے کہا: اگر یہ بات ہے تو فوراً امامؑ کی خدمت میں خط لکھو، چنانچہ اس مضمون کا خط لکھا گیا:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"یہ خط ہے سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد بجلی، حبیب بن مظاہر اور دوسرے مسلمانانِ باایمان، ساکنانِ کوفہ، شیعیانِ حسینؑ بن علیؑ کی طرف سے حسینؑ بن علیؑ کی خدمت میں۔ آپ پر سلام ــــ ہم خدائے وحدہٗ لاشریک کی حمد میں آپ کے ہم زبان ہیں۔ حمد اس خدا کی جس نے آپ کے دشمن کو فنا کر دیا۔ وہی جس نے اس امت پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور زبردستی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ اس نے بیت المال کو غصب کیا اور مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر ان پر حکومت کی اور پھر نیک لوگوں کو قتل کیا اور بدکاروں کو چھوڑ دیا۔ خدا کا مال ظالموں اور دولتمندوں کے حوالے کر دیا۔ خدا اسے اپنی رحمت سے دور رکھے، جیسا کہ قومِ ثمود کو رکھا۔

اب ہم عراقیوں کا کوئی پیشوا اور امام نہیں ہے لہٰذا آپ ہماری طرف روانہ ہو جائیے۔ شاید خدائے ذوالجلال آپ کے وسیلے سے ہمیں حق پر اکٹھا کر دے۔ ہم جمعہ و جماعت میں نعمان بن بشیر سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ وہ دارالامارہ میں تنہا ہے۔ اگر ہمیں اطلاع ملے کہ آپ ہماری طرف آنے کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم اسے نکال باہر کریں اور انشاءاللہ شام تک اسکا پیچھا کریں۔"

یہ خط انھوں نے عبداللہ بن سبیع ہمدانی اور عبداللہ بن وال کو دیا اور ان سے کہا کہ فوراً مکہ روانہ ہو جائیں۔ وہ دونوں ۱۰ رمضان ۶۰ھ کو مکہ میں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خط انہیں پیش کر دیا۔

امامؑ کے نام اہلِ کوفہ کے خطوط

دو روز بعد کوفہ سے تقریباً ڈیڑھ سو اور خطوط بھیجے گئے۔ ہر خط ایک یا دو چار آدمیوں کی طرف سے تھا۔ ان میں سے اکثر خط قیس بن مسہر صیداوی، عبدالرحمٰن بن شداد ارحبی اور عمارہ بن عبداللہ سلولی مکہ لیکر آئے اور دو روز بعد شیعیان کوفہ نے ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کے ہاتھ اس مضمون کا خط بھیجا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

یہ خط حسینؑ بن علیؑ کے نام ہے۔ شیعیانِ باایمان کی طرف سے، جلدی کیجیے! لوگ آپ کے انتظار میں ہیں۔ آپ کے سوا کسی کی جانب نگاہ نہیں ہے۔ جلدی کیجیے! بہت بہت جلدی! والسلام۔

اس کے بعد شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن حارث بن رویم، عروہ بن قیس، عمرو بن حجاج زبیدی اور محمد بن عمرو تیمی نے اس مضمون کا خط لکھا:

"باغ و بیابان سرسبز و شاداب ہیں۔ میوے پک گئے ہیں۔ جب چاہیں روانہ ہو جائیں۔ آپ کے عراقی سپاہی آپ کے خیر مقدم کے لیے تیار ہیں۔ والسلام"

اہلِ کوفہ کے خطوط کا امامؑ کے پاس ڈھیر لگ گیا اور عراقی ایلچی مکہ میں جمع ہو گئے تو امام نے کوفیوں کے خطوں کے جواب میں لکھا:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

از حسینؑ بن علیؑ، بمومنان و مسلمانانِ عراق۔ تمہارے تازہ ترین ایلچی ہانی اور سعید تمہارے خط لائے۔ میں نے تمہاری تحریریں پڑھیں اور ان پر غور کیا۔ تم نے لکھا ہے کہ ہمارا کوئی امامؑ (رہبر) نہیں اس لیے آپ ہماری طرف روانہ

ہو جائیے شاید آپ کے وسیلے سے خدائے ذوالجلال ہمیں حق اور ہدایت پر جمع کر دے۔ میں اپنے عم زاد بھائی اور معتمد مسلم بن عقیل کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ اگر انہوں نے جواباً مجھے لکھا کہ تمہارے اشراف اور بزرگ بھی وہی کہتے ہیں جو تمہارے ایلچی کہتے ہیں اور جو تم نے اپنے خطوں میں لکھا ہے تو میں جلد ہی روانہ ہو کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ امام تو وہی ہے جو قرآن حکیم کے مطابق حکم کرے، میزانِ عدل قائم کرے، دینِ حق کا اجرا کرے اور اپنے آپ کو راہِ خدا میں وقف کر دے۔ والسلام۔

امامؑ نے یہ خط ہانی اور سعید کے ہاتھ بھیج دیا۔ اس کے بعد مسلم بن عقیل سے فرمایا کہ قیس بن مسہر صیداوی، عمارہ بن عبداللہ سلولی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ ارحبی کے ہمراہ عراق روانہ ہو جائیں۔ آپ نے انھیں نصیحت کی کہ تقویٰ کا راستہ اختیار کریں، اپنا راز کسی پر ظاہر نہ کریں اور سب کے ساتھ خلق اور نرمی کا برتاؤ کریں۔ اگر دیکھیں کہ لوگ تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں تو فوراً اطلاع دیں۔

مسلم بن عقیل کی کوفہ روانگی

جناب مسلم براہِ مدینہ کوفہ گئے اور مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے یہاں قیام کیا۔ شیعوں کی ان کے پاس آمد و رفت شروع ہو گئی۔ یہ لوگ اس خیال میں تھے کہ کام بآسانی ہو جائے گا۔ حسینؑ بن علیؑ یزید کے مقابلے میں کامیاب ہو جائیں گے اور عدل و تقویٰ، ظلم و گناہ کی جگہ لے لیں گے۔ دراصل یہ لوگ معاویہ کی بیالیس سالہ حکومت کا سبق بھول چکے تھے۔ جب امامؑ کا خط انھیں پڑھ کر سنایا جاتا تو فرطِ شوق سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور وہ خلوص دل سے امامؑ

کے نائبِ خاص کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ شیخ مفید نے لکھا ہے کہ اس طرح ستّر ہزار اور بقول طبری بارہ ہزار لوگوں نے ان سے بیعت کی۔

دوسری طرف یزید کو بھی خبر مل گئی کہ مسلم کوفہ پہنچ گئے ہیں اور وہاں شیعوں نے ان سے بیعت کر لی ہے اور نعمان بن بشیر نے ان کو روکنے میں کمزوری دکھائی ہے۔ یزید نے فوراً عبیداللہ بن زیاد کو جو بصرہ کا حاکم تھا، عراقین یعنی کوفہ اور بصرہ دونوں جگہ کی حکومت سونپ دی اور اسے لکھا کہ فوراً کوفہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو گرفتار یا قتل کر دو یا کم از کم وہاں سے نکال دو۔ عبیداللہ حکم ملتے ہی کوفہ روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر پہلے ہی دن تقریر کی اور کہا: یوں تو یزید بہت مہربان ہے لیکن مخالفت بالکل برداشت نہیں کرتا۔ اس کے بعد قبائل کے سرداروں اور برادریوں کے چودھریوں کو بلایا اور ان کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ طرفدارانِ حق کی تعداد کم ہونے اور پیروانِ باطل کی تعداد بڑھنے لگی۔

اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ:

"کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ یہ کہہ کر کہ ہم ایمان لے آئے آزمائش سے بچ جائیں گے۔ ہم نے ان سے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟" (سورۂ عنکبوت۔ آیات ۱-۳)

سچے وہ ہیں جو آزمائش کے وقت اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور کسی خوف یا لالچ کی وجہ سے راہِ حق سے نہیں پھرتے اور جھوٹے وہ ہیں جو آزمائش سے پہلے تو خوب بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے ہیں اور اپنے آپ کو حق کا طرفدار اور باطل کا دشمن ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو ہم حق کا ساتھ دیں گے اور حق کے دفاع کے لیے جان کی بازی لگانے سے

بھی دریغ نہیں کریں گے اور باطل کے وعدے انہیں ان کے راستے سے بھٹکا نہیں سکیں گے اور دنیا کا مسحور کن جلوہ ان کے دل کو بھا نہیں سکے گا لیکن جیسے ہی حالات بدلتے ہیں اور ایک طرف ثابت قدمی اور استقامت کے راستے میں مشکلات پیش آتی ہیں اور دوسری جانب باطل کا چہرہ اپنے وعدوں اور امیدوں کے ساتھ آتا ہے۔ اِدھر جہاد، قربانی اور جانبازی ہوتی ہے اور اُدھر نعمت، قدرت، زندگی، لذت اور شہوت ہوتی ہے تو ان حالات میں ان کی ذہنی کیفیت بدل جاتی ہے۔ دلیری کی جگہ بزدلی اور کم ہمتی، ایمان کی جگہ شک اور بے یقینی اور اخلاص کی جگہ شرک اور نفاق کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ جھوٹے صرف وہی نہیں جو امتحان سے پہلے بھی حق کی طرفداری اور باطل کی مخالفت کا ارادہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی جھوٹے ہیں جن کی حالت خدائی امتحان کے وقت بدل جاتی ہے اور کل جسے حق سمجھتے تھے آج اسے باطل کہنے لگتے ہیں۔

اہلِ کوفہ جو مرگِ معاویہ کی خبر ملتے ہی سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر جمع ہوئے تھے اور جنہوں نے تقریریں کی تھیں اور حالاتِ حاضرہ پر غور کرنے کے بعد خط لکھا تھا اور اسی طرح وہ لوگ جو مسلم کے کوفہ پہنچنے پر ان کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے اور جنہوں نے ان کے ہاتھ پر نائبِ امام کی حیثیت سے بیعت کی تھی، وہ سب امامؑ کو دھوکا دینا نہیں چاہتے تھے اور نہ امامؑ کی شہادت اور ان کے خاندان کی گرفتاری کے روادار تھے۔ ان کی نیت نیک تھی۔ وہ یزید جیسے شخص کی خلافت کو اور وہ بھی رسولِ خداؐ کی وفات سے صرف پچاس سال بعد، شرمناک سمجھتے تھے۔ وہ کسی دوسرے مسلمان کو فرزندِ رسولِ خداؐ حسینؑ بن علیؑ پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نے ہر موقع پر امام حسینؑ کی

تائید کی ہے، آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور اس سلسلے میں ہر مشکل اور ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کریں گے لیکن یہی لوگ جھوٹے اور وعدہ خلاف نکلے۔ اپنے پہلے خیالات بھول گئے۔ جب تک نعمان بن بشیر انصاری نرمی اور تحمل سے شہر کا انتظام چلا رہا تھا، شیعوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ وہ ہر جگہ اور ہر مجلس میں امام حسینؑ کی اعانت کا دم بھرتے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ہم شام تک نعمان بن بشیر کا تعاقب کریں گے لیکن چونکہ انہیں عبیداللہ بن زیاد اور اس سے پہلے اس کے باپ کی حکومت کی سختی کا تجربہ تھا اس لیے جیسے ہی عبیداللہ نے کوفہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی ان کا رویہ بدل گیا۔ خیالات تبدیل ہو گئے۔ پہلے ان کی نظر میں نیکی کا معیار کچھ اور تھا، اب کچھ اور ہو گیا ہے۔ پہلے جہاد کا دم بھرتے تھے مگر اب "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" کا دم بھرنے لگے ہیں۔ جوں جوں کوفہ کے حالات ابن زیاد کے قابو میں آتے گئے، مسلم اور ان کے ساتھیوں کے لیے خطرہ بڑھتا چلا گیا اور کوفہ میں ان کی کامیابی کا امکان کم ہوتا گیا، اتنا ہی لوگوں کی ذہنی اور دینی کیفیت اس کے برعکس ہوتی گئی جس کا اظہار انہوں نے پیشتر کیا تھا یہاں تک کہ شہر کی ہوا بالکل بدل گئی۔ جو لوگ واقعی امام حسینؑ کو برسر اقتدار لانا اور بنی امیہ کو حکومت سے ہٹانا چاہتے تھے انہوں نے ایسی آنکھیں پھیریں کہ مسلم بن عقیل باوجودیکہ ان کا قیام مخفی تھا اور وہ بہت کم لوگوں میں آمد و رفت رکھتے تھے، شہر کی فضاء کو متغیر دیکھ کر مجبور ہو گئے کہ مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک بہت با اثر اور طاقتور شخصیت ہانی بن عروہ مرادی کے یہاں رہائش اختیار کر لی۔ شیعہ بہت احتیاط سے اور چپکے چپکے ان کے پاس آتے تھے۔ اس وقت کوفہ کے حالات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ

سب خطوط جھوٹ کا پلندہ تھے۔ اب ان وعدوں پر جو لوگوں نے امام حسینؑ سے کیے تھے، بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ابن زیاد نے اپنے غلام معقل کے ذریعے مسلم بن عقیل کی رہائش گاہ کا پتا چلا لیا۔ ہوا یوں کہ اس نے معقل کو تین ہزار درہم دیے اور اس سے کہا کہ تو کچھ دن مسلم کے دوستوں سے میل جول بڑھا اور اپنے آپ کو بھی ان ہی میں سے ایک ظاہر کر۔ انہیں یہ رقم دیکر ظاہر کر کہ میں بھی تمہاری کامیابی کا خواہاں ہوں۔ تم یہ رقم لڑائی کی تیاری اور سامانِ جنگ کی فراہمی پر خرچ کرو۔ اس طرح ان کا اعتماد حاصل کر کے یہ پتا لگاؤ کہ مسلم بن عقیل کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، پھر ان سے مل آؤ۔ معقل نے ابنِ زیاد کی ہدایت پر عمل کیا اور سب سے پہلے مسلم بن عوسجہ سے راہ و رسم پیدا کی جو بزرگانِ شیعہ میں سے ایک تھے اور روزِ عاشور شہید ہوئے۔ معقل نے سن رکھا تھا کہ مسلم بن عوسجہ بھی امام حسینؑ کے لیے بیعت لے رہے ہیں۔ معقل جو اپنے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے ہر جھوٹ بولنے اور ہر بددیانتی سے کام لینے کے لیے تیار تھا، اس نے مسلم بن عوسجہ سے کہا کہ میں شام کا رہنے والا ہوں اور خدا نے مجھے اہلبیتؑ اور ان کے دوستوں کی محبت سے نوازا ہے۔ یہ کہہ کر مکر و فریب کے ساتھ رونے لگا۔ مگرمچھ کے آنسو بہانے کے بعد بولا: میرے پاس تین ہزار درہم ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ان صاحب کو پیش کروں جن کے بارے میں سنا ہے کہ حجاز سے آئے ہوئے ہیں اور کوفہ میں فرزندِ پیغمبرؐ کے لیے بیعت لے رہے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ اس بہانے ان کی زیارت بھی کر لیتا مگر افسوس کہ میری ان تک رسائی نہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ملا جو میری رہنمائی کرے اور میں یہ سعادت حاصل کر لوں۔ میں نے سب ہی سے پوچھا اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی اس پاک خاندان سے واقفیت ہے اس لیے

اب آپ سے التماس ہے کہ آپ یہ رقم لے لیں اور مجھے مسلم بن عقیل کے پاس لے چلیں۔ میں آپ کا مسلمان بھائی ہوں۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ آپ چاہیں تو میں مسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔

مسلم بن عوسجہ نے کہا کہ مجھے تم سے مل کر اور یہ معلوم کر کے کہ شاید تم اہل بیتؑ کے کچھ کام آ سکو، بڑی خوشی ہوئی مگر مجھے یہ پریشانی ہے کہ منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے ہی لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میرا بھی اس سے تعلق ہے۔ مجھے اس ظالم ابن زیاد کی طرف سے اندیشہ ہے۔ معقل نے کہا خدا بہتری کرے گا۔ آپ تو مجھ سے بیعت لے لیں۔ مسلم نے اس سے بیعت لی اور ساتھ ہی پختہ وعدہ بھی لے لیا کہ وہ خیر خواہ رہے گا اور اس راز کو ظاہر نہیں کرے گا۔ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ تمام عہد و پیمان کر لیے اور قسمیں اٹھائیں جو مسلم بن عوسجہ چاہتے تھے بلکہ شاید ان کی خواہش سے بھی بڑھ چڑھ کر باتیں بنائیں۔ غرضیکہ مسلم کو بالکل مطمئن کر دیا۔ معقل کئی دن تک ان کے مکان پر آتا جاتا رہا اور بالآخر مسلم بن عقیل کی خدمت میں باریاب ہو گیا اور وہاں دوبارہ بیعت کی۔ تین ہزار درہم مسلم بن عقیل کی اجازت سے ابو ثمامہ صاعدی ہمدانی کو پیش کر دیے۔ ان کا شمار بھی بزرگانِ شیعہ میں ہوتا ہے اور یہ بھی کربلا میں شہید ہوئے۔ اس وقت ہتھیار، خوراک اور رسد کی فراہمی ان کے ذمے تھی۔ معقل سب سے پہلے حضرت مسلم کی خدمت میں پہنچتا اور سب کے بعد رخصت ہوتا۔ اس طرح اس نے سب معاملات سے واقفیت حاصل کر لی اور اس کی باقاعدہ رپورٹ ابن زیاد کو دیتا رہا۔ ابن زیاد کو معلوم تھا کہ حضرت مسلم پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہانی کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔ ہانی، ابن زیاد کے خوف سے بیماری کے بہانے خانہ نشین ہو گئے تھے اور دارالامارہ جانا چھوڑ

دیا تھا۔ آخر ابن زیاد کے حکم سے محمد بن اشعث، اسماء بن خارجہ اور عمرو بن حجاج زبیدی ان کے پاس گئے اور ازراہِ مصلحت ان کو سوار کرا کے اپنے ساتھ ابنِ زیاد کے پاس لے گئے۔ ہانی کی گرفتاری سے حالات کا رخ پوری طرح ابن زیاد کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ ہر چند ہانی نے اپنے گھر میں مسلم بن عقیل کی موجودگی سے لاعلمی ظاہر کی لیکن معقل نے مجلس میں پہنچ کر پردہ فاش کر دیا۔ ناچار ہانی کو اصل واقعہ کا اعتراف کرنا پڑا مگر انہوں نے کہا کہ میں مسلم کو اپنے مکان پر نہیں لایا بلکہ وہ خود میرے پاس آئے اور درخواست کی کہ میں انہیں اپنے یہاں ٹھہرا لوں۔ مجھے انکار کرتے ہوئے شرم آئی اس لیے میں نے ٹھہرا لیا۔ باقی سب اطلاع درست ہے۔ اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت نہ ہوگی اور میں مسلم بن عقیل سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا یا کہیے تو میں ابھی جا کر ان سے معذرت کر لوں اور کہہ دوں کہ ان کا جہاں دل چاہے چلے جائیں۔

ابنِ زیاد نے دونوں باتیں نہیں مانیں اور کہا کہ انہیں فوراً ہمارے حوالے کر دو۔ جب وہ کسی طرح اپنے مہمان کو اس کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو ابن زیاد نے اس لکڑی سے جو اس کے ہاتھ میں تھی، ہانی کا منہ، ناک اور سر توڑ دیا اور انہیں قید کر دیا۔ اس کے بعد مسجد میں منبر پر جا کر مختصر سی تقریر کی اور لوگوں کو خوب ڈرایا دھمکایا۔ ابھی منبر پر ہی تھا کہ مسجد میں تماشائی گھس آئے۔ لوگوں نے کہا کہ مسلم بن عقیل آ گئے۔ عبید اللہ نے جلدی سے اپنے محل میں جا کر دروازے بند کر دیے۔ حیرت ہے کہ بارہ یا سترہ ہزار لوگوں نے مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کی تھی لیکن جب انہیں ہانی کے واقعہ کی اطلاع ملی اور انہوں نے اپنے آدمیوں کو بلایا اور انہیں لیکر باہر نکلے تو چار ہزار سے زیادہ جمعیت فراہم نہ ہو سکی۔ اس سے بھی زیادہ

حیرت اس پر ہے کہ اس وقت تو چار ہزار مسلح آدمی بھی مسلم کے ساتھ تھے، ابن زیاد نے اپنے محل کے دروازے بند کر لیے تھے اور اس کے ساتھ پچاس سے زیادہ آدمی نہیں تھے تیس پاسبان اور بیس مقربین اور خود اس کے اہل خانہ۔ لوگوں نے اس کے محل کو گھیر لیا تھا۔ اسے اور اس کے باپ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اس وقت فضا بظاہر مسلم بن عقیل کے حق میں تھی لیکن شام تک اس قدر ان کے خلاف ہو گئی کہ ۹ ذی الحجہ کی شام کو مغرب کی نماز میں ان کے ساتھ صرف تیس آدمی تھے اور جب وہ مسجد سے باہر نکلے تو فقط دو آدمی ان کے ساتھ تھے اور جب وہ مسجد کے باہر پہنچے تو کوئی ایک آدمی بھی انکے ساتھ نہیں تھا۔

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۳)

دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ کوفیوں کی جاں نثاری کے دعوؤں کی قلعی اس وقت کھل گئی جب چار ہزار آدمی ابن زیاد کو جس کے ساتھ پچاس سے زیادہ آدمی نہیں تھے قصر سے باہر نہ نکال سکے اور ابن زیاد کے آدمیوں کی محض گیدڑ بھبکی سنکر کہ شام کا لشکر آیا چاہتا ہے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مسلم بن عقیل کی شہادت

کوفہ کی صورتِ حال ایسی نازک ہو گئی تھی کہ مخلص شیعہ بزرگوں جیسے سلیمان بن صرد خزاعی، مسیب بن نجبہ اور رفاعہ بن شداد کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ طبری اور شیخ مفید دونوں نے تقریباً ایک ہی الفاظ میں لکھا ہے کہ جب مسلم بن عقیل مسجد سے باہر نکلے تو وہ بالکل تنہا تھے اور کوئی اتنا بھی نہیں تھا کہ انہیں گھر کا راستہ ہی

بتلاتا یا اگر دشمن سے سامنا ہو جائے تو کچھ مدد کرتا۔ وہ کوفہ کی گلیوں میں سرگرداں پھر رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کدھر جائیں۔

یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا غیر مناسب نہ ہوگا۔ صدیوں سے اہل کوفہ کی بے وفائی کی وجہ سے ان پر نکتہ چینی کی جا رہی ہے۔ جہاں لوگ امام حسینؑ کے یارانِ باوفا اور اصحاب بے ریا پر درود و سلام بھیجتے ہیں وہیں ان لوگوں پر لعنت اور نفرین کرتے ہیں جنہوں نے نصرت وحمایت کے سارے دعووں سے روگردانی کر کے آپ کے خلاف تلوار اٹھائی اور جب تک جان ہی نہ لے لی باز نہ آئے مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اہل کوفہ نے کوئی ایسی انہونی بات نہیں کی جس پر حیرت کا اظہار کیا جائے۔ ان کا رویہ بالکل قاعدے کے مطابق تھا۔ اس وقت بھی جب انہوں نے خطوط لکھے اور اس وقت بھی جب وہ شمشیر برہنہ امامؑ کے مقابلے پر آئے۔ جب امن و امان تھا اور کوفہ کی حکومت ایک نرم رو حاکم یعنی نعمان بن بشیر کے ہاتھ میں تھی وہ اس اندرونی بصیرت کی بنا پر جو خدائے متعال نے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کی ہے، حق و باطل میں خوب تمیز کرتے تھے اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ امامت اور رہبریٔ خلق کا صحیح مستحق کون ہے۔ ان کا یہ فعل بالکل معمول کے مطابق اور قاعدے کی بات تھی کیونکہ ہر شخص صحیح راستے اور غلط راستے کو پہچانتا ہے اور ان کے تعین میں اس وقت تک غلطی نہیں کرتا جب تک کسی خاص وجہ سے وہ فطری راستے سے ہٹ نہ جائے اور خوف، لالچ اور نفع و نقصان کا خیال اسے گمراہ نہ کر دے۔ اللہ فرماتا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝
وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (سورۂ بلد۔ آیات ۸-۱۰)

لیکن جب ان ہی حق و باطل شناس لوگوں کو امتحان کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا، سود و زیاں کا سوال پیدا ہوا اور مصلحتِ وقت اور دین کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ تب انہوں نے وہی کچھ کیا جو اس قسم کے حالات میں اکثر لوگ کرتے ہیں یعنی حق اور اہلِ حق سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بجائے جہادِ جاں نثاری اور اصلاح کے، حزم و احتیاط اور دور اندیشی کی باتیں کرنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اہلِ کوفہ نے ادائے فرض کے لیے اپنی جان کی بازی نہیں لگائی۔

جنہیں اس بات پر حیرت ہو انہیں چاہیے کہ وہ یہ سوچیں کہ اگر وہ خود ان حالات میں ہوتے تو کیا کرتے؟ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کریں کہ کیا ان کا رویہ اہلِ کوفہ سے مختلف ہوتا؟ حیرت تو ان لوگوں پر ہے جنہوں نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور آخر دم تک حق پر ڈٹے رہے۔ یہاں تک کہ اسی راہ میں جان دیدی۔ جب ان کے جسم کے ٹکڑے کٹ کٹ کر زمین پر گر رہے تھے، وہ یہی سوچ رہے تھے کہ جاں نثاری اور حق پرستی کا حق ادا ہوا کہ نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ روزِ قیامت خدا اور رسولؐ کے سامنے شرمندگی ہو۔ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

عمرو بن قرظہ انصاری کے والد قرظہ بن کعب خزرجی اصحابِ رسولؐ میں سے تھے۔ جنگِ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شرکت کی۔ خلافتِ عمرؓ میں کوفہ آئے۔ وہاں علمِ فقہ کی تعلیم دیتے تھے۔ عمرو خود امام حسینؑ کے جاں نثار ساتھیوں میں سے تھے۔ ابنِ طاؤس نے لہوف میں لکھا ہے کہ روزِ عاشورا جب تک یہ زخموں

سے چور ہو کر زمین پر گر نہیں گئے، امامؑ پر آنچ نہیں آنے دی۔ تیروں کو اپنے ہاتھوں پر لیتے رہے اور تلواروں کے وار اپنے جسم پر سہتے رہے۔ جب خاک پر گر کر تڑپنے لگے تو یکبارگی امامؑ کی طرف دیکھ کر کہا:

ع نازم انداز زندگئ خویش کہ کارے کردم

فرزند رسولؐ! کیا میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا؟

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

سالارِ شہیداں نے فرمایا: ہاں، اور تم مجھ سے پہلے جنت میں جا رہے ہو۔ رسولِ خداؐ کو میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ حسین (علیہ السلام) بھی آ رہے ہیں۔

ان جیالوں کی ثابت قدمی اور بلند حوصلگی کا کیا کہنا! واقعی حیرت ہوتی ہے۔ سلام ہو ان کی پاک ارواح پر۔ زندگی نے کتنے ہی رخ بدلے اور حوادث کے کتنے ہی تیر برسے لیکن ان کی وضع داری میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔

ع پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کہیں مردوں کا منہ

کتنے ہی لوگ ہیں جنہوں نے ضحاک بن عبداللہ مشرقی ہمدانی کا قصہ پڑھا یا سنا ہو گا اور اسکی کم توفیقی، بے نصیبی اور عاقبت نا اندیشی پر تاسف کیا ہو گا، انہیں تعجب ہوا ہو گا کہ اس شخص نے عین معرکۂ کارزار میں رخصت کی اجازت طلب کی اور اپنے امامؑ کو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر چلا گیا لیکن یہ کم ہی کسی نے سوچا ہو گا کہ جتنی ہمت اس نے دکھائی کیا ان حالات میں ہم دکھا سکتے تھے۔ اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ بالآخر چلا گیا۔ حیرت تو اس پر ہے کہ اس نے اتنی دیر تک ساتھ

کیسے دیا کہ جنگ میں بھی شرکت کی۔ طبری نے ضحاک کی کہانی خود ضحاک کی زبانی نقل کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اور مالک بن نضر ارحبی، امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کر کے ان کی مجلس میں بیٹھ گئے۔ امام حسینؑ نے ہمیں خوش آمدید کہا اور پوچھا کیسے آئے؟ ہم نے عرض کیا، سلام کرنے اور دعا لینے کے لیے۔ تجدید ملاقات کا بھی قصد تھا اور آپ کو یہ اطلاع دینی تھی کہ اہلِ کوفہ آپ سے جنگ پر آمادہ ہیں۔ امامؑ نے یہ سن کر کہا "حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" پھر جب ہم رخصت ہونے لگے اور سلام دعا کے بعد خدا حافظ کہا تو امامؑ نے فرمایا: کوئی حرج نہ ہو تو میرے ساتھ رہ کر میری مدد کرو۔ مالک بن نضر نے کہا کہ میں مقروض ہوں اور میرے ساتھ بیوی بچے بھی لگے ہوئے ہیں اس لیے مجبوری ہے۔ میں نے کہا میری بھی یہی مجبوریاں ہیں مگر بہر حال میں جاں نثاری پر آمادہ ہوں بشرطیکہ آپ یہ اجازت دیں کہ جب آپ اکیلے رہ جائیں اور میری مدد بیکار ہو جائے تو میں اپنا راستہ لوں۔ امامؑ نے یہ شرط منظور کر لی۔ میں ان کے ساتھ رہا۔ روزِ عاشورا جب آپ کے اصحاب شہید ہو گئے اور دشمن خود امامؑ اور جوانانِ اہل بیتؑ تک پہنچ گیا اور آپ کے اصحاب میں سوائے سوید بن عمرو بن ابی مطاع خثعمی اور بشر بن عمرو حضرمی کے کوئی نہ رہا تو میں نے عرض کیا کہ اے فرزندِ رسولؐ! آپ کو معلوم ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان یہی طے پایا تھا کہ جب تک آپ کے ساتھی زندہ رہیں گے میں آپ کا ساتھ دوں گا اور جب وہ مارے جا چکیں گے تو پھر میں آزاد ہوں گا جہاں چاہے جاؤں۔ فرمایا: یہ تو درست ہے مگر اس لشکر سے بچ کر کیسے جاؤ گے؟ اگر تمہیں موقع ملتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ضحاک کہتا ہے کہ اس وقت عمر بن سعد کے سوار ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ میں نے اپنے گھوڑے کو ایک خیمے میں باندھ دیا تھا اور پیدل جنگ کر رہا تھا۔

میں نے اس روز امامؑ کے دشمنوں میں سے دو کو قتل کیا اور ایک کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس روز امامؑ نے کئی بار مجھے شاباش دی اور کہا جزاک اللہ، دست و بازو سلامت! جب انہوں نے مجھے چلے جانے کی اجازت دیدی تو میں نے اپنا گھوڑا باہر نکالا اور اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ میں نے گھوڑے کو اتنے چابک لگائے کہ گھوڑا الف ہو گیا۔ پھر میں نے ایک دم اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی۔ دشمن کے سپاہیوں نے مجبوراً راستہ دیدیا اور میں ان کی صفوں کے بیچ سے نکل آیا۔ گیارہ آدمیوں نے میرا تعاقب کیا اور قریب تھا کہ میرے نزدیک پہنچ کر وہ مجھے گرفتار کر لیتے مگر کثیر بن عبد اللہ شعبی، ایوب بن مسرح خیوانی اور قیس بن عبد اللہ صاعدی نے مجھے پہچان لیا اور انکی سفارش سے میری جان بچی۔ ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

صحیح ہے کہ اس شخص کے حال پر افسوس ہوتا ہے کہ ایسی سعادت گنوائی، ایسا موقع ہاتھ سے جانے دیا اور ایسے امامؑ کو اکیلے چھوڑ کر چلا آیا حالانکہ وہ بھی حبیب ابنِ مظاہر اسدی اور بریر بن خضیر ہمدانی ہو سکتا تھا۔ بہر حال اس کا حال اہل کوفہ سے مختلف تھا، جاں نثاری کا عہد نہیں کیا تھا نہ مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور جب امامؑ کی خدمت میں پہنچا تو جو کچھ کہا اسے پورا کیا اور جا دبیجا جاں نثاری کا دم نہیں بھرا۔ اس نے خود بتلا دیا تھا کہ میں کہاں تک ساتھ دینے پر آمادہ ہوں، لیکن جن لوگوں نے مسلم سے بیعت کی تھی انہوں نے ۹ ذی الحجہ کی شب میں انہیں کوفہ کی گلیوں میں تنہا چھوڑ دیا۔ اگر ایک بڑھیا انہیں اپنے گھر نہ لے جاتی اور پانی نہ پلاتی تو کوئی اتنا بھی نہیں تھا کہ یہ خدمت انجام دے سکتا۔ اپنی زندگی کی آخری رات

مسلم نے اسی بڑھیا کے گھر بسر کی۔ اگلے روز ابن زیاد نے ان کی گرفتاری کے لیے قدم اٹھایا۔ اس کے فرستادوں نے گھر کا محاصرہ کر لیا تو ناچار مسلم باہر نکلے اور شہادت کے لیے تیار ہوگئے۔ جس وقت آپ کو گرفتار کیا گیا آپ نے محمد بن اشعث سے یہ خواہش کی کہ کسی کو امام حسینؑ کے پاس بھیج کر میری شہادت کی اطلاع دیدو۔ آپ نے کہا کہ میری طرف سے امام حسینؑ کو کہلوا دو کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! اپنے اہلبیتؑ کو لیکر واپس چلے جائیے اور اہلِ کوفہ کے دھوکے میں نہ رہیے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق آپ کے والد محترم کہا کرتے تھے کہ کاش میں مر جاؤں یا قتل ہو جاؤں تاکہ ان سے نجات ملے۔

اہلِ کوفہ نے آپ سے جھوٹ بولا اور مجھ سے بھی۔ اب جھوٹ کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ مسلم نے ابنِ زیاد کی مجلس میں عمر بن سعد سے دو خواہشیں کیں۔ ایک تو یہ کہ میری زرہ اور تلوار بیچ کر سات سو درہم جو میرے ذمے قرض ہے ادا کر دینا' دوسرے یہ کہ ابنِ زیاد سے میری لاش لیکر دفن کر دینا۔ اسی دن مسلم اور ہانی شہید کر دیے گئے اور ان دونوں کے سر کاٹ کر یزید کے پاس شام بھیج دیے گئے۔ ~

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

محمد بن حنفیہ

قبل ازیں ہم نے رجب ۶۰ھ کے وسط میں مرگِ معاویہ سے لیکر مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ مرادی کی شہادت تک کے واقعات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ عبیداللہ بن زیاد کو کسطرح عراق پر کامل تسلط حاصل ہو گیا تھا۔ ہم نے یہ بھی

بیان کیا ہے کہ جب امامؑ اپنے افراد خاندان کے ساتھ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے تو ان کے بھائی محمد بن حنفیہ مدینہ ہی میں رہ گئے۔ محمد بن حنفیہ کی والدہ کا تعلق قبیلہ بنی حنفیہ سے تھا۔ اسی وجہ سے انہیں محمد بن حنفیہ کہتے ہیں۔ وہ مرد بزرگ، دلیر اور باتقویٰ تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کا ایک فرقہ کیسانیہ انھیں اپنا امام مانتا ہے مگر وہ خود اپنے والد امیر المومنینؑ کے بعد اپنے بھائی حسنؑ کی، ان کے بعد دوسرے بھائی امام حسینؑ کی اور ان کے بعد اپنے بھتیجے امام علیؑ بن حسینؑ کی امامت کے قائل تھے۔ ان کا شمار اہل بیتؑ کے سربرآوردہ لوگوں میں ہے۔ انہوں نے امیر المومنینؑ کے ساتھ جنگوں میں مردانگی کے جوہر دکھائے تھے۔ معاویہ کے زمانے میں رومی بادشاہ نے دو پہلوان، ایک طاقتور اور قد آور اور دوسرا شہ زور اور قوی پنجہ مسلمان پہلوانوں سے مقابلے کیلئے شام بھیجے۔ معاویہ نے عمرو بن عاص سے کہا قد آور شخص سے تو مقابلے کیلئے ہمارے پاس قیس بن سعد موجود ہیں لیکن دوسرے کیلئے کوئی ایسا آدمی تلاش کرو جو اس سے زور آزمائی کر کے اسے نیچا دکھا سکے۔ عمرو نے کہا کہ میری نظر میں دو آدمی ہیں لیکن آپ ان دونوں کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں۔ ایک تو محمد بن حنفیہ ہیں دوسرے عبداللہ بن زبیر۔ معاویہ نے کہا ان دونوں میں جو یہاں سے نزدیک ہو اسے بلاؤ۔ عمرو نے اس کام کے لیے محمد بن حنفیہ سے درخواست کی۔ معاویہ نے ایک مجلس عام منعقد کی جس میں اعلیٰ عہدیدار اور سربرآوردہ لوگ بھی حاضر تھے۔ شہ زور پہلوان زور آزمائی کے لیے محمد بن حنفیہ کے سامنے آیا۔ انہوں نے کہا کہ یا تو تم بیٹھ جاؤ اور اپنا ہاتھ مجھے پکڑا دو تاکہ میں تمہیں اٹھا کر پھینک دوں یا پھر میں بیٹھ جاتا ہوں، تم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھا دو تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہم میں سے کون زیادہ زور آور ہے۔ اب بتاؤ تم بیٹھتے ہو یا میں بیٹھوں۔ اس نے کہا،

آپ بیٹھیے۔ محمد بیٹھ گئے اور اپنا ہاتھ رومی پہلوان کے ہاتھ میں دیدیا۔ رومی نے ہر چند زور لگایا لیکن محمد بن حنفیہ کو جنبش بھی نہ دے سکا اور اپنی کمزوری کا اعتراف کرلیا۔ اب محمد کھڑے ہوگئے اور رومی پہلوان بیٹھ گیا۔ محمد نے ایک ہی جھٹکے بس اسے ہوا میں اچھال کر دور پھینک دیا۔ حاضرین نے تحسین و آفرین کی اور معاویہ بھی خوش ہوئے۔

اب دوسرا قد آور پہلوان، قیس بن سعد کے مقابلے کے لیے سامنے آیا۔ قیس بن سعد نے ایک کونے میں جا کر اپنا زیر جامہ اتار کر اسے دیا اور کہا اسے پہن لو۔ رومی نے جو پہنا تو وہ اس کے سینے تک آ گیا اور پاؤں کی طرف سے بھی نیچے لٹکتا رہا۔ رومی پہلوان شرمندہ ہو کر بیٹھ گیا۔ بزرگانِ انصار اس بات سے بہت جز بز ہوئے کہ بھری محفل میں قیس نے زیر جامہ اتارا مگر قیس نے چند اشعار کہہ کر معذرت کرلی۔

محمد بن حنفیہ کے لیے امامؑ کا وصیّت نامہ

جس وقت امام حسینؑ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے انہوں نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام ایک وصیت نامہ لکھا جو ابن طاؤس نے نقل کیا ہے۔ اس میں امامؑ نے اپنے قیام کا محرک بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ آپ مختلف حالات میں کیا طریقِ کار اپنائیں گے۔ اس کے علاوہ امامؑ نے ان باطل محرکات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو انسان کو اکساتے ہیں اور شہوات اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے جنگ پر آمادہ کرتے ہیں لیکن مردانِ حق ایسے محرکات سے پاک

ہوتے ہیں۔ نیز یہ بتایا ہے کہ مردانِ حق کی تحریک نفسانیت سے پاک ہوتی ہے۔

وصیت نامہ یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"یہ وصیت ہے حسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالب کی محمد عرف ابن حنفیہ کے نام — میں حسینؑ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں اور محمدؐ اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے پیغامِ حق لیکر آئے۔ جنت حق ہے، جہنم حق ہے اور اس میں شک نہیں کہ قیامت آنے والی ہے۔ اس دن اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا۔"

یہ سب وہی عقائد ہیں جن پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور ان عقائد کے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ان کے تذکرے سے امامؑ کا مقصد یہ تھا کہ اس وقت یہ اصول خطرے میں ہیں اور اگر معاملہ یونہی چلنے دیا گیا تو عین ممکن ہے کہ حکومتِ وقت اصولِ دین سے بھی تعرض کرنے سے گریز نہ کرے در اصل امامؑ کی تحریک کا اصل محرک یہی بنیادی اصول تھے جن پر مسلمانوں کے تمام مذہبی اور اجتماعی معاملات کا دار و مدار ہے۔

اس کے بعد آپ نے لکھا تھا:

"میری تحریک کا مقصد نہ زیادتی ہے نہ سرکشی اور نہ ہی یہ نفسانیت پر مبنی ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ فساد پھیلاؤں یا کسی پر ظلم کروں۔ میں تو اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں اور اپنے نانا اور اپنے والد کی سیرت کی پیروی کر رہا ہوں۔"

اس وصیت نامے میں ان میں سے کوئی بات نہیں جو آجکل کے وصیت ناموں میں عموماً لکھی جاتی ہیں۔ اس میں اپنے لیے فاتحہ دلانے اور ایصالِ ثواب کرنے کی وصیت نہیں کی گئی ہے بلکہ امامؑ تو صرف اپنی تحریک کا مقصد واضح کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ نے بتادیا کہ میری تحریک کا مقصد نہ کوئی تفریح ہے نہ مال و دولت جمع کرنا، نہ کسی پر ظلم ڈھانا اور نہ فساد پھیلانا۔ یہ جملہ کہ "میں اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں" ظاہر کرتا ہے کہ ۶۰ھ میں امت کو کسی شدید مذہبی اور اجتماعی بحران کا سامنا تھا جسے دور کرنے کے لیے خونیں انقلاب کی ضرورت تھی جو حسینؑ بن علیؑ کے ہاتھوں ہی انجام پاسکتا تھا، جن کی عظمت کی گواہی قرآن نے سورۂ احزاب میں آیۂ تطہیر میں دی ہے۔ جو فساد اس وقت رونما تھا وہ مقالات اور خطبات سے دور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

"اگر لوگ میری دعوت قبول کرتے اور حق کو تسلیم کرتے ہیں تو خیر اور اگر قبول نہیں کرتے تو میں صبر کروں گا"

یہاں صبر سے مراد یہ نہیں کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاؤں گا کہ یزید جو دل چاہے کرے بلکہ صحیح معنی میں صبر مراد ہے جو امامؑ کے شایانِ شان ہے اور ایمان اور خدا پرستی کی اساس ہے یعنی بھر میں ـ تن تنہا ہی اس راستے کو طے کروں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کردے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس کے بعد آپ نے لکھا تھا:

"میرے بھائی یہ میری وصیت ہے تمہارے لیے۔ میں صرف خدا

سے توفیق کا طلب گار ہوں۔ اسی پر میرا بھروسا ہے اور اسی کے پاس ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔"

امامؑ کے قیام کی وجوہات

اگر ہم واقعی امام حسینؑ کی تحریک کے اسباب معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں اس کی ابتدا معلوم کرنے کے لیے کم از کم تیس سال پہلے کی تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا کیونکہ ۲۹ھ یا ۳۰ھ ہی سے ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ اس تحریک کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ عثمان بن عفان اموی نے تقریباً بارہ سال حکومت کی۔ ان کی خلافت کے آخری چھ سالوں میں اسلامی حکومت کی ہیئت کذائی میں تبدیلی آنی شروع ہو گئی تھی۔ اصولاً اسلامی حکومت میں ہونا یہ چاہیے کہ جہاں تک قانون کا تعلق ہے کسی کے ساتھ رو رعایت نہیں ہونی چاہیے۔ باقی معاملات میں البتہ لوگ آزاد ہیں لیکن اب یہ صورت ہو گئی تھی کہ سب ہی معاملوں میں لوگ آزاد ہو گئے تھے صرف خلیفہ کے مفاد کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے بیت المال کو لوٹنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کی دولت اور جائدادوں پر قبضہ جما لیا۔ وہی بیت المال جس کی علی بن ابی طالبؑ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بھرپور نگرانی کی۔ یہی طرزِ عمل شیخین کا تھا۔ خود عثمان بھی اپنی خلافت کے اوائل میں بڑی حد تک آمد و خرچ کے معاملے میں ضروری احتیاط برتتے تھے لیکن بعد میں بجائے اس کے کہ دولت مسلمانوں کے عمومی مصالح میں صرف ہوتی، بعض افراد کے ہاتھ لگ گئی اور جائدادیں ان کے نام چڑھنا شروع ہو گئیں۔ یہی بدعنوانیاں جو تیس سال پیشتر شروع ہوئی تھیں، اس بات کا سبب بنیں کہ تیز و تند خونیں انقلاب کی ضرورت

محسوس ہونے لگی۔ مسعودی مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ خلیفہ سوم نے اپنی رحلت کے وقت پچاس ہزار دینار طلائی اور دس لاکھ درہم ترکہ میں چھوڑے، حالانکہ اسی مسعودی نے لکھا ہے کہ امیرالمومنینؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ نے برسرِ منبر اعلان کیا کہ میرے والد نے از قسم سیم و زر کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ صرف سات سو درہم ہیں جو آپ نے وظیفے سے اس لیے پس انداز کیے تھے کہ خانگی ضرورت کے لیے خادم کا انتظام کرنا تھا۔

اس کے بعد مسعودی لکھتا ہے کہ وادیٔ القریٰ اور دوسری جگہوں پر خلیفہ سوم کی جائداد کی قیمت ایک لاکھ دینار تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ گھوڑوں اور اونٹوں کی بھی ایک بڑی تعداد انھوں نے ترکہ میں چھوڑی۔

زبیر کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے بصرہ کے مشہور محل کے علاوہ بہت سے مکانات بصرہ، کوفہ اور اسکندریہ میں تعمیر کرائے تھے اور مرتے وقت پچاس ہزار دینار طلائی، ایک ہزار کنیز و غلام اور بہت سی جائداد مختلف شہروں میں چھوڑی۔

طلحہ بن عبیداللہ ایک مشہور صحابی ہیں۔ انکی عراق کی جائداد کی آمدنی ایک ہزار دینار روزانہ تھی۔ اس کے علاوہ شام میں بھی بہت جائداد تھی۔

ایک اور صحابی عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔ ان کے اصطبل میں سو گھوڑے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں ان کے پاس تھیں۔ انتقال کے وقت چار بیویاں تھیں اور چونکہ اولاد بھی تھی اس لیے میراث میں انکی بیویوں کو ۱/۸ حصہ ملا۔ ہر بیوی کا حصہ ۱/۳۲ ہوا۔ اس ۱/۳۲ حصے کی قیمت ۸۴ ہزار دینار تھی۔

زید بن ثابت نے اتنا سونا چاندی ترکہ میں چھوڑا کہ ہتھوڑوں سے توڑ کر تقسیم کیا گیا۔ ان کی باقی جائداد کی قیمت ایک لاکھ دینار طلائی بنتی تھی۔

یعلیٰ بن امیہ کی والدہ کا نام منیہ تھا اس وجہ سے یعلیٰ بن منیہ بھی کہا جاتا ہے،

امیر المومنینؑ کے خلاف جنگِ جمل، یعلیٰ ہی کی مالی امداد کے بل بوتے پر لڑی گئی تھی۔ مرتے وقت پانچ لاکھ دینار ترکہ میں چھوڑے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے ذمے بڑی رقمیں تھیں۔ جائداد وغیرہ کی مالیت تین لاکھ دینار تھی۔

مسعودی خود لکھتا ہے کہ عمر بن خطاب کے زمانے میں یہ صورت نہیں تھی بلکہ ہر کام صاف اور سیدھے طریقے پر تھا۔ زر کی وصولی اور تقسیم کا طریقہ اور طرزِ حکومت ایسا نہیں تھا کہ کسی کو اس طرح دولت جمع کرنے کا موقع مل سکے۔

عثمان کے بعد علیؑ برسر اقتدار آئے تو ان کے سامنے سب سے اہم کام جس پر جنگیں بھی ہوئیں، یہی تھا کہ بااثر لوگوں کو قابو میں رکھیں، بدعنوانیوں کو روکیں اور کسی کو بیت المال سے ایک دینار بھی حساب کے بغیر نہ لینے دیں۔ علیؑ کو ساڑھے چار سال تک انہی لوگوں سے لڑنا پڑا جو اس طرح کی کمائی سے محروم ہو گئے تھے۔ علیؑ کہا کرتے تھے کہ جب تک میں برسر اقتدار ہوں دوبارہ لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جن لوگوں نے ناجائز دولت کمائی ہے انہیں بھی واپس کرنا ہوگی۔ اسی بنا پر علیؑ شہید کر دیے گئے۔

صلح امام حسنؑ

امیر المومنینؑ کے بعد امام حسنؑ اپنے والد کے جانشین ہوئے اور خلافت اسلامی ان کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس وقت مسلمانوں کی اجتماعی صورتِ حال نے ایک خاص شکل اختیار کر لی تھی۔ مسلمانوں کی طاقت دو محاذوں یا دو فریقوں کے درمیان اس طرح برابر برابر تقسیم ہو گئی تھی کہ اگر امام حسنؑ معاویہ کے خلاف جنگ جاری رکھتے تو سخت خونریزی کے بغیر کسی فریق کی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ بے مقصد خونریزی کو

روکنے کے لیے امام حسنؑ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ اگر وہ امیر معاویہ سے مزاحمت جاری رکھتے تو اس کا فائدہ بیرونی محاذ پر صرف مشرقی رومی سلطنت کو اور اندرونِ ملک خوارج کو پہنچتا۔ اگر وہ چار پانچ ہزار مسلمان بھی جو جان کی بازی لگائے ہوئے تھے، معاویہ سے جنگ میں الجھ جاتے تو پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ رومی سلطنت کی طرف سے مسلمانوں پہ کیا آفت نازل ہوتی، خوارج کا خطرہ کیا صورت اختیار کرتا اور اسلامی تاریخ کیا سے کیا ہو جاتی۔ امام حسنؑ نے خلافت سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی تاریخی بردباری سے نہ صرف مسلمانوں کو مزید خونریزی سے بچایا اور اسلامی طاقت کو محفوظ رکھا بلکہ بیرونی اور اندرونی دشمنوں کے منصوبے خاک میں ملا دیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے بالکل ہتھیار ڈال دیے اور معاویہ کی خلافت تسلیم کر لی۔

امام حسنؑ اور امیر معاویہ کے مابین صلحنامے کی ایک شرط یہ تھی کہ حسنؑ بن علیؑ معاویہ سے صلح کرتے ہیں اس شرط پر کہ وہ معاویہ کو امیر المومنین کہنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ مطلب یہی تھا کہ وہ معاویہ کو خلیفہ اور امیر المومنین تسلیم نہیں کرتے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسنؑ نے خلافت سے دستکش ہو کر معاویہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور دوسرے عام مسلمانوں کی طرح معاویہ کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیا اور ان کے تابع فرمان ہو گئے، وہ ابن اثیر کی اس وقیع روایت پر غور کریں۔

جب امام حسنؑ کنارہ کش ہو گئے اور معاویہ نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی تو فروہ بن نوفل اشجعی خارجی نے جو پانچ سو آدمیوں کے ساتھ باقی خوارج سے الگ ہو کر شہر زور چلا گیا تھا، کہا کہ اب معاویہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد جنگ ضروری ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے عراق کا رخ کیا اور کوفہ کے نخلستان تک پہنچ گئے۔ دریں اثناء

امام حسنؑ کوفہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ معاویہ کو جب خبر ملی کہ اس خارجی نے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ سرکشی اختیار کی ہے تو امام حسنؑ کو صلح کی بنیاد مضبوط کرنے کے خیال سے خط لکھا اور انہیں ہدایت کی کہ فردہ بن نوفل خارجی سے جنگ کریں اور اسے کوفہ سے نکال دیں۔ یہ بھی لکھا کہ فردہ کا قصہ پاک کرنے کے بعد آپ کی مدینہ روانگی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جس وقت امام حسنؑ کو یہ خط ملا وہ قادسیہ میں یا قادسیہ کے نزدیک کسی جگہ تھے۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ اے معاویہ تو حسنؑ بن علیؑ کو اس کام پہ مامور کرتا ہے کہ وہ تیرے ایک افسر کی حیثیت سے جائے اور ایک سرکش خارجی کو زیر کرے۔ میں حسنؑ بن علیؑ ہوں اور خلافت پر میرا حق ہے جو میں نے مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر چھوڑ دی ہے۔ اگر میں کسی اہل قبلہ یعنی کسی بھی عقیدے کے حامل مسلمان سے لڑائی کو پسند کرتا تو پہلے تم سے لڑتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو سب لوگوں کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ دور ہے لیکن میں نے تجھے چھوڑ دیا۔

غور کیجیے کہ امامؑ نے یہ نہیں کہا کہ میں نے تمہاری خلافت تسلیم کرلی، یہ کہا کہ میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ شاید مطلب یہ ہو کہ میدانِ سیاست میں چھوڑ دیا اور خود اس لیے کنارہ کشی اختیار کرلی کہ بے فائدہ مسلمانوں کا خون نہ بہے کیونکہ دونوں طرف طاقت کا توازن برابر تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو دونوں فریق ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر کمزور ہو جاتے اور اس کا فائدہ بیرونی اور اندرونی دشمنوں ہی کو پہنچتا۔

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ نے بھی ۴۹ھ سے لیکر ۶۰ھ تک معاویہ کی زندگی میں تلوار نہیں اٹھائی یعنی وہ اقدام نہیں کیا جو یزید کے برسر اقتدار آنے کے بعد ضروری سمجھا لیکن وہ معاویہ کی غلطیوں پر نکتہ چینی اور تنبیہ ضرور کرتے رہے۔ چونکہ ان کے بھائی حسنؑ نے اس مختصر خط میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے معاویہ کی

حقانیت کا ابطال کیا تھا اس لیے امام حسینؑ کی حکمتِ عملی بھی یہی رہی۔

معاویہ کے نام امام حسینؑ کا خط

اپنے بھائی کی شہادت کے بعد امام حسینؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جو ابنِ قتیبہ دینوری نے نقل کیا ہے۔ اس میں آپ نے لکھا:

کیا تم نے حجر بن عدی اور ان کے عبادت گزار دوستوں کو قتل نہیں کیا جو بدعت کو برا سمجھتے تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے؟ تم نے انہیں امان دینے اور ان سے عہد و پیمان کرنے کے بعد ازراہِ ظلم و ستم ان کو قتل کر دیا۔ تم نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑنے کی جرأت کی اور اسے معمولی بات سمجھا۔ کیا تم نے عمرو بن الحمق کو قتل نہیں کیا جس کا جسم عبادت کی کثرت سے گھل چکا تھا؟ تم نے ان سے ایسے عہد و پیمان کیے تھے کہ انہیں سن کر آہو ان کو ہی بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر نیچے اتر آتے۔ کیا تم نے نامعلوم باپ کے بیٹے زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا قرار نہیں دیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ تھا کہ بچہ اس کا ہوتا ہے جس کے گھر پیدا ہو اور زانی کو سنگسار کر دیا جائے؟ پھر تم نے اسی زیاد کو اہل اسلام پر مسلط کر دیا جو انہیں قتل کرتا ہے، ان کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہے اور انہیں کھجور کے درختوں پر لٹکا کر پھانسی دیتا ہے۔ سبحان اللہ! معاویہ! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اس امت سے کوئی تعلق نہیں۔

آگے چل کر آپ نے لکھا:

معاویہ! اللہ سے ڈرو جس کے یہاں ہر چھوٹا بڑا عمل لکھا جاتا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ان باتوں کو بھولنے والا نہیں کہ تم الزام لگا کر لوگوں کو

قتل کرادیتے ہو۔ تم نے ایسے لونڈے کو مسلمانوں کا امیر بنادیا ہے جو شراب پیتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنے آپ کو تباہ کرلیا۔ اپنے دین کو برباد کردیا اور امتِ مسلمہ کو کمزور کردیا۔

یہ تھا امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا معاویہ سے طرزِ تخاطب۔ وہ اس طرح کے خط لکھتے تھے اور اس طرح باز پرس کیا کرتے تھے۔

یہ جاننے کے لیے کہ یزید کے بارے میں امام حسینؑ نے جو کچھ لکھا وہ کہاں تک صحیح ہے مسعودی سے سنیے:

یزید کا تعارف

مشہور مورخ مسعودی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یزید ایک عیاش آدمی تھا۔ اس نے شکاری جانور کتے، بندر اور چیتے پالے ہوئے تھے۔ اس کے یہاں شراب کی محفلیں جمتی تھیں۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد، ایک دن جب یزید شراب پی رہا تھا اور ابنِ زیاد اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اس نے ساقی کی طرف رخ کر کے شعر پڑھے جن کا مطلب یہ تھا:

ساقیا! ایسا جام پلا جو میری ہڈیوں کو سیراب کردے۔ پھر ایسا ہی ایک جام ابنِ زیاد کو دے جو میرا ہمراز اور معتمد ہے اور جس نے میری کامیابیوں اور کوششوں کو مستحکم کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ابنِ زیاد نے حسینؑ کو قتل کر کے میری خلافت کی بنیاد کو مستحکم اور مضبوط کردیا ہے۔

اس کے بعد مسعودی، یزید کے مظالم کے متعلق کچھ فقرے لکھ کر کہتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا فرعون تھا بلکہ فرعون اپنی رعایا کے لیے زیادہ عادل اور منصف مزاج تھا۔ پھر لکھتا ہے کہ اس کی بدخوانیاں اور بے باکیاں مسلمان قوم میں بھی سرایت

کر گئی تھیں۔ جو گناہ یزید کرتا تھا وہ اس کے مقربین بھی کرتے تھے۔ انھوں نے بھی وہی عادتیں اختیار کر لی تھیں۔ یزید کے دور میں مکہ اور مدینہ میں گانے بجانے کا رواج ہوا۔ لوگ بے محابا شراب پینے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جو شخص جانشینِ رسولؐ ہونے کا مدعی اور مسندِ خلافت پر متمکن تھا، اس نے بندر پالا ہوا تھا جس کا نام ابو قیس تھا۔ اسے مجلسِ میگساری میں لا کر ایک گدیلے پر بٹھایا جاتا۔ اُسے ایک گدھی پر بھی سوار کرایا جاتا جسے گھڑ دوڑ میں حصہ لینے کی تربیت دی گئی تھی۔ اس پر زین کس کر اور لگام لگا کے اس بندر کو بٹھا دیا جاتا اور وہ گدھی گھوڑوں کے ساتھ دوڑتی۔ ایک دن ابو قیس کی گدھی دوڑ جیت گئی تو ابو قیس کو سرخ اور زرد ریشمی کپڑے اور قبا پہنائی گئی۔ اسے ٹوپی بھی اڑھائی گئی جس پر خوبصورت کام بنا ہوا تھا اور طرح طرح سے سجائی گئی تھی۔

یہ ہے مطلب اس جملے کا جو امام حسینؑ نے یزید کے بارے میں لکھا تھا۔ یہی شخص خلیفہ بن گیا تھا اور اس نے امام حسینؑ پر دباؤ ڈالا تھا کہ اس کی بیعت کر لیں اور اسے اپنے نانا کا خلیفہ برحق تسلیم کر لیں۔ آیئے دیکھیں کہ امامؑ نے بیعت کیوں منظور نہیں کی اور شہادت کیوں قبول کی۔

بعض مصنفین نے اس سوال کا بہت ہی غلط اور رکیک جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امامؑ نے اندازہ لگایا کہ چاہے بیعت کریں یا نہ کریں بنی امیہ چھوڑیں گے نہیں اور ہر حال میں آپ کو قتل کر دینگے۔ لہٰذا آپ نے سوچا کہ کیوں نہ آبرومندانہ طریقے سے قتل ہو جائیں اور اپنی جان خدا کی راہ میں دیدیں۔ یہ جواب بہت سطحی اور غیر تسلی بخش معلوم ہوتا ہے۔ گویا جب امامؑ نے دیکھا کہ قتل تو ہونا ہی ہے تو جان پر کھیل گئے۔ بقول شخصے تیل گر گیا تھا، کہہ دیا کہ حضرت عباسؑ کی نذر ہے۔

امامؑ نے بھی جب دیکھا کہ مجھے قتل تو ہونا ہی ہے تو سوچا کہ بہتر ہے کہ میں عزت کے ساتھ قتل ہو جاؤں اور اسلام کی راہ میں شہید ہو جاؤں۔

بات یہ نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس زمانے میں ملتِ اسلامیہ کی جو حالت تھی اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے اور خود امامؑ کے خطبات اور کلمات پر غور کیا جائے تاکہ حقیقتِ حال روشن ہو جائے۔

امام حسینؑ نے ان تمام اسباب پر غور کرنے کے بعد جو پچھلے تیس سال سے پیش آرہے تھے یہ طے کیا اور صحیح طے کیا کہ اس وقت یعنی ۶۰ھ میں ملتِ اسلامیہ کی کجی اس قدر شدید ہو گئی ہے کہ اس کا مداوا محض نصیحتوں، تقریروں، خطبوں، دینی اور مذہبی مقالوں اور مراسلوں سے نہیں ہو سکتا، نہ ان باتوں سے امت کو راہ راست پر لانا ممکن ہے۔ اگر معمولی کجی ہوتی تو ممکن تھا کہ معمولی تحریک یا معمولی اقدام سے اُسے دُور کیا جا سکتا اور منحرفین راہِ راست پر آجاتے لیکن کجی اتنی غیر معمولی اور شدید تھی کہ اس کا اثر بنیادی اصولوں پر پڑ رہا تھا۔ پھر کسی ایک شخص کی اصلاح کا معاملہ نہیں تھا کہ چھوٹی سی تحریک اور پند و نصیحت سے کام بن جاتا۔ فساد پورے معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اس لیے امام حسینؑ نے طے کیا کہ غیر معمولی انقلابی تحریک کی ضرورت ہے تاکہ اب تک اس سلسلے میں امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ نے جو ابتدائی کام کیا ہے اس سے قطعی اور حتمی نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ خود امام حسینؑ سے بہتر اس تحریک کے اسباب کون بیان کر سکتا ہے اور انھوں نے یہ اسباب بیان بھی کیے ہیں۔ آئیے آپ کے خطبات اور کلمات کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ امامؑ خود کیا فرماتے ہیں، بات کہاں سے شروع کرتے اور کہاں پر ختم کرتے ہیں:

امامؑ کی تحریروں اور تقریروں سے، خصوصاً اگر ان کی تاریخی ترتیب کو ملحوظ

دیکھا جائے تو مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں آپ نے اپنی تحریک کے راز پر سے پردہ نہیں اٹھایا تھا لیکن جوں جوں مقصد کی طرف پیش قدمی ہوتی گئی، آپ نے تحریک کے اسباب و علل سے لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اس وصیت نامے سے لیکر جو آپ نے مدینہ میں اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو لکھ کر دیا تھا، اس آخری خطبے تک جو منزل بیضہ میں حر بن یزید ریاحی اور ان کے ساتھیوں کے سامنے دیا آپ نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو بتلا دیا کہ آپ نے یہ قدم کیوں اٹھایا اور یہ کہ آپ کے سامنے اسکے سوا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ جو رخنہ کہ اولاً خلافتِ اسلامی میں اور ثانیاً مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی میں پڑ گیا تھا، اس کا شہادت کے سوا کوئی علاج نہ تھا۔

جب عاملِ مدینہ نے بیعت کے لیے آپ پر دباؤ ڈالا تو آپ مسلسل دو رات خاتم الانبیاءؐ کی قبر پر جاتے اور وہاں نماز پڑھتے رہے۔ دوسری رات قبرِ مطہر کی زیارت کرنے اور چند رکعت نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگتے ہوئے کہا:

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَبْرُ نَبِیِّكَ وَاَنَا ابْنُ بِنْتِ نَبِیِّكَ وَقَدْ حَضَرَنِیْ مِنَ الْاَمْرِ مَا قَدْ عَلِمْتَ۔

خدایا! یہ تیرے پیغمبرؐ کی قبر ہے۔ میں ان کا نواسا ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ مجھے کس صورتِ حال کا سامنا ہے۔

شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ امامؑ کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ میری جان کے درپے ہیں۔ میں چاہے ان کی بات مانوں یا نہ مانوں، یہ میرے قتل سے باز نہیں آئیں گے۔

لیکن ہمیں یقین ہے کہ کوئی مسلمان اس فقرے کے یہ معنی نہیں لے گا کہ امام حسینؑ کو شہادت کا خطرہ تھا اور چونکہ وہ اس خطرے سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے تھے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ مع اپنے بیوی بچوں کے سلامتی کے ساتھ زندگی

گزار سکیں، اس لیے آپ بیتابی کا اظہار کر رہے تھے اور خدا سے کہہ رہے تھے کہ خدایا میں تیرے پیغمبرؐ کا نواسا ہوں۔ کیا عجیب مطلب ہے! کیا خود پیغمبرؐ کو قتل نہیں کیا گیا تھا؟ کیا خود انہیں زہر نہیں دیا گیا تھا؟ کیا امام علیؑ اور امام حسنؑ شہید نہیں ہوئے تھے؟ پھر شہادت پر بے چینی کیوں؟ مارے جانے کی شکایت کیا؟ وہ مسلمان جو صرف چند سال یا بعض دفعہ چند ماہ رسولؐ اللہ کے زیر تربیت رہے، باوجودیکہ پہلے مشرک اور بت پرست تھے، پھر بھی شہادت سے گھبراتے نہیں تھے، بلکہ گھر سے نکلتے ہوئے دعا کرتے تھے کہ زندہ سلامت واپس نہ آئیں اور راہِ خدا میں شہادت کی سعادت حاصل کریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فرزندِ رسولؐ، پروردۂ علیؑ دبتولؑ شہادت سے گھبرائے اور خدا و رسولؐ سے ملتجی ہو کہ کسی طرح اس بلا کو ٹالیں اور مجھے زندہ رہنے کا موقع دیں۔

عمرو بن جموح جو مدینہ کے رہنے والے تھے، پہلے بت پرست تھے اور مدینہ میں ایک مندر کے مہنت تھے۔ یہ بت پرستی پر ثابت قدم رہے اور مدینہ میں اسلام پھیل جانے کے بعد بھی بت پرستی سے دستبردار نہیں ہوئے۔ خلوصِ دل سے اپنے گھر میں ایک بت کی پوجا کرتے رہے۔ کئی دن تک ایسا ہوتا رہا کہ رات کو بنی سلمہ کے چند نوجوان ان کا بت چرا لیتے اور اسے کسی کنویں یا گندی نالی میں پھینک دیتے۔ صبح کو یہ بڈھے بیچارے اپنے دیوتا کی تلاش میں نکلتے، اسے گندگی سے نکالتے، دھوتے، صاف کرتے، خوشبو لگاتے اور پھر بڑی عاجزی سے اس کے سامنے کھڑے ہو کر معذرت کرتے اور کہتے کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کون تیرے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے تو میں اس سے نمٹ لیتا مگر یقین کر کہ مجھے معلوم نہیں اس لیے مجبوری ہے۔ بنی سلمہ کے نوجوان برابر اپنے کام میں لگے رہے۔ آخر ایک دن عمرو بن جموح کی سوئی ہوئی فطرت بیدار ہو گئی

اور انھوں نے اپنے دیوتا سے جسے لوگوں نے مرے ہوئے کتّے کے ساتھ رسی سے باندھ کر کنویں میں پھینک دیا تھا، کہا کہ اگر تو واقعی دیوتا ہوتا تو کتے کے ساتھ کنویں میں نہ ہوتا۔ یہ کہہ کر دل شکستہ و افسردہ خاطر گھر لوٹ آئے، بت پرستی چھوڑ دی اور شاید اسی دن اسلام لے آئے۔

یہ صاحب پہلے بت پرست تھے لیکن جب مسلمان ہوئے تو چند سال کی اسلامی تربیت سے ان کی روح کی رفعت اور خیالات کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ جب شوال ۳ھ میں جنگِ اُحد کی تیاری ہونے لگی تو ان کے چار بیٹے پہلے ہی رسولِ خدا کی ہمراہی پر آمادہ تھے۔ انھوں نے اور دوسرے متعلقین نے اصرار کیا کہ آپ بڈھے آدمی ہیں، پاؤں میں بھی لنگ ہے، آپ تکلیف نہ اٹھائیں، گھر ہی میں رہیں۔ آپ کے چار بیٹے پہلے ہی رسولِ خدا کی ہمراہی میں اس جہاد میں شرکت کر رہے ہیں۔ عمرو اس تجویز پر بہت آشفتہ ہوئے۔ رسولِ خدا کا دامن پکڑ لیا اور کہا مجھے جنت میں جانے دیجیے، میں لنگڑا ہی چلا جاؤں گا۔ جب گھر سے چلے تو شوقِ شہادت میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا:

"اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ الشَّھَادَۃَ، اَللّٰھُمَّ لَاتَرُدَّنِیْ اِلٰی اَھْلِیْ"

بارِ الٰہا! مجھے شہادت سے محروم نہ رکھ، خدایا! میری آرزو ہے کہ اب میں گھر واپس نہ آؤں۔

مقامِ فکر یہ ہے کہ اگر ایک عام مسلمان جس کی گزشتہ ساری عمر بت پرستی میں گزری ہو اور آخر میں اپنے قبیلے کے جوانوں کے دباؤ سے مسلمان ہوا ہو، اسے اسلام اس روحانی بلندی پر پہنچا سکتا ہے کہ وہ میدانِ جہاد سے صحیح سلامت اپنے بیوی بچوں کے پاس آنا محرومیت اور کم نصیبی سمجھنے لگتا ہے اور صدقِ دل سے یہ چاہتا ہے کہ

دوبارہ گھر نہ لوٹے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ امام حسینؑ جو زبدۃ المکارم والفضائل، خلاصہ شخصیتِ ختم المرسلینؐ و امیر المومنینؑ ہیں، وہ موت سے گھبرا کر نالہ و فریاد کریں اور دامنِ رسولؐ پکڑ کر التجا کریں کہ یا رسولؐ اللہ! لوگ مجھے مارے ڈالتے ہیں، میری فریاد کو پہنچیے۔ درحقیقت یہ بات ہرگز نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی اور نہ اس جملے کا کہ "تجھے معلوم ہے کہ مجھے کس صورتِ حال کا سامنا ہے" یہ مطلب سمجھنا چاہیے۔ اس طرح تو ان کی زندۂ جاوید تحریک کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے اور وہ سطحی اور مبتذل معلوم ہونے لگتی ہے۔ آپ نے اللہ سے مناجات کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ خدایا جو صورتِ حال ہے تجھے معلوم ہے۔

صورتِ حال سے مراد وہ حالات ہیں جن کی آپ نے اپنے خطبوں، مراسلوں اور مکالموں میں وضاحت کی ہے، حالات کا وہ اندازہ ہے جو آپ نے لگایا تھا۔ صورتِ حال سے مراد وہ افسوسناک حالت تھی جس سے مسلمان اس زمانے میں دوچار تھے۔ صورتِ حال سے مراد خلافتِ بنی امیہ کے وہ واقعات تھے جن کے گہرے جائزے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قربانی اور شہادت کے بغیر مسلمانوں کو گمراہی سے نجات نہیں دلائی جا سکتی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا تھا: خدایا میں نیکیوں کو پسند کرتا ہوں اور برائیوں سے بیزار ہوں۔ یہ کہہ کر امامؑ نے قدرے اپنے مقصد کی وضاحت کر دی تھی لیکن ابھی یہ مقصد پوری صراحت سے بیان نہیں کیا تھا کہ عوام بھی سمجھ جائیں۔

پھر آپ نے فرمایا تھا: اے ذوالجلال والاکرام! میں اس قبر اور صاحبِ قبر کے واسطے سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے وہ راہ دکھا جس میں تیری اور تیرے رسولؐ کی رضا ہو، جس پر چلنے سے تو بھی خوش اور تیرا رسولؐ بھی خوش ہو۔

امامؑ کا قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر تھا

امام حسینؑ نے اس گفتگو میں اور اپنے وصیت نامے میں ابھی صرف یہ بات عیاں کی تھی کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے جا رہا ہوں لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے امامؑ کی کیا مراد تھی ؟ شاید بہت سے لوگ جنھوں نے امامؑ کے یہ الفاظ سنے ہوں، یہ سمجھے ہوں کہ امامؑ یہ چاہتے ہیں کہ کوفہ جا کر وہاں کے بقالوں اور نانبائیوں سے یہ کہیں کہ کم مت تولو، سڑا ہوا دہی اور خراب پنیر گاہکوں کو مت دو، کچی اور جلی ہوئی روٹی مت بیچو یا کوفہ کے تاجروں سے کہیں کہ سود مت لو۔ یہ تو ہے نہی عن المنکر۔ ساتھ ہی جوانانِ کوفہ سے یہ کہیں کہ واجب نماز سے غفلت نہ کرو۔ اگر تمھارے پاس روپیہ ہو تو حج کے لیے ضرور جاؤ۔ یہ ہوا امر بالمعروف۔

لیکن اصل میں معاملہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ اس قسم کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک اچھا اور ضروری کام سہی لیکن یہ کام تو کوفہ کے معمولی علماء بھی انجام دے سکتے تھے۔ اس کے لیے امامؑ کے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ بات دراصل یہ ہے کہ امام حسینؑ وہ کچھ کرنا چاہتے تھے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت کے حالات میں صرف ان ہی کی شخصیت تھی جو ایسا اقدام کر سکتی تھی جس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے، مرورِ زمانہ کا اس پر اثر نہ ہو سکے اور تاریخ اسلام میں اس کو بھلایا نہ جا سکے۔

امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہو کر ۳ر شعبان کو مکہ میں داخل ہوئے اور وسطِ

رمضان میں اپنے عم زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا۔ رمضان کے باقی دنوں میں اور شوال، ذی قعد اور آٹھویں ذی الحجہ تک مکہ ہی میں مقیم رہے۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ فرزندِ رسولؐ خدا اور فرزندِ مکہ ومنیٰ آٹھویں ذی الحجہ کو جب لوگ احرام باندھ رہے تھے، مناسکِ حج ادا کیے بغیر محض عمرہ کر کے مکہ سے باہر چلے جائیں گے مگر انھوں نے روانگی کا عزم کر لیا تھا۔ خانہ کعبہ کا طواف کیا صفا و مروہ کے درمیان سعی کی اور احرام کھول دیا اس لیے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں انھیں حرمِ مکہ ہی میں گرفتار یا قتل نہ کر دیا جائے۔ اس طرح قتل ہونے سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ امامؑ نے قتل سے بچنے کے لیے مکہ نہیں چھوڑا بلکہ وہ اس لیے مکہ سے روانہ ہو گئے تاکہ اگر قتل ہوں تو اس طرح قتل ہوں کہ ان کی شہادت سے رہتی دنیا تک اسلام کو فائدہ پہنچے۔

لہوف کی روایت ہے کہ روانگی سے قبل آپ نے مجمع میں خطبہ دیا جس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"خُطَّ الْمَوْتُ عَلٰی وُلْدِ آدَمَ مَخَطَّ الْقِلَادَةُ عَلٰی جِيْدِ الْفَتَاةِ"

موت نے بنی آدم کو اس طرح نشان زدہ کر دیا ہے جیسے کسی جوان عورت کی گردن پر گلوبند کا نشان پڑ جاتا ہے، (مطلب یہ کہ موت بنی آدم کے لیے ناگزیر ہے)۔

یہاں آپ نے بات کو زیادہ واضح کر دیا اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ موت اور شہادت کی بات کی اور یہ بتا دیا کہ اس وقت یعنی ۶۰ھ میں معاملہ اس حد سے گزر چکا ہے کہ اس کی اصلاح مالی یا زبانی

کوششوں سے ہو سکے۔ خود امام حسینؑ کے مواعظ بھی اب بے اثر تھے۔ آپ نے یہ کہہ کر کہ موت نے بنی آدم کو نشان زدہ کر دیا ہے یہ واضح کر دیا کہ جو دینی و اجتماعی بگاڑ پیدا ہو چکا ہے، اب شہادت ہی اس کی اصلاح کی واحد صورت ہے اور شہادت بھی کسی ایسے شخص کی جو دختر زادۂ رسولؐ ہو۔ اس خطبے میں بھی جو آپ نے مکہ سے روانگی سے قبل دیا تھا، بات صرف شہادت کی ہے، موت کی ہے اور رسولِ خدا اور اپنے والدین کے پاس جانے کی ہے، کربلا کے بھوکے بھیڑیوں کے تیجے میں پھنسنے کی ہے۔ پھر بھی یہ تذکرہ نہیں کیا کہ اس سفر کا یہی انجام ہوگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ خطبہ آپ نے آٹھویں ذی الحجہ سے پہلے شاید ساتویں ذی الحجہ کو مسجد الحرام میں حجاج اور زائرینِ کعبہ کے مجمع میں دیا تھا۔ اس وقت بظاہر حالات امامؑ کے حق میں تھے اور اکثر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ جلد ہی یزید بن معاویہ کا زوال ہو جائے گا اور خلافت اس کے صحیح حقدار یعنی امام حسینؑ کو مل جائے گی کیونکہ مسلم بن عقیل اطلاع دے چکے تھے کہ سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے سوا کسی کو امامت و خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے اور کسی دوسرے کو بطور حاکم قبول نہیں کرتے اس لیے جلد سے جلد آیئے۔ بظاہر حالات بڑے اطمینان بخش اور حوصلہ افزا تھے لیکن پھر بھی امامؑ شہادت کی بات کر رہے تھے اور عراقی بھیڑیوں کی درندگی کا تذکرہ کر رہے تھے۔

بات وہی ہے جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امام حسینؑ نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میری اور میرے ساتھیوں کی شہادت کے بغیر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور اس لیے آپ نے کہا کہ موت ناگزیر ہے اور بندِ موت بشر کے گلوگیر ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

"جس طرح یعقوبؑ اپنے فرزند یوسفؑ سے ملنے کے مشتاق تھے اسی طرح میں بھی اپنے اسلاف یعنی رسول اللہ، علیؑ، حمزہؑ، جعفرؑ اور اپنی ماں فاطمہ زہراؑ کے دیدار کا مشتاق ہوں۔ میرے لیے شہادت گاہ تجویز ہو چکی ہے۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسینؑ ابن علیؑ کی ذاتی تجویز نہیں تھی بلکہ من جانب اللہ تھی۔ خدائے بزرگ و برتر نے ازل سے ہی مقدر فرما دیا تھا کہ امت میں ایسا فساد رو نما ہوگا اور حسینؑ جان کی بازی لگا کر شہید ہوں گے۔ پھر فرمایا:

"میں دیکھ رہا ہوں گویا بیابانی بھیڑیے نواویس اور کربلا کے درمیان میرے جسم کے ٹکڑے نوچ رہے ہیں۔ وہ اپنے بھوکے پیٹ اور خالی زنبیلیں بھر رہے ہیں وہ اپنی زنبیلیں اور اپنے پیٹ بھرنے کے لیے موجود ہیں اور میں اس سماجی اور دینی بگاڑ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے موجود ہوں، جو مقدر میں ہے اس سے کوئی مفر نہیں۔ یہ تجویز اللہ کی طرف سے ہے اور اس نے موجودہ حالات کی اصلاح کا ذریعہ میری شہادت کو قرار دیا ہے۔ ہم اہلبیتؑ کی خوشی وہی ہے جو اللہ کی رضا ہے۔ اس کی طرف سے جو مصیبت بھی آئے ہم اس پر صبر کرتے ہیں۔ وہ ہمیں صابروں کا پورا اجر دیتا ہے۔ ہم جگر گوشہ رسولؐ ہیں، رسولؐ سے الگ نہیں ہو سکتے، بہشت بریں میں ہم رسولؐ کے ساتھ ہوں گے تاکہ ہمیں دیکھ کر آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور آپؐ وہ وعدے پورے کریں جو آپؐ نے ہم سے کیے ہیں۔ جو ہمارے لیے جان قربان کرنے اور خدا سے ملنے کے لیے تیار ہو صرف

وہ ہمارے ساتھ چلے۔ میں انشاءاللہ کل صبح روانہ ہو رہا ہوں۔"

اللہ کے دین، حقوق الناس اور اسلامی سوسائٹی کے دفاع کے لیے مختلف اوقات میں مختلف تدابیر سے کام لینا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی وقت راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہو۔ کسی وقت مفید اور نصیحت آمیز باتوں سے لوگوں کو راہِ راست پر لایا جا سکے۔ ممکن ہے کبھی تصنیف و تالیف سے اور نشر و اشاعت کے ذرائع کو کام میں لا کر لوگوں کو حق کی طرف مائل کیا جائے اور ان کی دینی و اخلاقی تربیت کی جائے لیکن آخری جملے میں امامؑ نے بتلا دیا کہ آج وہ دن نہیں کہ مالی مدد، قلمی اعانت اور زبانی خیر خواہی سے اسلامی عقدہ کا حل تلاش کیا جا سکے۔ اب وہ موقع ہے کہ شہادت، جانبازی اور قربانی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس کے بغیر نہ فساد پہ قابو پایا جا سکتا ہے، نہ حالات کا رُخ موڑا جا سکتا ہے۔ اب کوئی یہ نہ سوچے کہ امام حسینؑ جو راہِ خدا میں قدم بڑھانے کے لیے کہہ رہے ہیں تو میں بھی کچھ چندہ دیدوں گا یا عبیداللہ بن حر جعفی امام کی دعوت کے جواب میں کہیں کہ میں بھی ایک اسپ فیل پیکر دوغا پسند پیش کردونگا یا کوئی اور صاحب فرمائیں کہ میں پانچ تلواریں، سات زرہیں اور چار نیزے نذرِ امامؑ کردونگا۔ آج حسینؑ بن علیؑ کو تلوار چاہیے نہ نیزہ، گھوڑا چاہیے نہ روپیہ۔ ہاں کوئی خلوصِ نیت سے جان کا ہدیہ پیش کرے تو قبول ہے۔ جو کوئی راہِ خدا میں جان دینے پر آمادہ ہو، جو خدا سے ملاقات کا متمنی ہو وہ امامؑ کا ہم سفر ہو جائے۔ انشاءاللہ کل صبح روانگی ہوگی۔

حیرت ہے کہ اس قدر پر زور تاکید کے باوجود بہت سے کم نصیب موقع پرست بھی ساز گار حالات کے دھوکے میں امامؑ کے ساتھ ہو لیے اور شاید ان میں سے بیشتر مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملنے تک ساتھ رہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ

شروع ہی سے یہ لوگ ایسے امام کے ساتھی تھے جو خلیفہ بنے اور برسرِ اقتدار آئے۔ وہ ایسے امام کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھے جو جان دینے اور شہادت پانے جارہا ہو، جس کا پانی بند کیا جانے والا ہو اور جس کے ساتھی شہادت کا اعزاز حاصل کرنے والے ہوں۔

حضرت سید الشہداءؑ کے مناقب

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ ابن اثیر کی مشہور کتاب اُسد الغابہ سے امام حسینؑ کے بارے میں چند حدیثیں نقل کر دی جائیں اور اس کے بعد سابقہ مضمون کو جاری رکھا جائے۔

ایک شخص نے عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ اگر مچھر کا خون آدمی کے کپڑے کو لگ جائے تو کیا ہو؟ عبداللہ بن عمر نے کہا: دیکھو! یہ عراقی مچھر کے خون کے بارے میں پوچھ رہا ہے اور حالت یہ ہے کہ انہی عراقیوں نے فرزندِ رسولِؐ خدا کو قتل کر دیا۔ میں نے خود رسولِؐ خدا کو یہ کہتے سنا ہے۔ "اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ رَیْحَانَتَایَ مِنَ الدُّنْیَا" یعنی حسنؑ اور حسینؑ دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔

رسولِؐ خدا کا ارشاد ہے:

"حُسَیْنٌ مِّنِّیْ وَ اَنَا مِنْ حُسَیْنٍ، اَحَبَّ اللّٰہُ مَنْ اَحَبَّ حُسَیْنًا، حُسَیْنٌ سِبْطٌ مِنَ الْاَسْبَاطِ"

یعنی حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے۔ جو حسینؑ سے محبت کرتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔ حسینؑ پیغمبر زادہ ہے۔

انس بن حرث کاہلی جو خود بھی صحابی تھے اور ان کے باپ بھی صحابی تھے،

کہا کرتے تھے کہ میں نے خود رسولؐ اللہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اِنَّ اِبْنِیْ (یَعْنِی الْحُسَیْن) یُقْتَلُ بِاَرْضٍ مِنْ اَرْضِ الْعِرَاقِ فَمَنْ اَدْرَکَہٗ فَلْیَنْصُرْہُ۔"

میرا بیٹا حسینؑ سرزمینِ عراق پر قتل کیا جائے گا لہٰذا جو اس وقت موجود ہو اسے چاہیے کہ اس کی مدد کرے۔

رسولؐ اللہ نے جو کچھ فرمایا تھا اس کے آثار ۶۰ھ میں پیدا ہو گئے اور امامؑ بھی شہادت کے لیے تیار ہو گئے لیکن اس طرح نہیں جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جب ان کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہ رہی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اگر وہ اطاعت قبول کر لیتے ہیں تب بھی کسی نہ کسی بہانے قتل کر دیے جائیں گے تو کوئی چارہ نہ ہونے اور زندہ رہنے کا کوئی امکان باقی نہ رہنے کی بنا پر شہید ہونا قبول کر لیا۔ ایسی کوئی بات نہ تھی اور اگر کوئی شخص یہ بات کہے یا لکھے تو اس کا قول ضعیف اور بے بنیاد ہے اور اگر واقعی یہی صورت ہوتی تو امامؑ کے عمل کی کیا قدر و قیمت باقی رہ جاتی اور دنیا اس مقدس تحریک کو کیوں اتنی اہمیت دیتی۔ آپ کی تحریک ان تمام مقدس تحریکوں کا مرکزی نکتہ تھی جو اسلام کی تاریخ میں اٹھیں، چاہے آپ سے پہلے یا آپ کے بعد۔ جن تحریکوں کی رہنمائی زید بن علی، حسین بن زید، صاحبِ نفس ذکیہ، انکے بھائی ابراہیم، حسین شہید فخ اور دوسروں نے کی، وہ سب امام حسینؑ ہی کی تحریک کا تتمہ تھیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک ایسی تحریک کا تجزیہ ان بے بنیاد توجیہات سے کیا جائے؟ اس بارے میں صحیح بات وہی ہے جس کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ۵۶ھ کے اواخر اور ۶۰ھ کے اوائل میں امام حسینؑ نے محسوس کیا کہ

ملت اسلامی کا روحانی زوال اور اخلاقی بگاڑ اب اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ سوائے شہادت کے اصلاح امت کی کوئی اور صورت باقی نہیں رہی۔ ع

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

حقیقت یہ نہیں ہے کہ ان کے زندہ رہنے کی کوئی صورت باقی نہ تھی اس لیے انہوں نے شہید ہونا قبول کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کے زندہ رہنے اور امتِ اسلامی کی بقا کی اب ایک ہی صورت تھی اور وہ تھی خونیں انقلاب! آپ نے طے کیا کہ اگر ملتِ اسلامی کو زندہ رہنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ شَآءَ اَنْ یَّرَاکَ قَتِیْلاً" کے مطابق آپ خود قتل ہو جائیں اور اِنَّ اللّٰہَ شَآءَ اَنْ یَّرَاھُنَّ سَبَایَا کے مطابق آپ کے عزیز، آپ کی بہنیں اور دنیائے اسلام کے بہترین اور بزرگ ترین خطیب عراق اور شام جا کر ملت اسلامی کو اس کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلا کر اسے مرگ و نابودی کے خطرے سے نجات دلائیں اور نہ صرف حسینؑ بن علیؑ سے پیشتر کی مقدس تحریکوں کی روح کو زندہ رکھیں بلکہ آئندہ کی دینی تحریکوں کے لیے بھی راہ ہموار کر دیں۔ ان خطیبوں کے نام یہ تھے: زینبؑ بنتِ علیؑ، ام کلثومؑ بنتِ علیؑ، فاطمہؑ بنت الحسینؑ اور علیؑ بن الحسینؑ۔

جب مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ نے خلیفہ کے حکم سے امامؑ پر دباؤ ڈالا کہ بیعت کر لیں اور ۲۸ رجب کی شب میں ولید کے گھر پر وہ واقعہ پیش آیا جس میں امامؑ نے بیعت نہیں کی اور قطعی فیصلہ اگلے دن اور اس کے بعد پر ملتوی رکھا تو اگلے ہی دن عبداللہ بن زبیر ڈر کے مارے مدینہ سے بھاگ نکلے مگر امامؑ اس دن بھی مدینہ ہی میں رہے۔ تازہ خبر کی جستجو میں گھر سے باہر نکلے تو گلی میں مروان بن حکم سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے کہا کہ حضرت میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ آپ میری

بات مانیں اور جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح کریں۔ امامؑ نے فرمایا کہو کیا کہتے ہو؟ اگر میری بھلائی کی بات ہوگی تو ضرور مان لوں گا۔ مروان نے کہا میری رائے تو یہ ہے کہ آپ یزید کی بیعت کرلیں۔ اس میں آپ کے دین اور دنیا دونوں کی بھلائی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر آپ یزید کو بحیثیت خلیفہ اور امام، ملت اسلامی کا رہبر اور پیشوا تسلیم کرلیں تو آپ کا دین اور دنیا دونوں محفوظ، وگرنہ بیعت سے انکار کیا اور مخالفت اختیار کی تو دین بھی تباہ اور دنیا کا بھی نقصان۔ امامؑ نے مروان کی یہ جسارت آمیز گفتگو سن کر یہ آیت پڑھی "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ"

یہ آیت کسی مصیبت کے موقع پر کسی کو تسلی دینے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔
امامؑ نے جس مصیبت کو یاد کر کے یہ آیت پڑھی وہ مسلمانوں کا فکری بگاڑ تھا یعنی ایک دن مسلمان قوم صحیح راستے اور اپنی فکری روش سے یوں ہٹ جائے گی کہ کہا جائے گا کہ اگر حسینؑ ابن علیؑ یزید کی بیعت کرلیں تو ان کا دین اور دنیا محفوظ ورنہ دونوں ضائع۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

"وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ إِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلَ يَزِيْدَ، وَلَقَدْ سَمِعْتُ جَدِّيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْخِلَافَةُ مُحَرَّمَةٌ عَلٰى آلِ أَبِيْ سُفْيَانَ"

"اگر یزید جیسا شخص اسلام کا محافظ اور مسلمانوں کا رہنما بن جائے تو پھر اسلام کا خدا ہی حافظ ہے۔ میں نے خود اپنے نانا رسولؐ اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خلافت آلِ ابوسفیان پر حرام ہے۔"

اس پہ امامؑ اور مروان کے درمیان بات بڑھ گئی اور آخر مروان پاؤں

پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ بہرصورت امامؑ مدینہ سے مکہ آ گئے۔ آٹھویں ذی الحجہ کو جسے یوم ترویہ بھی کہتے ہیں آپ عازم عراق ہوئے۔ اسی دن وہاں ہانی بن عروہؓ کو گرفتار کیا گیا تھا اور مسلم بن عقیل نے خروج کیا تھا۔ اس موقع پر بیشتر مسلمانوں کو مناسکِ حج چھوڑ کر امامؑ کی روانگی پر بڑی حیرت ہوئی۔

... سکینہؑ
حیدرآباد لطیف آباد، یونٹ نمبر ۸-۹

فرزدق کی امامؑ سے گفتگو

فرزدق اس زمانے کا نامور شاعر تھا۔ اس کا نام اسلامی تاریخ میں مشہور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ۶۰ھ میں، میں اپنی ماں کو حج کرانے لے گیا تھا۔ جب میں سرزمینِ حرم پہنچا تو میں ماں کا اونٹ ہانک رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حسینؑ بن علیؑ ہتھیار سجائے ہوئے مکہ سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے کچھ اونٹ دیکھ کر پوچھا کہ یہ اونٹ کس کے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ حسینؑ بن علیؑ کے ہیں۔ میں امامؑ کی ملاقات سے شرفیاب ہوا تو انھیں سلام کیا اور کہا کہ اللہ آپ کی آرزوئیں بر لائے۔ اے فرزندِ رسولؐ! آپ نے اتنی عجلت کیوں کی کہ اعمالِ حج ادا کیے بغیر حرم سے جا رہے ہیں؟ آپ نے کہا کہ اگر عجلت نہ کرتا تو گرفتار ہو جاتا۔ اس وقت آپ نے پوچھا: تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ ایک عرب ہوں۔ بخدا اس سے زیادہ آپ نے میرے متعلق کوئی تحقیق نہیں کی۔ پھر آپ نے کہا کہ جہاں سے آ رہے ہو وہاں (یعنی عراق) کے لوگوں کے متعلق بھی تمھیں کچھ معلوم ہے؟ میں نے کہا، آپ نے صحیح آدمی سے پوچھا۔ مجھے وہاں کے لوگوں کا حال خوب معلوم ہے۔ ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں آپ کے خلاف! باقی فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ امامؑ نے جواب دیا کہ ہاں یہ سچ ہے، وہی ہوتا ہے

جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اگر قضا و قدر کا فیصلہ وہ ہوا جو ہم چاہتے ہیں تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور شکر کی توفیق بھی اسی کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر قضائے الٰہی نے ہمارا ساتھ نہ دیا تب بھی جس کی نیت نیک ہو اور باطن صاف ہو وہ گھاٹے میں نہیں رہتا۔ فرزدق نے کہا، اللہ آپ کی مراد برلائے اور ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد فرزدق نے امامؑ سے حج سے متعلق کچھ مسائل پوچھے اور جواب باثواب پاکر رخصت ہوا۔

قارئین! امامؑ نے فرزدق سے جو کچھ فرمایا، ذرا اس پر پھر غور کیجیے۔ امامؑ فرماتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی مقصد کے لیے کوشش کرتے ہیں اور کبھی ان کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ میرا مقصد ایسا ہے کہ چاہے کچھ بھی صورت کیوں نہ پیش آئے اور فتح و شکست کسی کی بھی ہو، میرا مقصد ضرور حاصل ہوگا۔ کوئی مال و دولت حاصل کرنے کی فکر میں ہے، کوئی کسب و تجارت کے لیے سرگرداں ہے۔ کوئی عزت اور مرتبہ کا متلاشی ہے۔ کوئی اپنی یا اپنے کسی بیمار عزیز کی صحت کے لیے ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس دوڑتا ہے۔ کوئی شہرت اور نیک نامی کی خاطر نیک یا بظاہر نیک کام کرتا ہے۔ یہ سب ممکن ہے کہ اپنا دلِ مقصود حاصل کرسکیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی تمام محنت اور کوشش رائیگاں چلی جائے کیونکہ آدمی کی ہر خواہش اور ہر آرزو پوری نہیں ہوتی۔ ؎

مَاکُلُّ مَا یَتَمَنَّی الْمَرْءُ یُدْرِکُهٗ
تَجْرِی الرِّیَاحُ بِمَا لَاتَشْتَهِی السُّفُنُ

یعنی آدمی جو چاہتا ہے، ہمیشہ وہی نہیں ہوتا۔ اکثر بادِ حوادث کے

تھپیڑے کشتیِ مراد کو اس کے راستے سے بھٹکا دیتے ہیں۔

اکثر لوگوں کا یہی حال ہے۔ سب اپنے اپنے مقصد کے لیے کوشش کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، کبھی شاہدِ مقصود سے ہم کنار ہو جاتے ہیں، کبھی ناکام رہتے ہیں اور کبھی تو اس کوشش میں جانِ عزیز تک گنوا بیٹھتے ہیں اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔

امامؑ کہتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ آئندہ خواہ کچھ ہو اور عراق کی صورتِ حال کوئی بھی رخ اختیار کرے، میرے مقصد کی کامیابی یقینی ہے۔ میں صرف اس فرض کی انجام دہی کے لیے اٹھا ہوں جو بحالاتِ موجودہ خدا کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ خلیفہ بن جاؤں اور مسلمانوں پر حکومت کروں۔ اگر مجھے کامیابی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر دشمن سبقت لے جاتا ہے، تب بھی میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میری تحریک کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں۔ واقعی مردانِ حق کا کوئی مادی محرک نہیں ہوتا۔ ان کا ہر جہاد اور ہر مقابلہ صرف خدا کے لیے اور ادائیگیِ فرض کی خاطر ہوتا ہے۔ ان کے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ غالب آئیں یا مغلوب ہوں اور یہ تعبیر بھی نارسائیِ الفاظ کی وجہ سے ہے، ورنہ مردانِ حق کی لغت میں تو مغلوب کا لفظ ہی نہیں۔ یہی بات امامؑ نے عراق جاتے ہوئے فرزدق سے کہی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ہمیں کامیابی ہوئی تو ہم خدا کا شکر ادا کریں گے لیکن اگر تقدیر نے ہمارا ساتھ نہ دیا تب بھی چونکہ ہماری نیت نیک ہے ہم فنا نہیں ہوں گے۔ ممکن ہے قتل ہو جائیں لیکن مریں گے نہیں کیونکہ راہِ حق میں شہید ہو جانے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے جان دے دینے اور فنا ہو جانے میں بہت فرق ہے۔

یہی بات امامؑ نے روزِ عاشورا ایک خطبے میں اہل کوفہ سے کہی تھی۔ آپ نے فروہ بن مُسیک مرادی صحابی کے اشعار پڑھ کر اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر کچھ دوست یا دشمن یہ سمجھتے ہیں کہ آج ہماری شکست اور نابودی کا دن ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ آج کا دن ہے جو زندگیٔ جاوید کی تمہید ہے۔

ابنِ طاؤس لکھتے ہیں کہ جب بریر بن خضیر ہمدانی کے وعظ و نصیحت کا لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو امامؑ خود اونٹ پر سوار ہوئے اور سب کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔ جب سب خاموش ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہو گئے تو آپ نے بہ طرزِ شائستہ خدا کی حمد و ثناء کی اور محمدؐ پر، فرشتوں پر اور انبیاءؑ پر درود بھیجا۔ پھر آپ نے فرمایا:

لوگو! افسوس ہے کہ تم نے ہمیں دھوکا دیا۔ تم نے خود فریاد کر کے ہمیں بلایا اور جب ہم تمہاری فریادرسی کے لیے اٹھے تو تم نے وہی تلوار جو ہم نے تمہارے ہاتھ میں دی تھی ہمارے خلاف سونت لی اور وہی آگ جو ہم نے اپنے اور تمہارے مشترک دشمن کو نابود کرنے کے لیے روشن کی تھی تم نے ہمارے خلاف بھڑکا دی اور دشمنوں سے مل کر دوستوں اور خیرخواہوں سے جنگ پر آمادہ ہو گئے حالانکہ نہ تمہارے ساتھ پہلے انصاف ہوا اور نہ آئندہ کوئی امید ہے۔ تم اس وقت ہی قطعی فیصلہ کر لیتے اور ہمارا پیچھا چھوڑ دیتے جب ابھی تلواریں نیام میں تھیں اور لوگ اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ تم اسوقت کیوں ٹڈی کے بچوں کی طرح اڑنے اور پروانوں کی طرح منڈلانے لگے۔ تم پر خدا کی پھٹکار کم ہو! تم نے قرآن کو چھوڑ دیا اور لگے اس کے کلمات میں ردوبدل کرنے۔ تم شیطان

کے ساتھی اور معصیت کے طرفدار ہو۔ کیا تم ہمیں چھوڑ کر ظالموں کا ساتھ دو گے؟ تم ہمیشہ سے ہی بے وفا ہو۔ تمہارا گوشت پوست بے وفائی ہی کا پروردہ ہے۔ تم وہ میوہ ہو جو دوستوں اور خیر خواہوں کے کام نہیں آتا، ان کے گلے میں اٹکتا ہے اور دشمنوں کے گلے سے بآسانی اتر جاتا ہے۔

دوستوں کے گلے میں اٹکنے سے مراد یہ ہے کہ تم یوں تو مدد کا وعدہ کرتے ہو اور جاں نثاری کا دم بھرتے ہو لیکن جب میدانِ کارزار میں امتحان کا وقت آتا ہے تو نہ صرف تمہارے وعدے ہی دھوکا اور فریب ثابت ہوتے ہیں بلکہ تم خود گلے میں ہڈی بنکر پھنس جاتے ہو کہ نہ اُگلی جائے نہ نگلی جائے۔

اس کے بعد امام ؑ نے فرمایا:

"دیکھو اس مادر بخطا (ابن زیاد) نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم دو میں سے ایک راستہ اختیار کریں۔ یا تو تلوار سونت کر میدان میں نکل آئیں یا ذلت و خواری قبول کر لیں تا کہ اسکا جو جی چاہے میرے ساتھ کرے لیکن ہم ہرگز ذلیل نہیں ہو سکتے۔ خدا، اس کے رسول ؐ اور مردانِ باایمان کو ہماری بے عزتی منظور نہیں ہو سکتی۔ ہم نے پاک اور باغیرت ہستیوں کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ ہمیں شریفوں کی موت منظور ہے، کمینوں کی اطاعت قبول نہیں۔ اگرچہ میرے دوستوں اور مددگاروں کی تعداد کم ہے مگر میں انہی چند ساتھیوں کے ساتھ پیش قدمی کروں گا۔"

اس موقع پر امام ؑ نے فروہ بن مسیک مرادی کے چند اشعار پڑھے جن کے ایک ایک لفظ سے روحانی عظمت و بلندی کی ایک دنیا آشکار ہے:

۱۔ اگر ہم کامیاب ہوتے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں۔ کامیابی ہمیشہ ہی ہمارے قدم چومتی رہی ہے لیکن اگر ہم شکست سے بھی دوچار ہو جائیں تب بھی ہم کبھی مغلوب نہیں ہوں گے۔

۲۔ ہم بزدل نہیں ہیں لیکن اگر مقدر میں یہی ہو کہ ہمیں موت آئے اور دوسروں کو حکومت مل جائے تو کیا ہو سکتا ہے۔

۳۔ موت کا یہی کاروبار جاری ہے، آج ایک کی کل دوسرے کی باری ہے۔

۴۔ ہمارے سردارانِ قوم بھی ایسے ہی موت کا شکار ہوئے جیسے اگلے وقتوں کے لوگ۔

۵۔ اگر شاہانِ عالم کو زندگانیٔ جاوید ملا کرتی تو ہم بھی کبھی نہ مرتے۔ اگر بڑے لوگ موت کے پنجے سے بچ سکتے تو ہم بھی بچ جاتے۔

۶۔ ہم پر ہنسنے والوں سے کہہ دو کہ ذرا ٹھہرو۔ تمہارا بھی یہی انجام ہونا ہے۔

امامؑ ایمان واخلاص اور عزم مصمم کی اس روح سے سرشار مکہ سے عراق روانہ ہوئے۔ آپ کو خوب معلوم تھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور انجام کیا ہوگا مگر دوسروں کو حتیٰ کہ امامؑ کے عزیز واقارب اور ارادتمندوں کو یہ پریشانی تھی کہ کہیں حالات نامساعد نہ ہو جائیں اور حالات ایسا رخ اختیار نہ کرلیں کہ آخر امامؑ شہید ہو جائیں۔ امامؑ خود تو شہادت ہی کے لیے جا رہے تھے مگر دوست اور وابستگانِ دامن یہ کہہ رہے تھے کہ حضور مت جائیے، خدانخواستہ کہیں جان نہ چلی جائے۔

ان ہی میں امیرالمومنینؑ کے بھتیجے اور داماد عبداللہ بن جعفر بھی تھے۔ امامؑ کی مکہ سے روانگی کے بعد اپنے بیٹوں عون اور محمد کو ایک عریضہ دیکر بھیجا کہ امامؑ کی

خدمت میں پیش کردیں' اس میں امامؑ کو قسم دیگئی تھی کہ واپس تشریف لے آئیں۔ لکھا تھا کہ مجھے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں آپ اور آپ کے ہمراہی شہید نہ ہو جائیں۔ اگر آج آپ کی جان جاتی رہی تو دنیا اندھیر ہو جائے گی کیونکہ آپ ہی کی بدولت لوگوں کو ہدایت ملتی ہے اور مومنین کی سب امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں اس لیے جلدی نہ کیجیے۔ عریضے کے پیچھے میں خود آرہا ہوں۔ اس کے بعد عبداللہ بن جعفر' والئ مکہ کے بھائی کی معیت میں جو اپنے بھائی عمرو بن سعید کا خط لیے ہوئے تھے' روانہ ہوئے۔ اس خط میں عہد و پیمان کے ذریعے امامؑ کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ وہ آسودہ خاطر مکہ لوٹ آئیں۔ دونوں امامؑ کی خدمت میں پہنچے اور خط پیش کیا۔ واپسی کے لیے اصرار کرتے رہے۔ امامؑ نے جواب میں کہا کہ میں نے اپنے نانا رسولؐ خدا کو خواب میں دیکھا ہے اور آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہ راستہ اختیار کروں۔ انھوں نے پوچھا آپ نے کیا خواب دیکھا ہے؟ امامؑ نے کہا میں اپنا خواب تو زندگی بھر کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ عبداللہ بن جعفر مایوس ہو کر لوٹ آئے البتہ اپنے بیٹوں عون اور محمد کو ہدایت کی کہ امامؑ کی خدمت میں رہیں اور ان کے ساتھ عراق جائیں۔ یہ دونوں روزِ عاشورا شہید ہوئے۔

امامؑ نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ کوفہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہاں سے آپ نے اہل کوفہ کو ایک خط لکھا اور قیس بن مسہر کے ہاتھ بھیج دیا۔ ابھی تک مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر آپ تک نہیں پہنچی تھی۔ اس خط میں آپ نے لکھا کہ مسلم بن عقیل کا خط مجھے مل گیا ہے۔ تمہاری بیعت' خلوص اور راہِ حق میں ہماری امداد کے عزم سے آگاہی ہوئی۔ خدا کرے تم ہمارے ساتھ نیکی سے دریغ نہ کرو اور اللہ تمہیں اس خلوص اور عزم کا اجرِ عظیم عطا کرے۔ میں آٹھویں ذی الحجہ

بروزِ ترویہ مکہ سے روانہ ہو چکا ہوں۔ فرستادہ کے کوفہ پہنچنے پر پہلے سے بھی زیادہ حصولِ مقصد کے لیے کوشش شروع کر دو۔ خدا نے چاہا تو میں بھی چند ہی روز میں پہنچ رہا ہوں۔

قیس، امامؑ کا خط لیکر روانہ ہو گئے لیکن کوفہ کے قریب ہی گرفتار ہو گئے۔ انہیں ابن زیاد کے روبرو لے جایا گیا۔ ابن زیاد نے ان سے کہا کہ منبر پر چڑھ کر حسینؑ بن علیؑ کو گالیاں دو۔ قیس منبر پر گئے۔ حمد و ثنا کے بعد کہا۔ اے لوگو! سمجھ لو کہ حسین بن علیؑ بہترین خلائق اور دخترِ رسولؐ فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ میں انہی کا بھیجا ہوا ہوں۔ تم سب ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ پھر عبیداللہ اور اس کے باپ پر لعنت اور علیؑ بن ابی طالبؑ پر درود بھیجا۔ عبیداللہ نے حکم دیا کہ انھیں چھت پر سے نیچے پھینک دیا جائے تاکہ ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں۔

امامؑ کوفہ کی طرف بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ منزلِ زُرود میں مسلم اور ہانی کی شہادت کی خبر ملی۔ آپ نے خبر سن کر فرمایا: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن بار بار ان دونوں پر رحمت کی دعا کرتے رہے۔ عُذَیبُ الھِجَانات کے پڑاؤ پر پہنچ کر قیس بن مسہر کی شہادت کی اطلاع ملی۔ آپ نے ان کے لیے بھی دعائے مغفرت کی۔ زبالہ کے پڑاؤ پر پہنچ کر آپ نے اپنے ہمراہیوں کو مسلم اور ہانی کی شہادت اور کوفہ کے حالات سے آگاہ کیا اور فرمایا کہ ہمارے متوقع حامیوں نے ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اب جس کا دل چاہے، اپنی راہ لے۔ یہ موقع تھا کہ امامؑ کے اکثر ہمراہی ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ صرف تھوڑے سے باقی رہ گئے۔
مشہور مؤرخ، مفسر اور فقیہ محمد بن جریر طبری نے اپنی مشہور کتاب تاریخ الامم والملوک میں بیان کیا ہے کہ امامؑ نے منزل ذی حسم میں خطبہ دیا اور مختصر تقریر کی۔ اس میں آپ

نے اپنے قیام کا محرک زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا اور شہادت کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا:

"تم دیکھ رہے ہو کہ حالات کیا ہیں۔ دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ اس نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ بے مہری کا آغاز ہو گیا ہے اور وقت تیزی سے گزر رہا ہے صرف زندگی کی تلچھٹ باقی رہ گئی ہے۔ دنیا ایسی چراگاہ بن گئی ہے جس میں سوائے بیمار گھاس کے کچھ نہیں۔"

امامؑ نے اس وقت کے حالات کو برا کیوں قرار دیا۔ آپ کو کس بات کی شکایت اور افسوس تھا؟ یہ راز آپ نے اگلے جملے میں بیان کیا۔ زندگی کی گراں باری، خشک سالی یا امن و راحت کے فقدان کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ وہ کچھ اور ہی بات تھی جس نے زندگی کو تلخ اور ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ ذرا غور کیجیے، یہ وہ وقت تھا کہ دشمن کا ہراول دستہ پہنچ گیا تھا اور خطرہ تھا کہ امامؑ کو عراقی لشکر گھیرے میں نہ لے لے لوگ یہی سوچتے تھے کہ کاش امامؑ یہ کام نہ کرتے اور تنہا اس راہ میں قدم نہ رکھتے شاید کچھ کوتاہ نظر یہ بھی خیال کر رہے ہوں کہ امامؑ بھی یہی سوچ رہے ہوں گے اور اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے اس لیے ضروری تھا کہ امامؑ کسی حد تک اپنے قیام کی غایت پر سے پردہ اٹھائیں اور واضح کریں کہ وہ کیا چیز ہے جو انہیں سخت ناپسند ہے اور جس نے ان کا جینا دشوار کر دیا ہے۔

اسی لیے انھوں نے اس مختصر خطبے میں مندرجہ بالا الفاظ کے بعد یہ کہا:

کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟ دراصل آپ ان لوگوں کو جواب دے رہے تھے جو کہتے تھے کہ آپ بیعت کیوں نہیں کر لیتے، موجودہ اسلامی حکومت کو باضابطہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے

فرزند زادۂ ابوسفیان کو اسلامی دنیا کا قائد اور امام کیوں نہیں مان لیتے ؟

آپ نے فرمایا: کیا تم مسلمانوں کی موجودہ حالت نہیں دیکھتے ؟ یہ نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے! یہ نہیں دیکھتے کہ امامت و خلافت کی بنیاد پیروئ رسولؐ پر نہیں رہی، مسلمانوں کی رہبری و پیشوائی کا مدار اب حق و انصاف کی بجائے ظلم اور ترویجِ ظلم پر ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

ان حالات میں مومن کو لقائے پروردگار کا آرزومند ہونا چاہیے۔ میں موت کو کامیابی اور ظلم کے ماحول میں زندگی کو تکلیف دہ سمجھتا ہوں۔ مسجد الحرام کے خطبے میں بھی مرگ و شہادت کی بات تھی، ساتھ ہی جاں بازی و فداکاری کا تذکرہ تھا۔ اس مرتبہ بھی شہادت کی بات ہے، ساتھ ہی زندگی سے دل سردی اور افسردگی بھی۔ آپ نے فرمایا کہ ظالموں کے ساتھ زندگی کا نتیجہ سوائے تکلیف اور رنج کے کچھ نہیں۔ جو کچھ امامؑ نے اس موقع پر اجمالاً بیان کیا، اس کی وضاحت حر بن یزید سے ملاقات میں کی۔

امامؑ عالیمقام کا خطبہ

حر بن یزید ریاحی ایک ہزار سواروں کے دستے کے ساتھ امامؑ کو گرفتار کرنے کوفہ سے آئے تھے۔ پہلی محرم ۶۱ھ کو حرؑ اور ان کے ساتھیوں سے امامؑ کا سامنا ہوا۔ آپ نے انہیں پانی پلوایا۔ جب ظہر کا وقت ہوا تو حجاج بن مسروق جعفی نے جو شہدائے عاشورا میں سے ہیں، امامؑ کے حکم سے اذان دی۔ امامؑ خیمے سے باہر آئے اور اذان و اقامت کے درمیانی عرصے میں ان سے گفتگو کی۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد کہا:

"لوگو! میں تمہارے پاس اس وقت آیا ہوں جب تم نے مجھے خطوط لکھے اور میرے بلانے کے لیے ایلچی بھیجے اور کہا کہ ہمارا کوئی امام نہیں۔ آپ آئیے، شاید آپ کے وسیلے سے اللہ ہمیں حق اور ہدایت پر مجتمع کردے۔ اب اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں آگیا ہوں، تم مجھ سے ایسا عہدو پیمان کرو جس سے مجھے اطمینان ہو جائے اگر تم ایسا نہیں کرتے اور تمہیں میرا آنا پسند نہیں تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاتا ہوں۔"

یہ سن کر سب لوگ چپ ہو گئے۔ کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ حجاج نے امامؑ کے حکم سے نماز کے لیے اقامت کہی۔ دونوں طرف کی فوج نے امامؑ کے پیچھے نماز باجماعت ادا کی۔ کچھ دیر آرام کے بعد جب عصر کا وقت ہوا تو عصر کی نماز بھی اسی طرح جماعت سے پڑھی۔ نماز کے بعد امامؑ نے پھر ایک بار اصحابِ حُر سے گفتگو کی اور کہا:

"لوگو! اگر تم خدا سے ڈرتے ہو اور حقدار کا حق پہچانتے ہو تو اللہ تم سے خوش ہوگا۔ ہم اہل بیتِ محمدؐ امامت و خلافت کے ان لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں جو آج اس کے ناحق دعویدار بنے ہوئے ہیں اور تم پر ظلم توڑ رہے ہیں لیکن اگر تم ہمیں پسند نہیں کرتے، ہمارے حق کا اعتراف نہیں کرتے اور اس وقت سے جب تم نے خط لکھے تھے اور قاصد بھیجے تھے، تمہاری رائے بدل گئی ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔"

حق سے امامؑ کی مراد یہ نہیں تھی کہ مثلاً اپنی عمارت بناتے وقت ہمسائے

کی دیوار نہ گراؤ یا دوسرے کو دھکا دیکر بس میں نہ چڑھو۔ امامؑ کی مراد وہ حق ہے جس پر تمام حقوق کی بنیاد ہے۔ اگر وہ حق محفوظ ہے تو تمام حقوق محفوظ ہیں۔ اگر وہ حق ضائع ہو گیا تو تمام حقوق پامال ہو جائیں گے یعنی امامت اور مسلمانوں کی رہبری کا حق۔

حر بن یزید ریاحی نے جواب میں عرض کی کہ بخدا مجھے ان خطوط اور قاصدوں کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ امامؑ نے عقبہ بن سمعان سے جو روزِ عاشورا اسیر ہوئے اور بعد میں رہا کر دیے گئے، فرمایا کہ اہل کوفہ کے خطوط ان کے سامنے رکھ دو۔ پھر بھی حر نے کہا ہم نے کوئی خط نہیں لکھا اور ہم آپ کو ابنِ زیاد کے پاس لے جائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ امامؑ نے فرمایا: موت سے پہلے تو یہ ممکن نہیں۔ امامؑ اپنے اصحاب کے ساتھ اور حُر اپنے ساتھیوں کے ساتھ سوار ہوئے اور ایک ایسے راستے پر ہو لیے جو نہ مدینہ جاتا تھا اور نہ کوفہ۔ اسی اثنا میں حُر نے اپنے خیال میں بغرض خیر خواہی و نصیحت امامؑ سے کہا کہ آپ کو خدا کی قسم آپ جنگ نہ کیجیے ورنہ آپ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ امامؑ نے برافروختہ ہو کر کہا، کیا تم مجھے موت کی دھمکی دے رہے ہو؟ کیا میرے مارے جانے سے تمہیں چین آجائے گا؟ میرا جواب وہی ہے جو اس مردِ اوسی نے دیا تھا جو رسولِ خداؐ کی مدد کے لیے جانا چاہتا تھا، اس کے چچا زاد بھائی نے اسے ڈرایا کہ کہاں جا رہے ہو، مارے جاؤ گے۔ اوسی نے جواب میں کہا:

"میں ضرور جاؤں گا۔ حق کے لیے جہاد کرتے ہوئے جان دینا، اچھے لوگوں کا ساتھ دینا اور کم مایہ اور مجرموں سے دور رہنا کوئی شرم کی بات نہیں۔ اگر میں زندہ رہا تو مجھے کوئی پشیمانی نہیں ہوگی اور اگر مر گیا تو کوئی الزام نہیں دے سکے گا۔ ذلت کی بات تو یہ ہے کہ آدمی زندہ رہے اور بے بسی کی زندگی گزارے۔"

امام حسینؑ اور حُر بن یزید ریاحی اپنے اپنے ساتھیوں سمیت منزل بیضہ پہنچے۔ یہاں بھی امامؑ نے ان سے گفتگو کی اور واضح کیا کہ میرا کچھ فرض ہے جس کی انجام آوری ضروری ہے، اس کے علاوہ میرا کوئی خیال نہیں۔ یہاں آپ نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ ہے: یزید ایک ظالم و جابر خلیفہ ہے۔ جن باتوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے وہ انھیں حلال سمجھتا ہے۔ خدا کے عہد کو توڑتا ہے اور سنتِ رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے۔ بندگانِ خدا پر ظلم روا رکھتا ہے۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے کہ ایسے خلیفہ کو جو باز رکھنے کی کوشش نہیں کریگا اس کا حشر بھی اس خلیفہ کے ساتھ ہوگا۔

اسی مضمون کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ ہے۔ فرمایا گیا ہے:

"وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ"

"ہم نے ان میں سے کچھ پیشوا اور امام ایسے بنائے ہیں جو اپنے پیروکاروں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں"

یعنی سب پیشوا اور رہبر اپنے پیروکاروں کو بہشت کی طرف نہیں لے جاتے۔ کچھ رہبر تو ایسے ہیں جو اپنی قوم کی واقعی رہبری کرتے ہیں اور دنیا و آخرت میں اس کی سعادت، خوش بختی اور اوج و ترقی کا باعث بنتے ہیں لیکن تجربہ بتلاتا ہے اور قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ کچھ رہبر درحقیقت رہزن ہیں۔ یہ وہ امام ہیں جو اپنے ماموین کو آتشِ دوزخ اور دنیا و آخرت کی حتمی بربادی کی طرف لے جاتے ہیں۔ یزید بھی انہی میں سے ایک تھا۔

اس کے بعد امام حسینؑ نے مزید وضاحت کی اور اس وقت یعنی ۶۰ھ کے حالات پر روشنی ڈالی۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ یعنی کارگزارانِ خلافت بنی امیہ شیطان کی پیروی اور اطاعت کرتے ہیں اور جتنی شیطان کی اطاعت کرتے ہیں اسی نسبت

سے خدا کی اطاعت سے دور ہٹتے جاتے ہیں۔ کھلم کھلا دھاندلی مچائی ہوئی ہے۔ حدود اللہ کو معطل کر رکھا ہے مسلمانوں کے مال پر تصرف بیجا کر کے اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ بیت المال جو مسلمانوں کی عام فلاح و بہبود کے لیے تھا اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لیا ہے۔ جن کاموں کو اللہ نے حرام قرار دیا تھا انہیں حلال سمجھنے لگے اور جنہیں حلال قرار دیا تھا انھیں حرام ٹھہرا دیا۔ اب جبکہ یہ صورت ہے تو حسب فرمانِ رسولؐ اس حالت کو بدلنے کی ذمے داری مجھ سے زیادہ کس کی ہو سکتی ہے کیونکہ میں فرزندِ فاطمہؑ ہوں۔ اہلِ آیۂ تطہیر ہوں، اہلِ آیۂ مباہلہ ہوں، شاگردِ فرزندِ امیر المومنینؑ ہوں۔ یہ میرا کام ہے کہ میں امتِ اسلامیہ کے زوال کے اسباب کو دور کردوں۔

واقعی حسینؑ ابن علیؑ کا سا کارنامہ اور کون انجام دے سکتا تھا؟ ان کے جیسے اصحاب اور کسے میسر آسکتے تھے؟ اس تحریک میں ان کی جگہ اور کون لے سکتا تھا؟

ابن عباسؓ بڑے عالم اور قرآن مجید کے بڑے مفسر تھے۔ رسولِ خدا کے ممتاز صحابی اور چچا زاد بھائی تھے مگر کیا وہ، وہ کام انجام دے سکتے تھے جو حسینؑ ابن علیؑ نے انجام دیا۔

محمد بن حنفیہ برادرِ حسینؑ اور فرزندِ علی بن ابی طالبؑ تھے لیکن وہ اس تحریک کے مردِ میدان نہیں تھے۔

حبیب ابنِ مظاہر اسدی صحابی تھے لیکن امام حسینؑ کا سا کارنامہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی حال مسلم بن عوسجہ کا تھا اور یہی ہانی بن عروہ مرادی کا۔ امام کے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل، آپ کے برادرِ عالی قدر حضرت ابوالفضل العباسؑ آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت علی اکبرؑ یہ سب وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنھوں نے

اس عظیم اسلامی تحریک میں حیرت انگیز جرأت اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا۔ امامؑ سے پورا تعاون کیا لیکن کیا ان میں سے کوئی بھی اپنی بلند و بالا شخصیت کے باوجود اس تحریک کا مرکزی نقطہ بن سکتا تھا؟ اس روحانی تحریک کی مرکزی طاقت اور اخلاقی قوت دراصل امام حسینؑ کی شخصیت میں ہی پنہاں تھی۔ آپ ہی کی روحانی طاقت نے آخری مرحلے تک اس تحریک کی رہنمائی کی اور اپنے پسماندگان کو بھی اسیری کے آخری مرحلے تک رہبری و رہنمائی کے لیے آمادہ کیا۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

"تمہاری تحریریں اور تمہارے قاصد میرے پاس آئے اور انھوں نے تمہاری بیعت اور تمہاری پختگی کا حال بیان کیا۔ تم نے لکھا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ اب اگر تم اپنی بیعت اور اپنے فیصلے پر قائم ہو اور جیسا کہ تم نے لکھا تھا میرا ساتھ نہیں چھوڑتے تو تم خوش بختی و کامرانی سے بہرہ ور ہو گے کیونکہ میں فرزندِ علیؑ و فاطمہؑ ہوں۔ میں خود اس جہاد مقدس میں تمہارے ساتھ رہونگا میرے بیوی بچے تمہارے بیوی بچوں کے ساتھ ہر حال میں شریک ہوں گے۔ تمھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جانیں میری اور میرے بیوی بچوں کی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھو۔ جب میں اپنی جان اور اپنے خاندان کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، تو تم بھی اپنی جان اور اپنے خاندان سے دریغ نہ کرو۔

یعنی جب مجھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر اپنی جان جانے اور اپنے زن و فرزند کے اسیر ہو جانے کی پروا نہیں اور میں اپنے عزیزوں کو اپنے ساتھ لایا ہوں تو تمہارے لیے اب کیا گنجائش ہے؟

تمھارا بھی فرض ہے کہ تم اپنے امامؑ کی پیروی کرو۔ راہِ حق میں جاں نثاری سے دریغ نہ کرو۔ جان کی قربانی اور قید و بند کی مصیبت سے نہ گھبراؤ اور امامِ وقت اور فرزندِ پیمبرؐ کی ہمراہی سے پیچھے نہ ہٹو۔

لیکن اگر ان سب باتوں کے باوجود تم نے پیمان شکنی کی اور ایفائے عہد میں کوتاہی کی تو جان عزیز کی قسم مجھے ذرہ بھر حیرت نہیں ہو گی کیونکہ تم نے میرے والد علی مرتضیٰؑ، میرے بھائی حسن مجتبیٰؑ اور چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کیساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ ایسا کرنے سے خود تمھارا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ تم خوش بختی اور سعادت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ سے گنوا دو گے پیمان شکن ہمیشہ خود نقصان اٹھاتا ہے اور ممکن ہے خدا جلد ہی مجھے تم سے بے نیاز کر دے۔

یہ خطبہ امامؑ نے حُر کے ایک ہزار ساتھیوں کے سامنے دیا۔ کان تو سب کے لگے ہوئے تھے لیکن دل پر ایک ہی کے اثر ہوا جس نے چند روز بعد دکھا دیا کہ امامؑ کی بات اچھی طرح اس کے دلنشیں ہو گئی تھی۔ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

وہ ایک خود حُر بن یزید ریاحیؓ تھے جو صبح عاشور عمر بن سعد کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ کیا واقعی تم حسینؑ بن علیؑ سے جنگ کرو گے؟ اس نے کہا بخدا ضرور کروں گا اور وہ بھی بہت سخت قسم کی۔ حُر نے کہا کہ اگر امامؑ کی کوئی تجویز مان لو تو کیا حرج ہے؟ ابن سعد بولا کہ اگر مجھے اختیار ہوتا تو کوئی حرج نہیں تھا، میں ضرور مان لیتا مگر کیا کروں ابن زیاد، حسینؑ بن علیؑ کی کوئی تجویز ماننے پر آمادہ

نہیں۔ اس پر اس مردِ خوش انجام کی عقل اور اسکے نفس میں کشمکش شروع ہوگئی۔ ایک طرف روحانی قوت تھی دوسری طرف شیطانی وسوسے۔ آخر اس ملکوتی شعلے نے جو امامؑ کی گفتگو نے اس کے دل میں روشن کر دیا تھا باطل کے خس و خاشاک کو جلاکر خاکستر کر دیا اور اس کی سعید روح نے فیصلہ کر لیا کہ راہِ خدا ہی اختیار کرنی چاہیے۔

اس نے کہا بخدا میں ایسے دوراہے پر پہنچ گیا ہوں جہاں سے ایک راستہ جنت کو جاتا ہے، دوسرا جہنم کو۔ اگر میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر کے جلا بھی دیجائے تب بھی میں جنت پر کسی چیز کو ترجیح نہیں دوں گا۔ یہ کہکر امامؑ کی خیمہ گاہ کا راستہ لیا۔ وہاں پہنچ کر اپنی خطاؤں کا اعتراف کیا اور راہِ راست اختیار کر لی۔ حرؑ نے کہا خدا جانتا ہے، مجھے معلوم نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اب میں توبہ کے خیال سے آیا ہوں، معلوم نہیں میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ امامؑ نے کہا، ہاں خدا تیری توبہ قبول کرے گا اور تیری خطائیں معاف کر دیگا۔

درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

امامؑ نے پوچھا: تمھارا نام کیا ہے؟ کہا حرؑ بن یزید۔ امام نے کہا: "اَنْتَ حُرٌّ کَمَا سَمَّتْکَ اُمُّکَ" تم واقعی اسم بامسمّٰی ہو۔ تم بندۂ آزاد ہو کیونکہ تمھاری ماں نے تمھارا نام حرؑ رکھا تھا جس کے معنی ہیں آزاد۔ تم دنیا و آخرت میں آزاد ہو۔ اب سواری سے اتر آؤ۔ حرؑ نے کہا، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں کچھ دیر ان سواروں سے لڑوں اور شہادت سے سرفراز ہو کر ہی اتروں۔ امامؑ نے کہا۔ خدا تمھاری مدد کرے جیسے دل چاہے کرو۔ حرؑ واپس اہل کوفہ کے پاس گئے اور ان لوگوں سے، جو ابھی کچھ دیر پہلے ان کے ہمدم و ہمباز تھے یوں گفتگو شروع کی۔

اے اہلِ کوفہ! تمھیں موت آجائے اور تمھاری مائیں تمھیں روئیں۔ پہلے تو تم نے خود اس بندۂ خدا کو دعوت دیکر بلایا اور جب اس نے تمھاری دعوت قبول کر لی اور تمھارے پاس آگیا تو تم اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ کل تم نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی خاطر جان دیدو گے لیکن آج تم نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے اور اس کے سامنے تلواریں سونت کر کھڑے ہو گئے ہو۔ تم نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے اور سانس تک لینے کا راستہ بند کر دیا ہے۔ تم ہر طرف سے اس پر دباؤ ڈال رہے ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ خدا کی وسیع زمین میں کہیں اسے اور اسکے اہلِ خاندان کو پناہ مل سکے۔ تم نے اسے قیدی بنا کر بے بس کر دیا ہے۔ دریائے فرات کا پانی جو مسلم اور غیر مسلم سب پیتے ہیں اور جس میں صحرائی جانور نہاتے ہیں، تم نے اس پر، اس کے بیوی بچوں پر اور اس کے دوستوں پر بند کر رکھا ہے درآنحالیکہ پیاس کے مارے ان کا برا حال ہے۔ تم نے رسولؐ خدا کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا ہے۔ اگر تم اب بھی توبہ کر کے ان کے قتل کے ارادے سے باز نہ آئے تو روزِ محشر خدا بھی تمھاری پیاس نہیں بجھائے گا۔

یہ تھی گفتگو اس مردِ سعادت مند و خوش انجام کی جس نے ایک دن امامؑ کا راستہ روکا تھا، ان کے زن و فرزند کو ہراساں کیا تھا اور ابن زیاد کے حکم پر انھیں بیابان میں اترنے پر مجبور کیا تھا۔ دوسری تاریخ سے دس محرم کی صبح تک امامؑ کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم میں اس کی حالت بدل گئی۔ روحانی انقلاب آگیا اور یک بیک دل شہادت کے لیے تڑپنے لگا۔ راہِ حق میں جاں نثاری

کا ایسا متوالا ہوا کہ سب اندیشۂ سود و زیاں بھلا کر سعادتِ ابدی کے حصول کے درپے ہوگیا۔ سچ ہے، "بن مانگے موتی ملے، مانگے ملے نہ بھیک" فرمان خداوندی ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (سورۃ بقرۃ آیت ۲۵۷)

"اللہ مومنوں کا حامی ہے، انھیں تاریکی سے نکال کر نورِ ہدایت دکھاتا ہے۔"

وہی دستِ غیبی جو نااہلوں کو حریم نیک نامی سے دھکے دیکر نکال دیتا ہے۔ سعید روحوں کو میدانِ شہادت میں کھینچ لاتا ہے اور دشمن کی فوج کے ایک سالار حرؑ بن یزید کو حبیب بن مظاہر اسدی، بریر بن خضیر ہمدانی بلکہ علیؑ بن الحسینؑ اور قاسم بن الحسنؑ کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔

امام حسینؑ کا کربلا میں ورود

ماہِ محرم ۶۱ھ کی دوسری تاریخ کو پنجشنبہ کے دن امام حسینؑ نواحِ نینویٰ میں کربلا کے مقام پر پہنچے۔ اگلے دن عمر بن سعد بن ابی وقاص زہری چار ہزار کی نفری کے ساتھ کوفہ سے آ پہنچا اور امامؑ کے بالمقابل پڑاؤ ڈال دیا۔ عمر بن سعد کا تعلق قبیلۂ قریش کی بنی زہرہ شاخ سے تھا اور جنابِ رسولِ خداؐ کی والدہ حضرت آمنہؑ کا قریبی عزیز تھا اور اس کے والد سعد بن ابی وقاص ان پانچ آدمیوں میں سے ایک تھے جو رسولِ خداؐ کی بعثت کے آغاز میں ابوبکر سے واقفیت کی بنا پر مسلمان ہوئے تھے۔ سعد بن ابی وقاص کا نام فتوحاتِ اسلامی کے سلسلے میں تاریخ اسلام میں مشہور و ممتاز ہے۔ عمر بن سعد نے کسی کو امامؑ کے پاس بھیج کر

معلوم کرایا کہ آپ عراق کیوں آئے ہیں ؟ آپ نے جواب میں فرمایا: عراقیوں نے خود خط لکھ کر مجھے بلایا ہے ۔ اب اگر تمھیں میرا آنا ناپسند ہو تو میں حجاز واپس چلا جاتا ہوں ۔ ابنِ سعد نے اسی مضمون کا خط ابنِ زیاد کو لکھ دیا اور جو کچھ امامؑ نے فرمایا تھا اس کی اطلاع دیدی ۔ ابنِ زیاد نے کہا کہ اب جبکہ وہ ہمارے پنجے میں آ گیا ہے، پھر بھی بچ نکلنے اور حجاز واپس چلے جانے کی آس لگائے ہوئے ہے، اب چھوڑ دینے کی کوئی صورت نہیں ۔ پھر ابن سعد کو لکھا : میں نے تمھارا خط پڑھا ۔ مضمون سے آگاہی ہوئی ۔ حسینؑ ابن علیؑ سے کہو کہ وہ خود اور ان کے سب ہمراہی یزید کی بیعت کر لیں ۔ جب بیعت مکمل ہو جائے گی تب ہم ان کے بارے میں کچھ فیصلہ کریں گے ۔ اس کے فوراً ہی بعد ابنِ زیاد کا ایک اور خط پہنچا کہ حسینؑ اور ان کے ہمراہیوں کا پانی بند کر دو تاکہ انھیں پینے کے لیے ایک قطرہ پانی نہ مل سکے ۔ عمر نے فوراً عمرو بن حجاج کو چار ہزار سوار دے کر بھیجا کہ ابو عبداللہ اور فرات کے درمیان حائل ہو جائیں اور امامؑ کا پانی کاٹ دیں ۔ یہ واقعہ امامؑ کی شہادت سے تین روز پہلے پیش آیا ۔ امامؑ نے ابنِ سعد کو ملاقات کرنے کے لیے بلایا ۔ رات کو دونوں لشکروں کے درمیان ملاقات اور گفتگو ہوتی رہی ۔ عمر بن سعد نے اپنے خیمے میں واپس جا کر ابن زیاد کو خط لکھا کہ خدا نے جنگ کی آگ کو بجھا دیا ۔ ہمارے مابین اتفاق رائے ہو گیا ہے اور معاملہ قومی مصلحت کے مطابق طے پا گیا ہے ۔ اب حسینؑ بن علیؑ اس بات پر آمادہ ہیں کہ حجاز واپس چلے جائیں یا کسی اسلامی سرحد کے لیے روانہ ہو جائیں ۔ اس کے بعد ابنِ زیاد کو رام کرنے کے لیے ایک آدھ جملہ بطورِ دروغِ مصلحت آمیز بھی بڑھا دیا ۔ یہ خط ملنے پر ابنِ زیاد کچھ نرم پڑا اور ابن سعد کی تجویز مان لینے پر آمادہ ہو گیا مگر وہاں شمر بن ذی الجوشن بھی موجود تھا ۔ اس نے کہا تم غلطی کر رہے ہو ۔

اس موقع کو غنیمت سمجھو اور اب جبکہ حسینؑ ابن علیؑ تمہارے قابو میں آگئے ہیں
انھیں مت چھوڑو ورنہ پھر ایسا موقع نہیں ملے گا۔ ابن زیاد نے کہا کہتے تو سچ ہو۔
اب تم خود کربلا جاؤ اور میرا یہ خط ابن سعد کو پہنچاؤ کہ حسینؑ اور ان کے ہمراہی بغیر کسی
شرط کے ہتھیار ڈال دیں اور پھر انھیں کوفہ بھیج دیا جائے، اگر وہ انکار کریں تو ان
سے جنگ کی جائے۔ اگر ابن سعد نہ مانے اور حسینؑ ابن علیؑ سے لڑائی کے لیے تیار
نہ ہو تو تم خود فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لو اور ابنِ سعد کا سر کاٹ کر میرے پاس
بھیج دو۔ اس کے بعد ابن سعد کو لکھا کہ میں نے تمھیں اس لیے نہیں بھیجا کہ تم
حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ کوئی رو رعایت کرو یا مجھ سے ان کی سفارش کرو اور
ان کی زندگی و سلامتی کی راہ ہموار کرو۔ اب دیکھو اگر وہ خود اور انکے ساتھی
مان جائیں تو انھیں میرے پاس بھیج دو اور اگر انکار کریں تو ان پر حملہ کردو اور
انھیں قتل کر کے ان کے ناک کان کاٹ لو کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔ اگر حسینؑ
بن علیؑ قتل ہو جائیں تو ان کی لاش کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کردو کیونکہ
وہ ایک مہم جو، حق ناشناس اور ظالم شخص ہیں۔ میرا مدعا یہ نہیں کہ مرنے کے
بعد انھیں کوئی صدمہ پہنچے مگر میں نے ایک بات کہی ہے اور عہد کیا ہوا ہے کہ
اگر وہ قتل ہوں گے تو ان کی لاش کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کرونگا۔ میں
نے جو حکم دیا ہے، اب اگر تم اس پر عمل کرو گے تو تمھیں اس کا صلہ دونگا۔ اگر
تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو لشکر سے الگ ہو جاؤ اور اسے شمر بن ذی الجوشن
کے سپرد کردو۔ میں نے اسے ضروری ہدایات دیدی ہیں۔

جب ابن زیاد نے یہ خطرناک فرمان لکھ کر شمر کو دیا تو ام البنین کے بھتیجے
عبداللہ بن ابی المحل بن حزام بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے اٹھ کر کہا کہ

اے امیر! میری پھوپھی کے بیٹے عباسؑ، عبداللہ، جعفر اور عثمان پسران علیؑ بن ابی طالب بھی اپنے بھائی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ان کے لیے امان نامہ لکھ دیجیے۔ ابن زیاد نے کہا: بہت اچھا!

واقعی کیا ٹھکانہ ہے سوچ کے فرق کا کہ ابوالفضل کے ماموں کا بیٹا ابن زیاد سے امان نامہ حاصل کر کے بزعم خود اپنی پھوپھی کے بیٹوں کی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن کیا وہ اس امان نامے سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے بھائی، اپنے آقا اور اپنے امامؑ کو چھوڑ کر اپنی جان بچا کر چلے جائیں گے؟

ام البنین کے بیٹوں کے لیے امان نامہ

جب عبداللہ کا غلام یہ امان نامہ لیکر کربلا میں آیا اور ام البنین کے بیٹوں سے ملکر انھیں بتایا کہ تمھارے ماموں زاد بھائی عبداللہ نے تمھارے لیے یہ امان نامہ بھیجا ہے تو شاید اس کا خیال تھا کہ یہ سنتے ہی ان کی باچھیں کھل جائیں گی مگر وہ آخر امیرالمومنینؑ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہمارے ماموں زاد بھائی سے ہمارا سلام کہنا اور بتانا کہ ہمیں ابن زیاد کے امان نامہ کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی امان ابن سمیہ کی امان سے بہتر ہے۔

جب شمر کربلا پہنچا تو ابن زیاد کا خط عمر بن سعد کو دیا۔ دونوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔ آخر ابن سعد امیر کے حکم کی تعمیل کے لیے رضامند ہو گیا۔ شمر کی بھی چونکہ ام البنین سے قرابتداری تھی اس نے بھی ان جوانوں کے لیے امان کا اعلان کیا مگر وہی جواب سنا۔

اس وقت عمر بن سعد اپنے مرکب پر سوار ہو کر اپنے لشکر کے سامنے کھڑا ہو کر پکارا "یَا خَیْلَ اللّٰہِ ارْکَبِیْ وَ بِالْجَنَّۃِ اَبْشِرِیْ" عجیب بات ہے۔ یہ فقرہ رسولؐ اللہ نے ایک غزوہ کے موقع پر اپنے اصحاب کو اسلام کے دفاع کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا۔ یہی فقرہ ابنِ سعد نے ۹ محرم کی شام کو فرزند رسولؐ خدا اور ان کے جانشینِ برحق اور ان کے فرزندوں اور عزیزوں کے خلاف استعمال کیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے سوارو! سوار ہو جاؤ۔ دیکھو تمھیں جنت میں جگہ ملے گی۔ اس وقت امامؑ اپنے خیمے کے سامنے ہاتھ میں شمشیر لیے اور سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ذرا آنکھ لگی تھی کہ نزدیک ہی سپاہیوں کا غل سنائی دیا۔ زینبِ کبریٰؑ سراسیمہ دوڑی ہوئی بھائی کے پاس آئیں اور کہا: بھائی! یہ سپاہیوں کا غل سن رہے ہو۔ یہ نزدیک آ رہا ہے۔ امامؑ نے زانو سے سر اٹھایا اور کہا ابھی میں نے خواب میں رسولؐ اللہ کو دیکھا ہے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تم ہمارے پاس آ رہے ہو۔ بھائی کے یہ الفاظ سن کر زینبؑ نے منہ پیٹ لیا اور کہا ہائے افسوس! امامؑ نے فرمایا: بہن افسوس کی کوئی بات نہیں۔ گھبراؤ مت۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ اتنے میں عباسؑ علمدار بھی آ پہنچے اور انھوں نے اطلاع دی کہ دشمن سر پر آ پہنچا ہے، اب کیا کرنا چاہیے؟ امامؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: عباسؑ! تم خود سوار ہو کر جاؤ اور پوچھو کہ اس وقت حملہ کیوں کر رہے ہو؟ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟ عباسؑ بیس سواروں کو لیکر جن میں زہیر بن قین اور حبیب بن مظاہر اسدی بھی شامل تھے۔ دشمن کے لشکر کے سامنے گئے اور پوچھا کہ اس اچانک حملے کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے امیر کا حکم آیا ہے۔ تم ابھی ہتھیار ڈال دو، ورنہ ہم جنگ کرینگے۔ عباسؑ نے کہا جلدی نہ کرو۔ میں ابھی ابو عبداللہ کی خدمت

ہیں پہنچ کر اطلاع دیتا ہوں۔ عباسؑ کے ہمراہی وہیں دشمن کے لشکر کے سامنے کھڑے رہے اور پند و نصیحت کرتے رہے۔ عباسؑ، امامؑ کے پاس آئے اور واقعہ گوش گزار کیا۔ امامؑ نے فرمایا: واپس جاؤ اور اگر ہو سکے تو کل صبح تک کی مہلت لے لو تا کہ آج کی شب ہم نماز و دعا میں گزاریں اور بارگاہِ خداوندی سے معافی طلب کریں۔ خدا جانتا ہے کہ مجھے نماز، قرآن اور دعا و استغفار دل سے پسند ہیں۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح امامؑ اور ان کے ساتھیوں کو اگلے دن صبح تک مہلت مل گئی۔ امامؑ نے اس تھوڑے سے موقع سے فائدہ اٹھا کر شہادت کی تیاری کی اور ایک بار پھر اپنے اصحاب کا امتحان لیا تا کہ اگر کوئی ابھی تک اس تحریک کے انجام سے بے خبر رہا ہے تو اب سمجھ لے کہ امامؑ کے سامنے بجز شہادت اور قربانی کے کوئی دوسرا راستہ نہیں اور جو شہادت کے لیے آمادہ نہ ہو چلا جائے اور میدان ان لوگوں کے لیے خالی کر دے جنھیں جان کی پروا نہیں۔

امام زین العابدینؑ اس سفر میں اپنے والد کے ہمراہ تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے دن چھپے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کی میں اگرچہ بیمار تھا پھر بھی وہاں چلا گیا تا کہ ان کی تقریر سن سکوں۔

قارئین! یہ تقریر وہ شخص کرتا ہے جو سو سے بھی کم ساتھیوں کے ساتھ بیس ہزار سے زیادہ دشمنوں کے نرغے میں تھا اور اسے صرف اگلے دن صبح تک کی مہلت تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ دشمن کا مطالبہ ماننے، بیعت کرنے اور فرومایہ لوگوں کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دشمن اسے چھوڑے گا نہیں اور فیصلہ جنگ کے بغیر نہیں ہو گا۔ اس طرح اس کی اور اس کے ساتھیوں کی شہادت یقینی ہے لیکن اس کے باوجود کامل اطمینان اور دل جمعی سے بات کر رہا تھا

وہ اپنے ساتھیوں کو یاد دلا رہا تھا کہ کل روزِ شہادت ہے اور اصرار کر رہا تھا کہ تم میں سے ہر ایک میرے اہلِ خاندان میں سے کسی شخص کا ہاتھ پکڑ لے اور اس جھیلے سے نکل جائے۔ یہ لوگ صرف میرے درپے ہیں۔ اگر مجھ پر قابو پالیں تو پھر انھیں کسی سے کوئی سروکار نہیں۔

شبِ عاشورا میں امامؑ کا خطبہ

امامؑ نے اپنا خطبہ یوں شروع کیا:

"میں بہترین طریقے سے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں عافیت اور مصیبت دونوں میں اس کی حمد کرتا ہوں۔ خدایا میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے ہمیں پیغمبری کی نعمت سے نوازا، ہمیں قرآن سکھایا، ہمیں دین اور اس کے احکام کی سمجھ عطا کی۔ ہمیں آنکھیں، کان اور دل دیے، ہمیں شرک کی آلودگی سے پاک رکھا، ہمیں نعمتوں پر شکر کی توفیق بخشی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا اور بہتر اصحاب سے اور اپنے عزیزوں سے زیادہ صالح اور مہربان عزیزوں سے واقف نہیں ہوں۔ خدا تم سب کو جزائے خیر دے۔ میرا خیال ہے کہ اب اس لشکر سے ہماری جنگ کا وقت آگیا ہے۔ میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ تم سب آزاد ہو۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاؤ۔"

شیخ مفید، طبری، ابوالفرج اور ابن اثیر نے یہ خطبہ نقل کیا ہے مگر یہ کسی نے نہیں لکھا کہ اس موقع پر آپ کے اصحاب میں سے کوئی چلا گیا ہو۔ جانے والے

راستے ہی سے اس وقت الگ ہو گئے تھے جب مسلم بن عقیل، ہانی ابن عروہ، قیس بن مسہر اور عبداللہ بن یقطر کی شہادت کی خبر ملی تھی۔ دستِ غیب نے نامردوں کو ابوعبداللہ کے حریم قدس سے پہلے ہی نکال باہر کیا تھا۔

خطبۂ شبِ عاشورا کے بعد اصحابِ امامؑ کی طرف سے سوائے اظہارِ جاں نثاری اور استقلال و استقامت کے بڑے مؤرخوں نے اور کچھ نہیں لکھا۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ خطبہ ختم کرنے کے بعد جب امامؑ نے اصرار کیا کہ تم مجھے چھوڑ دو اور اپنی جان سلامت لیکر اس مصیبت سے نکل جاؤ تو سب سے پہلے آپ کے بھائیوں، بیٹوں، بھتیجوں اور عبداللہ بن جعفر کے بیٹوں نے بیک آواز کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں! خدا وہ دن نہ لائے کہ آپ تو قتل ہو جائیں اور ہم زندہ رہیں۔ ابوالفضل العباس ان سب میں پیش پیش تھے۔

اس کے بعد امامؑ نے فرزندانِ عقیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا اے فرزندانِ عقیل یہی کافی ہے کہ مسلم مارے گئے۔ اب تم آزاد ہو، جہاں تمہارا جی چاہے چلے جاؤ۔ انھوں نے کہا: سبحان اللہ! اگر ہم اپنے بزرگ، آقا اور اپنے بہترین عم زادگان کو چھوڑ کر چلے جائیں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ اگر ہم ان کیساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے تو ہمیں کیا خبر ہو گی کہ ان پر کیا گزری۔ بخدا! ہم ایسا کام نہیں کریں گے بلکہ اپنے خاندان کے جان و مال کو راہِ خدا اور آپ کی اعانت میں قربان کر دیں گے۔ ہم آپ کے شانہ بشانہ لڑیں گے تاکہ شہادت کا فخر حاصل کر سکیں۔ تف ہے اس زندگی پر جو آپ کے بغیر ہو۔

اب مسلم بن عوسجہ اُٹھے اور کہا کہ اگر ہم آپ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں اور آپ کو تنہا چھوڑ دیں تو خدا کو کیا جواب دیں گے۔ بخدا میں ہرگز آپ کو چھوڑ کر نہیں

جاؤں گا۔ میں اپنا نیزہ آپ کے دشمنوں کے کلیجے میں گھونپ دوں گا اور جب تک ہو سکے گا ان کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا اور جب میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں رہے گا تو ان پر پتھر برساؤں گا۔ خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے تاکہ اللہ تعالےٰ یہ دیکھ لے کہ ہم نے اس کے پیغمبرؐ کی غیر موجودگی میں ان کے فرزند کے حقوق کا لحاظ رکھا ہے۔ بخدا اگر مجھے معلوم ہو کہ میں قتل کر دیا جاؤں گا' پھر زندہ کیا جاؤں گا' پھر آگ میں جلا کر میری راکھ ہوا میں بکھیر دی جائے گی۔ ستر دفعہ مجھے اسی طرح مارا اور جلایا جائے گا' تب بھی میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا اور آپ پر اپنی جان قربان کرتا رہوں گا۔ اب تو مجھے معلوم ہے کہ صرف ایک دفعہ قتل ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے سربلند و سرفراز ہو جاؤں گا۔ مسلم بن عوسجہ نے اپنی بات ختم کی تو زہیر بن قین بجلی اٹھے۔ یہ وہی تھے جو کبھی ابو عبداللہ کے دشمن تھے۔ عراق کے راستے میں ان سے دُور دُور رہتے تھے اور ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے مگر تقدیر الٰہی کو کون بدل سکتا ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا کہ زہیر راہِ خدا میں شہید ہو کر ہمیشہ کے لیے سرفراز اور نیک نام ہو جائیں اور ان کا نام تاریخ عاشورا کی زینت بنے۔

زہیر نے اٹھ کر کہا کہ بخدا میں یہ چاہتا ہوں کہ مارا جاؤں اور پھر زندہ ہوں اور پھر مارا جاؤں۔ ستر بار ایسا ہی ہو' تاکہ آپ اور آپکے اہلبیتؑ زندہ اور محفوظ رہیں۔

دوسروں نے بھی کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔ امامؑ نے ان کے لیے دعائے خیر کی اور اپنے خیمے میں لوٹ گئے۔

جب امامؑ نے اشعار کہے

امام سجادؑ فرماتے ہیں کہ شبِ عاشورا جب میں بیمار تھا۔ میری پھوپھی زینبؑ

میری تیمارداری کر رہی تھیں۔ میرے والد محترم اپنے مخصوص خیمے میں خلوت میں تھے۔ صرف ابوذر غفاری کا سابق غلام جون بن جون ان کے پاس تھا اور ان کی تلوار درست کر رہا تھا۔ میرے والد کچھ اشعار گنگنا رہے تھے۔ انھوں نے دو تین بار انہی اشعار کو دہرایا۔ میں نے غور سے سنا تو سمجھ گیا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان اشعار میں ابو عبداللہؑ کا اشارہ دنیا کی بے وفائی اور بے مہری کی طرف تھا کہ کبھی مہربان دوست کی طرح مسکراتی ہے۔ آدمی اس کی ہمدردانہ صورت پر فریفتہ ہو کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ زمانہ ہمیشہ موافق ہی رہے گا مگر دنیا یکایک طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر بے مروّتی دکھانے لگتی ہے۔ زندگی جو کبھی شہد و شکر کی طرح شیریں تھی تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ دوست جن پر پورا بھروسہ ہوتا ہے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں بلکہ بہت سے دوست تو خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ عزت، طاقت، صحت اور سلامتی سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ کون ہے جس نے زندگی میں بازی نہیں ہاری اور کسے بادِ حوادث کے تھپیڑے سہنے نہیں پڑے؟

امامؑ ان اشعار کے پردے میں کہہ رہے تھے کہ کل کیسے کیسے کڑیل جوان شہید ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی کسی دوسرے کو اپنی جگہ حوادثِ روزگار کے حوالے کر دے، نہ کوئی خود کسی دوسرے کی جگہ لے سکتا ہے۔ جو زندہ ہے اسے ایک نہ ایک دن یہ راہ طے کرنی ہی ہے۔ آج ہماری تو کل دوسروں کی باری ہے۔

امامِ چہارمؑ فرماتے ہیں کہ میں اپنے والدِ بزرگوار کا مقصد سمجھ گیا۔ آپ اپنی شہادت کی خبر دے رہے تھے۔ میرا گلا رُندھ گیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور خاموش رہا۔ میں نے سمجھ لیا کہ مصیبت آنے والی ہے۔ جو اشعار میں نے سنے تھے وہ پھوپھی زینبؑ نے بھی سُنے اور چونکہ عورتیں طبعاً رقیق القلب ہوتی ہیں وہ

ضبط نہ کرسکیں۔ بے اختیار اٹھیں اور اسی طرح بلا چادر روپوش بھائی کے پاس چلی گئیں اور کہا ہائے میرے بھیا! کاش میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی۔ آج میں بن ماں باپ، بن بھائی کی ہو رہی ہوں۔ تم ہی جانے والوں کے جانشین تھے اور تم سے ہی رہنے والوں کو آسرا تھا۔ امامؑ نے کہا: "یَا اُخَیَّۃُ لَا یَذْھَبَنَّ بِحِلْمِكِ الشَّیْطَانُ" بہن! صبر کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان ضبط کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھڑا دے۔ ؎

ضبط کرتا ہوں تو ہر زخم لہو دیتا ہے
نالہ کرتا ہوں تو اندیشۂ رسوائی ہے

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امامؑ کے یہ دو بول اپنی بہن کے لیے بڑا سبق تھے۔ امامؑ انھیں ان دشوار حالات کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے جو کوفہ و شام میں پیش آنے والے تھے۔ امامؑ کی شہادت کے بعد مدینہ واپسی تک اس مہم کی قیادت بی بی زینبؑ ہی کو کرنا تھی۔ آپ یہ امانتِ الٰہی ان کے سپرد کر رہے تھے۔ امامؑ نے کہا بہن کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان ضبط کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھڑا دے یعنی اپنی اہمیت کو سمجھو اور اس عظیم مہم میں تمہاری ذات پر جو ذمے داری عاید ہوتی ہے اسے نہ بھولو۔ جو کام تمہیں کرنا ہے وہ اس سے آسان نہیں ہے جو میں کر رہا ہوں تم اس فرض کو صرف اس اخلاقی اور روحانی عظمت اور بلند شخصیت ہی کی مدد سے انجام دے سکتی ہو جو تمہیں علیؑ و فاطمہؑ کی تربیت کے فیض سے حاصل ہوئی ہے اور جو تم نے ماں باپ سے ورثے میں پائی ہے۔ اگر آج بھائی کی شہادت کا اشارہ پاکر اور چند اشعار آفریں شعر سن کر اظہارِ بیتابی کرنے لگو گی تو کل کا ماجرا دیکھ کر کیسے برداشت کرو گی؟ کوفہ کے بازار اور پایۂ تختِ کشورِ اسلامی یعنی دمشق میں کمال وقار

اور حوصلے کے ساتھ تقریریں کیسے کروگی؟ دشمنانِ اہلبیتؑ کی چالاکیوں کا پردہ کیسے چاک کروگی؟ آلِ ابی سفیان کی حکومت و خلافت کے عین مرکز میں لوگوں کو حقائق کی طرف کیسے متوجہ کروگی؟ اور ان کے غلط پروپیگنڈے کا اثر ایک دو تقریروں میں کیسے زائل کروگی؟

جب امامؑ نے یہ مختصر مگر پُر معنی درس اپنی بہن کو دیا تو آپ خود بھی متاثر ہوئے اور آپ کے آنسو رواں ہوگئے۔ فرمایا: بہن کیا کروں؟ جو صورتِ حال ہے تم دیکھ رہی ہو۔ بی بی زینبؑ نے بھی کچھ اثر انگیز کلمات کہے اور بیہوش ہوگئیں۔ امامؑ بہن کو ہوش میں لائے اور صبر و ضبط کی بار بار تلقین کی۔ آپ نے فرمایا: بہن تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، صبر و ضبط سے کام لو۔ صرف اہلِ زمین ہی کو مرنا نہیں، زمین اور آسمان میں ہر چیز فانی ہے۔ بقا صرف اس ذات کو ہے جس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسانوں کو پیدا کیا۔ وہی انھیں ایک دن پھر زندہ کرے گا۔ وہ خود یگانہ و تنہا ہے۔ بہن میرے نانا مجھ سے بہتر تھے۔ میرے بابا مجھ سے بہتر تھے۔ میری ماں اور میرے بھائی مجھ سے بہتر تھے۔ ہر مسلمان کو رسولؐ خدا کے راستے پر چلنا ہے۔

اس قسم کی تسلیاں دینے کے بعد امامؑ نے فرمایا: خواہر عزیز! میں تمھیں قسم دیتا ہوں اور تم اس قسم پر عمل کرنا۔ مجھ پر جو مصیبت آئے اس کی وجہ سے گریبان چاک نہ کرنا، اپنا چہرہ زخمی نہ کرلینا اور نالہ و فریاد نہ کرنا۔

شبِ عاشورا گزر گئی جو اب پھر انسانیت کی تاریخ میں کبھی نہیں آئے گی۔ کیسی کیسی شخصیتیں تھیں جو اس شب راہِ خدا میں شہادت کے لیے صبح کا انتظار کررہی تھیں، جو اس فرض کی ادائیگی کے لیے بے چین تھیں جو ان پر رسولِ خداؐ اور امیر المومنینؑ کی طرف سے عاید تھا۔ اب زمانہ لاکھ کروٹیں بدلے ایسی شخصیتیں دوبارہ

ظہور میں نہیں آسکیں اور نہ اب وہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں ان شخصیتوں کی نشوونما ہوئی تھی۔ اب تو شبِ عاشورا اور شبِ یازدہم محرم دوبارہ صرف اسی صورت میں آسکتی ہیں کہ قرآن پھر نازل ہو، خاتم الانبیاءؐ جیسا پیغمبر پھر مبعوث ہوئے علیؑ اور فاطمہؑ جیسے والدین ہوں۔ اہلبیتِ عصمت کا سہاما حول ہو، وہ حالات ہوں جن میں بنی ہاشم کے وہ سترہ جوان وجود میں آئے جو ان کے امامؑ کے بقول روئے زمین میں بے نظیر تھے۔ حبیب بن مظاہر اسدی جیسے شیر دل اصحابِ ابوعبداللہؑ ہوں اور پھر اسلام کو وہی خطرہ لاحق ہو جو اس وقت بنی امیہ کی بدولت تھا یعنی ۶۱ھ کے سب ہی اچھے بُرے حالات دوبارہ پیدا ہوں۔

صبحِ عاشورا

شبِ عاشورا امامؑ اور ان کے ہمراہیوں نے نماز، دعا، استغفار اور آرام میں گزاری۔ صبح دم ان کا روزِ پُر افتخار آپہنچا۔ شیخ مفید کتابِ ارشاد میں اور طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ نمازِ صبح کے بعد امامؑ نے صف آرائی کی۔ کل ۳۲ سوار اور ۴۰ پیادہ آپ کے ہمراہ تھے۔ زہیر بن قین کو میمنہ کی کمان دی اور حبیب بن مظاہر کو میسرہ پر مقرر فرمایا۔ علم اپنے بھائی عباسؑ کے ہاتھ میں دیا۔

اس روز صبح کو عمر بن سعد نے بھی اپنے لشکر کی صف آرائی کی میمنہ کی قیادت عمرو بن حجاج زبیدی کو دی اور میسرہ کی شمر بن ذی الجوشن کو۔ سواروں کے دستے کا رئیس عزرہ بن قیس احمسی کو مقرر کیا اور پیادہ فوج کا شبث بن ربعی کو۔ پرچم اپنے غلام کو دیا۔ امامؑ نے روزِ عاشور کئی مرتبہ لوگوں سے خطاب کیا اور خطبہ پڑھا۔ دن کا آغاز دعا سے کیا اور ہر مرتبہ خطبے سے یا دشمن سے گفتگو کرنے سے پہلے بارگاہِ رب العزت میں توفیق وہدایت کی التجا کرتے رہے۔ آپ کے تمام

خطبوں اور دعاؤں میں فصاحت و بلاغت کا کمال جلوہ گر ہے۔ دشمن کے لشکریوں سے گفتگو اس اطمینان، سکون اور وقار سے کی گویا وہ سب آپ کے عقیدتمند ہوں اور آپ کی مدد کے لیے جمع ہوئے ہوں حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ ان خطبوں کے بعد یہی لوگ آپ کو قتل کرنے والے ہیں اور یہی تیس ہزار نیزوں سے حملہ آور ہونگے۔ یہ خطبے وہ خطیب دے رہا تھا جو پیاسا تھا جس کے پاس ہونٹ تر کرنے کو بھی ایک قطرہ پانی نہیں تھا، جسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس کے بیوی بچے بے رحم اور گستاخ دشمن کے ہاتھوں اسیر ہو جائیں گے۔ جو بھوکا تھا اگرچہ اپنی مردانگی اور حوصلے کی وجہ سے عاشورے کے دن بھوک کی شکایت زبان پر نہیں لایا، صرف پیاس ہی کی شکایت کی مگر امام سجادؑ نے کہا ہے کہ پیغمبرؐ کے نواسے کو اس حالت میں قتل کیا گیا کہ وہ تشنہ لب اور بھوکے پیٹ تھا۔ واقعی حیرت کا مقام ہے کہ ایک بھوکا اور پیاسا خطیب کئی ہزار دشمنوں کے سامنے تقریر کرتا ہے جو اسے قتل کرنے پر کمر بستہ ہیں، اگرچہ پریشانی اور اضطراب کے تمام اسباب جمع ہیں مگر وہ جو بات کہتا ہے نپی تلی کہتا ہے، فصیح و بلیغ کہتا ہے، پورے سکون و اطمینان سے کہتا ہے۔ بہت ہی کم مایوسی اور عاجزی کا اظہار کرتا ہے جیسے جیسے اسکے ساتھی قتل ہوتے جاتے ہیں اور اسکی جمعیت کم ہوتی جاتی ہے اسکی تقریر کا ولولہ بڑھتا جاتا ہے، اسکا حوصلہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ وہ زیادہ سکون اور اطمینان کا اظہار کرتا ہے تاریخ انسانیت میں ایسے مقرر اور خطیب کہاں ملتے ہیں؟ یہ یادرہ گار خطیب جسکی خطابت حالات سے متاثر نہیں ہوتی۔ پریشانی اور گھبراہٹ کے تمام اسباب موجود ہیں لیکن اسکی ہمت بلند ہے۔ اسے کوئی پریشانی نہیں۔ تشویش کا اس پر کوئی اثر نہیں ہے۔

صبح عاشور دشمن کے سواروں نے امامؑ کی صفوں پر حملہ کیا اور امامؑ نے

دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے:

"خداوندا! ہر مصیبت کے وقت مجھے تجھ ہی پہ بھروسا ہے اور ہر سختی میں تجھ ہی سے امید ہے۔ ہر مشکل میں تو ہی میرا چارہ ساز اور سہارا ہے۔ میں نے کتنی ہی ایسی پریشانیوں میں جن سے دل ڈوبنے لگتا ہے، جن کا کوئی علاج نظر نہیں آتا، جن میں دوست ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور دشمن مذاق اڑاتے ہیں، سب کو چھوڑ کر تجھ سے مدد مانگی تو تُو نے مجھے تسکین اور راحت بخشی اور ان پریشانیوں کو دور کر دیا۔ ہر نعمت اور ہر نیکی تیری ہی طرف سے ہے اور سب کچھ تجھ ہی سے مانگنا چاہیے"

اس کے بعد امامؑ اونٹ پر سوار ہوئے اور بہ آوازِ بلند ـــــ جسے اکثر لوگ سن سکتے تھے ـــــ فرمایا:

لشکرِ یزید سے امامؑ کا خطاب

"اے اہلِ عراق! میری بات سنو اور میرے قتل میں جلدی نہ کرو تاکہ میں تمھیں سمجھا سکوں اور اپنے عراق آنے کی وجہ بتلا سکوں۔ اگر یہ وجہ تمھارے دل کو لگی اور تم نے یقین کیا تو میرے ساتھ انصاف کرو گے اور خود اپنے لیے خوش بختی کی راہ ہموار کرو گے، پھر تمھارے پاس مجھے قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو گی۔ اگر میری بات کو تسلیم نہیں کرو گے تو بے انصافی اور ظلم کرو گے۔ مجھے قتل کرنے سے پہلے اس بات کے پس و پیش پر اچھی طرح غور کر لو۔ بے سمجھے بوجھے ایسے نازک کام میں ہاتھ نہ ڈالو۔ میرا حامی وہی اللہ ہے جس نے قرآن بھیجا ہے۔"

ابھی امامؑ یہیں تک پہنچے تھے کہ آپ کے کانوں میں اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے نالہ و شیون کی صدا آئی۔ آپ نے اپنے بھائی عباسؑ اور اپنے بیٹے علی اکبرؑ سے کہا: جاؤ ان خواتین سے کہو کہ خاموش رہیں، بعد میں رونے کا بہت موقع ملے گا۔ جب پردہ نشینانِ حریم عصمت و طہارت کی آواز آنا بند ہوگئی تو آپ نے خدا کی حمد و ثنا کی۔ فرشتوں اور پیغمبروں پر درود بھیجا۔ اس کے بعد ایسے بلیغ انداز میں بات شروع کی کہ یہ شیوا بیانی نہ آپ سے پہلے کسی مقرر کو نصیب ہوئی نہ آپ کے بعد۔ آپ نے اہلِ کوفہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"لوگو! مجھے پہچانتے ہو؟ دیکھو میں کون ہوں، اچھی طرح سوچ لو کہ کیا مجھے قتل کرنا اور میری حرمت کو پامال کرنا تمہارے لیے جائز ہے؟ کیا میں تمہارے پیغمبرؐ کا نواسا نہیں ہوں؟ کیا تمہارے پیغمبرؐ کے وصی، ان کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور انکی تصدیق کرنے والے میرے ہی والد نہیں تھے؟ کیا حمزہ بن عبدالمطلب سید الشہداء میرے والد کے چچا نہیں تھے؟ کیا جعفر بن ابی طالبؑ ذوالجناحین جو فرشتوں کے ساتھ پرواز کرتے ہیں میرے چچا نہیں تھے؟ کیا تم نے نہیں سنا کہ رسول اللہؐ نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ ہم دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ جو میں کہہ رہا ہوں سچ ہے تو بہتر ہے۔ خدا کی قسم جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اللہ جھوٹوں کا دشمن ہے میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تاہم اگر تمھیں میرا یقین نہیں تو ابھی تمہارے درمیان ایسے اصحابِ رسولؐ موجود ہیں کہ اگر تم ان سے پوچھو تو وہ بتلا دیں گے۔

جابر بن عبداللہ انصاری یا ابوسعید خدری یا سہل بن سعد ساعدی یا زید بن ارقم یا انس بن مالک سے پوچھو وہ تمھیں بتائیں گے کہ انھوں نے یہ بات میرے اور میرے بھائی کے بارے میں خود رسول اللہ سے سنی ہے۔ کیا یہی حدیث تمھیں میرے قتل سے باز رکھنے کے لیے کافی نہیں؟"

پھر فرمایا:

"اگر تمھیں اس حدیث میں شبہ ہے تو کیا اس میں بھی شبہ ہے کہ میں رسولؐ کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم مشرق و مغرب میں اس وقت میرے سوا رسولؐ کا کوئی اور نواسا نہیں۔ سچ کہو کیا میں نے تم میں سے کسی کو قتل کیا ہے کہ تم اس کا قصاص چاہتے ہو؟ کیا میں نے تمھارا مال لوٹا ہے کہ تم اس کا مطالبہ کر رہے ہو؟ کیا تم میں سے کسی کو زخمی کیا ہے کہ تم اس کی تلافی کے لیے اٹھے ہو؟"

امامؑ نے اس قسم کی جتنی باتیں کہیں ان میں سے کسی کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ناچار آپ نے کچھ لوگوں کا نام لیکر ان سے خطاب کیا۔ فرمایا:

"اے شبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث! کیا تم نے مجھے خط نہیں لکھا تھا کہ میوے پک گئے ہیں، زمینیں سرسبز و شاداب ہیں، عراق کے سپاہی آپ کے لیے جان دینے پہ آمادہ ہیں، لہٰذا جلد سے جلد عراق کے لیے روانہ ہو جائیے۔"

طبری لکھتا ہے کہ ان لوگوں نے امام کے جواب میں کہا کہ نہ ہم نے کوئی خط لکھا اور نہ ہی ہمیں اسکی خبر ہے جو کچھ کہ آپ کہہ رہے ہیں، واقعی پستی اور

دنائت کی انتہا ہے کہ وہی لوگ جنھوں نے خط پر خط لکھ کر امامؑ کو بلایا تھا اور خطوں پر خود دستخط کیے تھے، آج کمالِ بے شرمی سے انھیں جواب دے رہے ہیں کہ نہ ہم نے خط لکھا اور نہ آپ کو بلایا۔

یہاں ہم ان ذلیل لوگوں میں سے ایک کا تعارف قارئین سے کرانا چاہتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آدمی دنیا پرستی اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں کہاں تک جا سکتا ہے۔ بعض لوگ واقعی ہر روز رنگ بدلتے ہیں۔ صبح کچھ اور شام کچھ۔ ایک دن خدا کے لیے تلوار اٹھاتے ہیں تو اگلے دن خدا کی مخالفت میں۔ آج علیؑ کے دوست ہیں تو کل ان کے دشمن۔ ایک دن امام حسینؑ کو قتل کرتے ہیں تو دوسرے دن ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش۔ شبث بن ربعی یعنی یہی شخص جو اس وقت عراقی فوج کا ایک افسر تھا اور قاتلانِ حسینؑ میں سے ایک ہے، کسی زمانے میں سجاح کا مؤذن تھا۔ جب اس عورت نے بنی تمیم کے قبیلے میں نبوت کا دعویٰ کیا تو اس نے اُس کی مؤذنی قبول کر لی۔ پھر جب سجاح ذلیل ہو گئی تو شبث اسلام لے آیا۔ قتلِ عثمان کے وقت اس کام میں شریک رہا۔ پھر اصحابِ علیؑ میں شامل ہو گیا۔ بعد میں علیؑ کے خلاف بغاوت کی اور خوارج سے مل گیا۔ پھر خارجیت سے توبہ کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۶۱ھ میں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے قتل میں شرکت کی اور اس کارِ بد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعد میں جب مختار بن ابی عبیدہ ثقفی نے خونِ حسینؑ کا مطالبہ کیا تو شبث بن ربعی جو خود قاتلانِ امامؑ میں سے تھا خونِ حسینؑ کا بدلہ لینے کے لیے مختار کے ساتھ ہو گیا۔ بعد میں کوفہ کی پولیس کا رئیس بن گیا اور حضرت مختار کے قتل میں بھی شریک رہا۔ ۸۰ھ کے قریب مر گیا۔ ایسے لوگوں کا اخلاق اور روحانیت میں کوئی حصہ

نہیں ہوتا۔ یہ کہاں ممکن ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کی ملکوتی روح سے یہ لوگ کوئی استفادہ کرسکیں یا امامؑ کے نفسِ مطمئنہ کی کوئی شعاع ایسے بداستعداد لوگوں پر پڑ سکے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

امامؑ کی گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ بخدا میں مجبوروں اور ذلیلوں کی طرح ان لوگوں کے ہاتھ پر بیعت نہیں کروں گا اور میں چھوٹوں کے ساتھ میدان جنگ سے غلاموں کی طرح نہیں بھاگوں گا۔ میں تم لوگوں کے شر سے اور ہر متکبّر سے جو روزِ حساب پر یقین نہیں رکھتا، اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

اتنے میں آہستہ آہستہ لڑائی کی تیاری شروع ہوگئی۔ عمر بن سعد نے ایک تیر چلّے پر چڑھایا اور ابوعبداللہؑ کے لشکر کی طرف چھوڑ دیا اور کہا۔ ابن زیاد کے سامنے گواہ رہنا کہ میں نے سب سے پہلے جنگ شروع کی ہے۔ ظہر تک لڑائی شدت کے ساتھ ہوتی رہی اور امامؑ کے بیشتر اصحاب شہید ہوگئے۔ ظہر کی نماز امامؑ نے بصورت نمازِ خوف اپنے بقیہ اصحاب کے ساتھ دو رکعت پڑھی۔ نماز کے بعد پھر اسی طرح لڑائی شروع ہوگئی، یہاں تک کہ جوانانِ بنی ہاشم میں سے بھی کوئی نہ بچا اور وہ بھی یکے بعد دیگرے شہید ہوگئے حتیٰ کہ خورد سال اور شیرخوار بچے بھی شہادت کے درجے پر فائز ہوئے۔ آہستہ آہستہ وہ وقت بھی آگیا جس نے اسلامی تاریخ کا رخ بدل دیا اور تاریخ شہادت میں امام عالیمقامؑ کا نام سنہری حروف میں ثبت کر دیا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تاریخ میں روزِ حسینؑ (یوم عاشورا) جیسا کوئی اور دن نہیں۔

وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ○

تحقیق سے ان لوگوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں جو روزِ عاشورا امامؑ کی ہمراہی میں شہید ہوئے۔ مشہور یہ ہے کہ بہتّر تن شہید ہوئے۔

طبری کے مطابق امام حسینؑ کے اصحاب میں سے بہتّر اشخاص شہید ہوئے۔ شیخ مفید نے لکھا ہے کہ عمر بن سعد نے روزِ عاشور ہی امامؑ کا سر عبیداللہ بن زیاد کے پاس بھیج دیا اور حکم دیا کہ اصحابِ اہلبیتؑ میں سے سب شہداء کے سر کاٹ لیے جائیں۔ یہ کل بہتّر سر تھے۔ اس زیارت میں بھی جو سید بن طاؤس نے اقبال میں نقل کی ہے، بہتّر شہداء ہی کا تذکرہ ہے۔ یہ زیارت جو ۲۵۲ھ میں ناحیہ مقدسہ سامرا سے جاری ہوئی، غالباً امام حسن عسکریؑ کی طرف سے جاری ہوئی نہ کہ امامؑ زمان کی طرف سے کیونکہ ۲۵۲ھ تک امامؑ زمان متولد نہیں ہوئے تھے اور آٹھ سال بعد تک یعنی ۲۶۰ھ تک امام یازدہم زندہ تھے۔ اس زیارت میں سترہ شہدائے بنی ہاشم اور اس کے بعد پچپن اصحاب کے نام ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان بہتّر تن کے کارنامے کو بڑی دقیق نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اتنی کم جمعیت نے اتنا عظیم کارنامہ کیسے انجام دیا! اگر امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کا کوئی دنیوی مقصد ہوتا اور وہ عام لوگوں کی طرح کسی مادّی غرض کے لیے مارے جاتے تو وہ دنیا میں یہ عظمت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے اس تحریک کی صورت ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کسی مادی یا شخصی غرض سے آلودہ نہیں تھی۔ جو اہمیت اس تحریک نے تاریخِ اسلام بلکہ تاریخِ عالم میں حاصل کی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس وقت جو دنیائے اسلام کی حالت تھی اس نے امامؑ پر ایک فرض عائد کر دیا تھا۔ ان حالات میں آپ نے یہی طے کیا کہ اسلام کی حفاظت اسی پر منحصر ہے کہ آپ اٹھیں اور اپنی جان پر کھیل جائیں۔

تحریکِ کربلا اور منفی اندازِ فکر

امام حسینؑ ایک بلند نصب العین لیکر اٹھے تھے۔ ان کا یہ مقصد نہیں تھا کہ یزید کو اقتدار سے ہٹا کر خود حکومت پر قبضہ کرلیں۔ انھیں یزید سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ وہ تو حق کے طرفدار تھے چاہے حق کی جو بھی شکل ہو اور باطل کے مخالف تھے چاہے اس کا سربراہ یزید ہو یا کوئی اور۔ یہ بہتر تن جو امامؑ کو ملا کر بہتر ہو جاتے ہیں اس لیے اٹھے تھے کہ اس دنیا میں دین زندہ رہے۔ وہ اس لیے نہیں اٹھے تھے کہ ان کے گناہ دھل جائیں اور ان کا معاملہ ان لوگوں سے الگ ہو جائے جو ساری عمر گناہ کرتے رہتے ہیں۔ نہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو مالِ حرام جمع کرکے دولت اکٹھی کرتے ہیں اور ایک دفعہ کربلا یا مکہ جاکر پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ اپنے مالِ حرام میں سے کچھ وقف بھی کر دیتے ہیں تاکہ خدا ان کے بقایا مال سے چشم پوشی کرے۔ یہ بہتر افراد مجموعی طور پہ نہ گنہگار تھے نہ قرضدار۔ ان کے قائد امام حسینؑ تو معصوم تھے جو عمر بھر ہر چھوٹے بڑے گناہ سے مبرّا رہے۔ جوانانِ بنی ہاشم کا بھی شعار تقویٰ تھا اور وہ حلقۂ عصمت میں ایک مقام رکھتے تھے۔ امامؑ کے اصحاب بھی اپنے زمانے میں عبادت، تقویٰ اور دین داری کے لحاظ سے برگزیدہ اور نامور تھے۔ کیا انھوں نے جیسا کہ بہت سے لوگ تصور کرتے ہیں اس لیے شہادت پائی کہ گنہگارانِ امت کے لیے ڈھال بن جائیں یعنی اگر اس سے پہلے مسلمان یا شیعہ ڈرتے ڈرتے گناہ کرتے تھے تو اب امامؑ اور انکے اصحاب کی شہادت کے بعد پوری بے باکی اور اطمینان سے گناہ کریں۔ جتنا چاہیں لوگوں کو دھوکا فریب دیں اور حساب کتاب، سزا و جزا کا ذرہ برابر خوف دل میں نہ لائیں

کیونکہ امام حسینؑ نے گنہگارانِ امت کی خاطر جان دی ہے اور امامؑ اس لیے شہید ہوئے کہ امت کے گناہ بخشے جائیں۔ لوگ گناہ کرتے ہیں اور کرتے ہی رہیں گے۔ امامؑ نے کفارہ دیدیا۔ سب کام ٹھیک ہو گیا۔ حضرت عیسیٰؑ صلیب پر چڑھ گئے۔ گنہگار عیسائی بے فکر ہو گئے۔ امام حسینؑ نے بھی قتل ہو کر امت کے گنہگاروں کا بیمہ کر دیا۔

نعوذ باللہ! سوچ کا یہ انداز جو شاید عوام کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو، امامؑ کے نصب العین کے بالکل برعکس ہے۔ امامؑ کی تحریک کا مقصد تو یہ تھا کہ لوگ اور بھی خوفِ خدا کریں، گناہوں سے اور زیادہ بچیں، فرائض مذہبی کی بجا آوری کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ وہ تو اس لیے اٹھے تھے کہ گناہ کی بساط لپیٹ دیں، لوگوں کو برائیوں سے روکیں اور ان میں تقویٰ کی روح پھونکیں۔ وہ اس لیے اٹھے تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں، معاصی اور مفاسد کے سیلاب کو روکیں، لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا کو مضبوط کریں، انھیں خدا کی طرف متوجہ کریں، قرآن اور اس کی تعلیمات کے مطابق تربیت کا ماحول پیدا کریں تاکہ ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں لوگ جھوٹ نہ بولیں، خیانت کے مرتکب نہ ہوں، جو کام کریں دیانتداری کے ساتھ کریں، شجاع اور دلیر ہوں، خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، صرف حق کو تسلیم کریں اور جو بات کریں قاعدے کی کریں۔ امامؑ نے اس لیے جان نہیں دی کہ لوگوں سے کہدیں کہ اب میری شہادت کے بعد تمھیں سچ بولنے، دیانتدار ہونے، عبادت کرنے، حلال کی روزی کمانے، حرام سے بچنے اور دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ امامؑ نے یہ نہیں کہا کہ میں اس لیے قتل ہوا ہوں تاکہ میرے شیعہ بے فکری اور بغیر کسی دغدغے

کے جی بھر کے گناہ کریں۔ یہ طرزِ فکر مسلمانوں کے لیے شرمناک اور شہدائے راہِ خدا کی مقدس ارواح کے لیے جو صرف گناہ اور بے دینی کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے ہیں تکلیف دہ ہے۔ اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہیں کہ کوئی شخص خدا سے دور ہٹ کر امامؑ سے نزدیک ہو جائے یا خدا کو ناراض کر کے امامؑ کی خوشنودی حاصل کرے یا اپنے گناہوں کا ایک حصہ امامؑ کے پلے میں ڈال دے تاکہ خدا اس سے باز پرس نہ کرے۔

جو لوگ یہ طرزِ فکر رکھتے ہیں وہ نہ فقط اسلامؑ روحِ اسلام اور امام حسینؑ کی تحریک سے غداری کرتے ہیں بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شہادتِ امامؑ کے سرمائے سے اللہ کے قانونِ حرام و حلال اور عذاب و ثواب کے مقابلے پر اپنا الگ کاروبار جمایا ہے۔ بدقسمت ہے وہ مسلمان جو نماز نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے یا حقوق العباد کا پاس نہ کرے یا حرامکاریوں میں مبتلا ہو یا سُود لے اور حرام کی کمائی پر زندگی بسر کرے اور پھر خوش ہوتا رہے کہ میں امام حسینؑ کا عقیدتمند ہوں۔ ایسے مسلمان سے پوچھنا چاہیے کہ تو امام حسینؑ کا عقیدتمند کیوں ہے، جب نہ تجھے امام حسینؑ کے کام پسند ہیں اور نہ انھیں تیری حرکتیں۔ وہ راست گو تھے، تو جھوٹ بولتا ہے وہ دیانتدار تھے، تو بددیانت ہے۔ انھوں نے شبِ عاشورا میں اس لیے مہلت لی تھی کہ ایک رات نماز، دعا، استغفار اور تلاوتِ قرآن میں گزار سکیں۔ تیری اکثر راتیں معصیت اور ناپسندیدہ کاموں میں گزرتی ہیں۔ انھوں نے راہِ خدا میں سب کچھ قربان کر دیا اور تو خدا کی راہ میں پھوٹی کوڑی خرچ کرنے کا روادار نہیں۔ بہت سے لوگ امام حسینؑ کے اس لیے عقیدتمند ہیں کہ انھوں نے امامؑ کو سمجھا نہیں۔ وہ اس خیال میں ہیں کہ ہو سکتا ہے محض معمولی سلام دعا سے امامؑ کو اپنا طرفدار بنالیں۔ ایسے ہی بہت سے لوگ بلا وجہ امام مہدیؑ کے ظہور کے انتظار

میں بیٹھے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ امامؑ کے ظہور سے ان کا کوئی بھلا نہیں ہوگا کیونکہ جس امام کی وہ آس لگائے ہوئے ہیں وہ کبھی ظاہر نہیں ہونگے اور جو امامؑ ظاہر ہوں گے، وہ اپنے مریدوں میں روپیا اور نوکریاں تقسیم نہیں کریں گے ۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

جو شخص پیغمبری اور امامت کا صحیح مفہوم سمجھتا ہے وہ اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا نہیں ہوتا اور خدا کے مقابلے میں پیغمبر و امام کا کارخانہ نہیں کھولتا۔ وہ جانتا ہے کہ پیغمبر و امام کی بزرگی خدا کی بندگی کی بنیاد پر قائم ہے اور خدا کا بندہ بنے بغیر کسی پیغمبر یا امام سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

گر تو خواہی حری و دل زندگی
بندگی کن، بندگی کن بندگی

امام حسینؑ نے روزِ عاشور اس قدر آفات اور باوجود اس کے کہ دشمن چند لمحے بھی نماز کے لیے جنگ بند کرنے پر تیار نہیں تھا، عین معرکہ کارزار میں ظہر کی نماز با جماعت ادا کی۔ یہ امامؑ اس بات سے کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ کوئی بجائے نماز کے صرف عزاداری کرے یا ان کی شفاعت کی امید پر واجبات کو نظر انداز کر دے اور برے کاموں کا مرتکب ہو۔ عزاداریٔ امامؑ سے تو دین شناسی میں اور بھی اضافہ ہونا چاہیے کیونکہ عزاداری خدا سے نزدیک کرتی ہے اور گناہ و معصیت سے دور رکھتی ہے۔ تعلق مع الدین کو مضبوط کرتی ہے اور روحِ توحید کو زندہ کرتی ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مجالسِ عزائے حسینؑ اسی وقت خدا کی خوشنودی کا سبب اور موجبِ اجر و ثواب ہیں جب اللہ کی

بندگی کی حدود میں انجام پائیں، ان میں جھوٹ نہ ہو، کوئی ناجائز کام نہ ہو۔ گناہ کے ذریعے خدا کی عبادت نہیں کی جاسکتی اور حرام کو عبادت کی تمہید نہیں بنایا جاسکتا۔ اللہ تعالےٰ اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو تقویٰ کی حدود میں انجام دیا جائے۔

جو عمل تقویٰ کے ساتھ کیا جائے گا ضرور قبول ہوگا اور اس سے نفس کی اصلاح اور کسی نہ کسی حد تک روحانی ترقی ہوگی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نیک کام کیا جائے اور اس کا اثر باطن پر نہ پڑے۔ یہ نیک کام کا اچھا اثر ہی تو ہے جو ثواب اخروی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کسی کام سے ثواب ہونے کے اس وقت تک کوئی معنی نہیں جب تک اس کا روح پر اچھا اثر نہ ہو۔ اسی طرح کسی کام کے موجب عذاب ہونے کے بھی اس وقت تک کوئی معنی نہیں جب تک روح پر اس کا بُرا اثر مرتب نہ ہو۔ وہ لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو بظاہر نیک کام کرتے ہیں لیکن ان کے باطن پر کوئی اثر نہیں ہوتا نہ ان کی کوئی روحانی ترقی ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بے شمار ثواب کمالیا ہے۔

نیک کام سے انسان کی روحانی تربیت اور اصلاح باطن ہونی چاہیے۔ رذائل کا قلع قمع اور اخلاقی فضائل کی ترقی ہونی چاہیے۔ اگر نیک کام پر یہ اثر مرتب نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو وہ اچھا کام نہیں تھا یا صحیح طریقے سے انجام نہیں دیا گیا۔ ایسی حالت میں اکثر توقع کے برخلاف نفس انسانی پر الٹا برا اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا۔ جو اپنے رب سے ملنے کا خواہشمند ہو اسے نیکی اختیار کرنی چاہیے۔ (سورہ کہف۔ آیت ۱۱۰)

ماہِ محرم ۶۱ھ میں دریائے فرات کے کنارے سرزمینِ عراق میں جو واقعہ پیش آیا وہ اس زمانے میں تاریخی لحاظ سے بہت ہی معمولی اور غیر اہم نظر آتا تھا۔ اموی دربارِ خلافت کی طرف سے ایک لشکرِ جرار بھیجا گیا۔ اس نے اس جماعت کا محاصرہ کر لیا جس کی تعداد سو سے بھی کم تھی اور اس کے ارکان پر دباؤ ڈالا کہ خلیفۂ وقت کی بیعت کریں اور اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں چونکہ اس جماعت نے بیعت کرنا قبول نہ کیا لہٰذا سخت جنگ چھڑ گئی جس کا فیصلہ ایک دن سے بھی کم مدت میں ہو گیا۔ اس چھوٹے سے لشکر کے سب افراد مارے گئے اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حادثہ بھی دیگر سینکڑوں حادثوں کی طرح انسانی تاریخ کے کسی گمنام گوشے میں دفن ہو جائیگا اور وقت گزرنے کیساتھ فراموش کر دیا جائیگا۔

اس حادثے کی وجہ سے اس وقت کے مسلمانوں کی زندگی کے عام معمولات متاثر نہیں ہوئے۔ ہر شخص اپنے اپنے کاروبار میں اسی طرح منہمک رہا جیسے پہلے تھا۔ پیشہ ور اپنے اپنے پیشے میں لگے رہے مسجدیں ویسے ہی آباد رہیں۔ نماز باجماعت ہوتی رہی۔ خطیب حسبِ دستور منبر پر حلال وحرام، بہشت و دوزخ اور ثواب و عذاب کی باتیں کرتے رہے۔ دوسرے مذہبی مضامین بھی موضوعِ گفتگو بنتے رہے لیکن اس سانحہ کا جو بظاہر بہت معمولی اور مختصر واقعہ تھا کہیں کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ ہاں دربارِ خلافت کی طرف سے اس واقعہ کی اطلاع سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچائی گئی۔ اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ دربار کے سرکردہ مخالفین کے مارے جانے سے لوگ عبرت حاصل کریں اور آئندہ کسی کو مخالفت کی جرأت نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ دربارِ خلافت کو اس معاملے میں بے گناہ ظاہر کیا جائے اور سارا الزام سرکردہ مخالفوں پر تھوپ کر انھیں شرپسند اور مجرم قرار دیا جائے اور

مخالف تحریک کے سربراہ حسینؑ بن علیؑ کو جھوٹا اور باطل پرست بنایا جائے۔ صرف دربارِ خلافت اور اس کے حامی ہی نہیں اس وقت کے عام مسلمانوں کی اکثریت بھی اس واقعہ کو قاتلانِ حسینؑ کی کامیابی ہی تصور کرتی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ ان لوگوں کی شہادت کے بعد اب نہ اہل بیتؑ میں سے کسی کو مخالفت کی جرأت ہو گی اور نہ کسی اور کو اور شہادتِ امامؑ کا زخم رفتہ رفتہ خود ہی مندمل ہو جائے گا۔

یہ لوگ اس سانحہ کی روح سے ناواقف تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس معرکہ حق و باطل کی عظمت و تاثیر میں روز افزوں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس وقت صرف اہلبیتؑ عصمت ہی کے چند افراد ایسے تھے جو اس واقعہ کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکتے تھے، تاریخ اسلام پر اس کا جو اثر مرتب ہونے والا تھا اس کے متعلق گفتگو کر سکتے تھے اور ایک حد تک لوگوں کی غلط فہمی دور کر سکتے تھے۔ یہی چند افراد تھے جو دربارِ خلافت کی خام خیالی کا پردہ چاک کر سکتے تھے اور لوگوں کو توجہ دلا سکتے تھے کہ ان شہیدوں نے جو آج اپنی قبروں میں آرام کر رہے ہیں، دشمن کو کیا زک پہنچائی ہے اور ان کے یہ سر جو آج نیزوں پر چڑھا دیے گئے ہیں، کل تاریخ میں تہلکہ مچا دیں گے۔ یہی افراد قیدی کی حیثیت سے اس شہر سے اُس شہر اور اِس بستی سے اُس بستی گئے اور لوگوں کی سوچ بدل دی اور مقدس شہیدوں پر جو الزامات لگائے جا رہے تھے ان کی اس طرح صفائی پیش کی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔

سانحۂ کربلا کیوں بھلایا نہ جاسکا؟

یہاں اس سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخر امام حسینؑ کی شہادت نے اسلامی تاریخ میں مرکزی حیثیت کیوں اختیار کرلی۔ دوسری تمام دینی تحریکوں اور شہادت کے دوسرے واقعات کو مجموعی طور پر بھی وہ عظمت حاصل نہیں جو تحریکِ کربلا کو ہے۔ یہی سانحہ تاریخِ اسلام کے تمام سانحوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ غزوۂ اُحد جو شوال ۳ھ میں مدینہ کے قریب پیش آیا اس میں ایک طرف رسولِ خداؐ اور مسلمان تھے اور دوسری طرف مشرکینِ مکہ۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر چالیس صحابہ کے ایک دستے نے رسولِ خداؐ کے حکم کی خلاف ورزی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمان دشمن پر غلبہ حاصل کرلینے کے بعد یکایک شکست سے دوچار ہوگئے۔ اسّی سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے۔ بیشتر شہداء کی لاشوں کا اس طرح مُثلہ کیا گیا کہ پہچاننا مشکل ہوگیا۔ ایک بہن نے اپنے بھائی کی لاش انگلی کے نقص کی وجہ سے پہچانی لیکن اس سب کچھ کے باوجود غزوۂ احد میں ستّر سے اسّی تک مسلمانوں کی شہادت کے واقعہ کو وہ عظمت حاصل نہ ہوسکی جو سانحۂ کربلا کو ہوئی۔ شہدائے فخ کے واقعہ کو لیجیے۔ اس میں آلِ رسولؐ میں سے متعدد افراد عباسی خلیفہ ہادی کے زمانے میں مکہ معظمہ کے قریب شہید ہوئے۔ اسی طرح حسنی سادات میں سے سولہ افراد کی شہادت کا واقعہ ہے۔ یہ لوگ کوفہ کے قریب ہاشمیہ کے قید خانے میں منصور دوانیقی کے حکم سے قید کیے گئے تھے اور وہیں یکے بعد دیگرے انتقال کرگئے۔ منصور نے یہ اجازت بھی نہیں دی کہ ان کا مردہ ہی دفن کردیا جائے۔

جب سب مر چکے تو اس نے حکم دیا کہ قید خانے کی چھت اولادِ رسولؐ کے لاشوں پر گرا دی جائے۔ نہ غسل، نہ کفن، نہ گور نہ گڑھا۔

تہِ خنجر بھی جو بِسمل نہیں ہونے پاتے
مر کے شرمندہ قاتل نہیں ہونے پاتے

اسی طرح اسلامی تاریخ کے اور بھی دردناک واقعات ہیں لیکن ان میں سے کوئی واقعہ بھی حادثۂ کربلا کی جگہ نہیں لے سکتا اور ان شہیدوں میں سے کوئی بھی امام حسینؑ نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہؐ کے چچا حضرت حمزہؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے۔ رسول اللہؐ نے انہیں سید الشہداء کا لقب عطا کیا تھا۔ ان کے نام میں بھی وہ اثر نہیں جو امام حسینؑ کے نام میں ہے اور نہ اسکی توقع ہی کی جا سکتی ہے۔

ہم اس موقع پر اس سوال کا مکمل اور جامع جواب تو نہیں دینا چاہتے اور نہ شاید دے سکتے ہیں لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کے سربراہ کی خود اپنی شخصیت سے قطع نظر اہم ترین سبب جس کی وجہ سے حسینی تحریک کو دیگر تمام تحریکوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہو گئی وہ ڈراما تھا جو دشمن نے امامؑ اور ان کے اصحاب کی شہادت کے فوراً بعد بڑے شوق سے کھیلا اور یوں نادانستہ طور پر اپنے لیے ذلت و رسوائی کا سامان مہیا کیا۔ اسی کے نتیجہ میں دنیا کو اس واقعہ کی اہمیت اور قدر و قیمت سے آگاہی ہوئی۔ اس واقعہ کی اہمیت کو روشناس کرانے میں اسیرانِ اہلبیتؑ کا بھی حصہ تھا اور قاتلانِ حسینؑ کا بھی۔ دشمنوں نے شہداء کی شہادت اور جنگ کے خاتمے کے بعد بیہودگی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا کچھ نہیں کیا گیا؟ شہداء کے لاشوں کو برہنہ کر دیا۔ ان کے بدن پر سے کپڑے لوٹ کر لے گئے۔ خیموں میں گھس کر اہلبیتِ عصمت کا

سامان لوٹ لیا۔ خیموں کو آگ لگا دی۔ عابدؑ بیمار کو بستر پر قتل کرنے کی کوشش کی۔ لاشوں کو گھوڑوں کے سموں تلے روندا۔ سروں کو نیزوں پر چڑھایا۔ غم زدہ اسیروں کے ساتھ سختی کی۔ امامؑ کے لب و دنداں پر قمچیاں ماریں۔

ان بیہودگیوں سے دشمن کا اپنا ہی نقصان ہوا۔ لوگوں کو حقیقت کا پتا چل گیا۔ یہ بیہودگیاں کربلا سے شروع ہوئیں اور قافلے کے شام پہنچنے تک جاری رہیں۔ خود یزید نے ان میں حصہ لیا اور اپنے مقدر کی رسوائی سمیٹی۔

اہلِ بیتؑ نے کمالِ متانت اور حوصلے کا ثبوت دیا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ لوگ انہیں شکست خوردہ سمجھتے تھے لیکن وہ جہاں بھی گئے انھوں نے اپنی کامیابی اور دشمن کی رسوائی کی بات کی۔ لوگ دشمن کو کامیاب سمجھتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ کامیابی اور سرخروئی تو ہمیں حاصل ہوئی ہے اور مغرور دشمن کے حصے میں تو صرف نامرادی اور روسیاہی آئی ہے۔ لوگوں کی توقع کے برخلاف انھوں نے اعلان کیا کہ بنی امیہ کا جلد ہی زوال ہو جائے گا۔

اگر ابنِ سعد اور ابن زیاد چاہتے مصلحتاً ہی سہی امام حسینؑ اور انکے اصحاب کی شہادت کے بعد اہلِ بیتؑ کا احترام کرتے، ان سے اظہارِ ہمدردی کرتے، شہداء کی تدفین میں مانع نہ ہوتے بلکہ انھیں خود اپنے مقتولین سے پہلے دفن کرتے، اہلبیتؑ کو عزت و احترام کے ساتھ کربلا ہی سے مدینہ بھیج دیتے اور وہ واقعات پیش نہ آتے جن میں ایک طرف دشمن نے بیہودگی کی انتہا کر دی اور دوسری طرف اہلِ بیتؑ نے نہایت متاثر کن انداز میں ان کا پردہ چاک کیا، تو شہادتِ امامؑ اور حادثۂ کربلا کی یہ تصویر دنیا کے سامنے نہ آتی نہ ہی دشمن اس قدر ذلیل و رسوا ہوتا۔ یہ بھی خدا کا کرنا تھا کہ دشمن خود آزادیٔ فکر و عمل کا پرچار کرنے والوں

کو قید کر کے لے گیا۔

ہمیں کو جرأتِ اظہار کا سلیقہ ہے
صدا کا قحط پڑیگا تو ہم ہی بولیں گے

جب اہلِ بیتؑ کو شہر بہ شہر پھرایا گیا تو انھیں موقع مل گیا کہ وہ ہر جگہ کے لوگوں کے سامنے اپنا تعارف کرائیں۔ حادثۂ کربلا کے متعلق گفتگو کریں اور اپنے جدّا مجد رسولِؐ خدا سے اپنی قرابت کا اظہار کریں۔ اہلِ بیتؑ کو اظہارِ خیال کرنے کا پہلا موقع ۱۲ محرم کو ملا۔ اس روز وہ کوفہ پہنچے۔ شہر کو دیکھ کر ان کے دل بھر آئے کیونکہ امام علیؑ کے دورِ خلافت میں ان کا بیشتر وقت اسی شہر میں گزرا تھا۔ امیرالمومنینؑ کی بیٹیاں ۴۱ھ میں اپنے بھائی امام حسنؑ کے ساتھ کوفہ سے مدینہ گئی تھیں۔ اب بیس سال بعد اس شہر میں وہ قیدی کی حیثیت سے لائی گئیں جہاں چار سال کے قریب انھوں نے حکومت کی تھی۔ ان ہی اہلِ عراق نے جو جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں امیرالمومنینؑ کے یار و مددگار تھے، ان کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا اور ان کی باقی اولاد کو قیدی بنا لیا تھا مگر اہلِ بیتؑ کے خطیبوں نے، جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی مقصد کے لیے مدینہ سے عراق آئے ہیں اور لوگ کوچہ و بازار میں ان کی تقریر سننے ہی کے لیے جمع ہوئے ہیں، پہلے ہی دن یعنی بارھویں محرم سے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ انھوں نے ہر شخص سے گفتگو کی جب بازار میں بات کہنے کا موقع نہ رہا تو انھوں نے ابنِ زیاد کی مجلس میں اپنا کام جاری رکھا، اگرچہ اس کی صورت صرف یہ تھی کہ وہ ابنِ زیاد کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کوفہ کے قید خانے میں واپس آگئے لیکن ان کی دلیرانہ گفتگو اور بے نظیر خطبوں نے لوگوں کے سینوں میں گھر

کر لیا، دل ہلا دیے اور لوگوں کی رائے بدل دی۔ لوگ روتے تھے اور اپنی غلط فہمی کا اعتراف کرتے تھے۔ لوگوں کا احساس بیدار ہوا تو ان پر اس تحریک کی قدر و قیمت عیاں ہو گئی۔ اس طرح دشمن کی سانحۂ کربلا کو غلط رنگ دینے کی کوشش خاک میں مل گئی۔ یہ سانحہ اپنی اصل صورت اور حقائق کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گیا۔ اہلِ بیتؑ کی تشنگی اور دشمن کا کمینہ پن تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔ تاریخ سے اصحاب و ناصرانِ حسینؑ کے بلند حوصلوں کا بخوبی پتا چلتا ہے۔ حضرت علی اکبر کا یہ فقرہ بھی تاریخ میں درج ہے کہ جب ہم حق پر ہیں تو موت کا کیا خوف!

حضرت قاسم کا یہ جملہ بھی تاریخ کی زینت ہے کہ میرے لیے موت شہد سے زیادہ شیریں ہے۔

مسلم بن عوسجہ کا خلوص اور ان کا اندازِ گفتگو اس فقرے میں سمویا ہوا ہے کہ اگر ہم آپ کا ساتھ چھوڑ دیں اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں تو خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ خدا کی قسم جب تک دم میں دم ہے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ آپ پر اپنی جان قربان کر دوں گا اور آپ کے سب ساتھیوں سے پہلے مارا جاؤں گا۔

سعید بن عبداللہ حنفی کو امامؑ نے چلے جانے کی اجازت دیدی۔ ان کی دلیری اور حوصلے کی بلندی اس فقرے سے عیاں ہے۔

بخدا اگر میں مارا جاؤں اور پھر زندہ ہوں اور پھر آگ میں جلایا جاؤں اور پھر میری راکھ ہوا میں اڑا دی جائے اور ستر دفعہ یہی ماجرا پیش آئے تب بھی میں آپ سے جدا نہیں ہوں گا اور اسی راہ میں شہید ہو جاؤں گا۔

بشر بن عمر وحضرمی کے نام کو اس فقرے نے شہدائے اسلام کی تاریخ میں زندۂ جاوید بنادیا:

صحرائی درندے میری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھائیں، اگر میں آپ سے جدا ہوں اور دوسروں سے آپ کا حال پوچھتا پھروں۔ اس تنہائی اور بے کسی کے وقت میں آپ کا ساتھ کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اپنی سعادت مندی کا اظہار اس طرح کیا:

کیا یہ ممکن ہے کہ فرزندِ پیغمبرؐ کو دشمن کے ہاتھ میں گرفتار چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر کروں۔ خدا وہ دن نہ لائے۔

دوسرے شہدائے بزرگوار کے یہ جملے جن سے ان کی بے نظیر عظمت و شجاعت اور اخلاص و استقامت کا اظہار ہوتا ہے، تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔

عمرو بن قرظہ انصاری نے آخری دم کہا: اے فرزندِ رسولؐ! کیا میں نے حقِ وفا ادا کر دیا اور اپنا فرض انجام دیدیا؟ جس وقت مسلم بن عوسجہ اسدی نزع کے عالم میں تھے، حبیب بن مظاہر اسدی نے ان سے کہا: مسلم! مبارک ہو، ہم سے پہلے جنت میں جا رہے ہو۔

مسلم بن عوسجہ نے زمین پر تڑپتے ہوئے جواب دیا: حبیب! میں تو جا رہا ہوں، مگر تم امامؑ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔

ابو ثمامہ صائدی نے ظہر کے قریب امام حسینؑ سے کہا: کتنا اچھا ہو کہ شہادت سے پہلے ہم ظہر کی نماز آپ کے ساتھ پڑھ لیں ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اگر وہ تقریریں نہ ہوتیں جو شام میں کی گئیں اور اگر امام حسینؑ کے فرزند اوران کی بہن کو ابن زیاد اور یزید کی مجالس میں گفتگو کا موقع نہ ملتا تو یہ بہت مشکل تھا کہ امامؑ اور آپ کے اصحاب کی شہادت کا واقعہ موجودہ شکل میں تاریخ کے صفحات پر آسکتا اور اس میں کوئی ردوبدل اور ہیر پھیر نہ ہوا ہوتا۔ اب تو وہ فقرہ بھی تاریخ میں درج ہو گیا جو ایک حبشی غلام نے امامؑ سے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا: مجھے شہادت سے محروم نہ کیجیے اور اس سیاہ چہرے کے باوجود سرخ رو ہونے دیجیے۔ واقعی تاریخ کا کم ہی کوئی باب ہوگا جو اس طرح بغیر کسی کمی بیشی اور بغیر کسی ردوبدل کے مؤرخوں نے درج کیا ہو اور جس کی اکثر تفصیلات پر مؤرخوں کا اتفاق ہو۔ یہ تحقیق سے کہا جا سکتا ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت تاریخ کا ایک روشن ترین اور بے نظیر ترین باب ہے۔ آج تک کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ اس واقعہ میں کوئی ہیر پھیر کر سکے۔ شیخ مفید ہوں یا طبری یا ابوالفرج اصفہانی، سب ہی نے اس واقعے کی تفصیلات ایک ہی طرح لکھی ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ دشمن سخت غلط فہمی میں مبتلا رہا اور اس نے نادانستہ طور پر خود اس بات کا موقع فراہم کیا کہ اسیران اہلبیتؑ جو اس حادثے کے عینی شاہد تھے اور کسی دوسرے سے بہتر اس کی تفصیلات پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ پہلے عراق کے صدر مقام کوفہ میں، پھر شام کے صدر مقام دمشق میں اور پھر حجاز کے صدر مقام مدینہ میں اس کے بارے میں گفتگو کریں۔ امام زین العابدینؑ نے ایک دن کوفہ کے بازار میں، پھر ایک دن دمشق کی جامع مسجد میں اور کچھ مدت بعد مدینہ میں اس حادثۂ فاجعہ کی اس طرح تصویر کشی کی کہ لوگوں پر حقیقت اس طرح عیاں ہو گئی کہ گویا وہ خود

روزِ عاشورا سرزمینِ نینویٰ میں موجود تھے۔

آخر ایک دن یزید اس صورتِ حال پر پچھتایا اور اس کی سمجھ میں آگیا کہ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر کوفہ اور شام لانا کیسی حماقت تھی۔ کیا اچھا ہوتا کہ شہادت پر ہی قصہ ختم کر دیا جاتا، ایک اور جھگڑا کھڑا نہ کیا جاتا اور اہل بیتؑ کو بازاروں اور عام محفلوں میں گفتگو کا موقع نہ دیا جاتا لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا! تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہونٹوں سے نکلی بات کو سینوں میں واپس تو نہیں لوٹایا جا سکتا تھا اور نہ وہ منظر جو لوگوں نے دیکھے تھے اور جو خطبے سنے تھے ان کے ذہنوں سے محو کیے جا سکتے تھے۔ جو لوگ بازاروں میں نالہ و فریاد کر چکے تھے انھیں دوبارہ کیسے باور کرایا جا سکتا تھا کہ وہ فرزندانِ پیغمبرؐ جن کی شان میں آیۂ تطہیر نازل ہوئی تھی، باغی، فتنہ جو اور کشتنی و گردن زدنی ہیں۔ عام لوگوں پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اسے چھپاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ کسی کو معلوم ہو کہ ان پر کیا گزری ہے لیکن اہل بیتؑ عصمت و طہارت نے پوری کوشش کی کہ جو بپتا ان پر پڑی تھی اس سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ اس مقصد سے انھوں نے واقعاتِ عاشورا کی ہر موقع پر ایک ایک تفصیل بیان کی۔ خود امام حسینؑ جو انسانی اور اسلامی فضائل کا مجسمہ تھے عموماً شہید ہی کے لقب سے یاد کیے جاتے رہے۔

کوفہ میں امام سجادؑ کا خطبہ

امام سجادؑ نے کوفہ میں لوگوں سے خطاب کیا اور خطبہ دیا۔ آپ نے لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے فرمایا:

اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔"

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

"ہم نے آپ کو اس لیے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کو خوشخبری دیں اور ڈرائیں۔"

یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ہم نے آپ کو فاتحِ عالم بنا کر بھیجا ہے یا اس لیے بھیجا ہے کہ آپ اسلامی حکومت کے رقبے میں اضافہ کرتے رہیں۔

سورۂ فرقان میں ارشاد ہے:

"ہم نے آپ کو صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

سورۂ سبا میں فرمایا گیا ہے:

"ہم نے آپ کو سب لوگوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا تاکہ آپ ایمان لانے والوں کو خوشخبری دیں اور ایمان نہ لانے والوں کو خدا کے عذاب سے ڈرائیں۔"

اسی قسم کا مضمون سورۂ فاطر اور سورۂ فتح میں بھی ہے۔

سورۂ جمعہ میں ہے:

"اللہ وہ ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی کی قوم سے ایک رسولؐ بھیجا جو اللہ کی آیتیں انھیں پڑھ کر سناتا ہے، باطل عقائد اور اخلاقِ ذمیمہ سے پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

ان آیات میں اور ایسی ہی دوسری آیات میں جن میں فرائضِ نبوت کا ذکر ہے، کشور کشائی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ہر جگہ تعلیم و تربیت، ہدایت، نیکیوں

دین کو سمجھے اور جو اعتقاد رکھے، علیٰ وجہ البصیرت رکھے۔ نہ کوئی چیز ہوائے نفسانی سے بڑھائے اور نہ کوئی چیز از رہِ نادانی کم کرے۔ اس حدیث شریف کی رو سے بندے کی بھلائی اور سعادت کی بنیاد یہی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلامی تاریخ میں جتنے فتنے پیدا ہوئے اور جتنے ناقابلِ تلافی نقصان مسلمانوں کو پہنچے ان کی اصل وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں میں سے بہت سے دین شناس نہیں تھے اور ایسے لوگوں نے اپنے خیال میں تو دین اسلام کی خدمت کی مگر درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ خلفاء کے عہد میں بڑی تیز رفتاری سے فتوحات ہوئیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی شہر یا علاقہ فتح ہوتا تھا اور لوگ اسلام قبول کرتے تھے مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ نومسلم، اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی تعلیمات سے بھی ساتھ ہی آگاہ ہو جائیں اور قرآن، اس کے احکام اور اس کی اخلاقی تعلیم کو صحیح صورت میں سمجھ لیں۔ کشور کشائی اور سیاسی غلبہ اور چیز ہے اور لوگوں کو اسلام کی روح اور اس کی تعلیمات کی قدر و قیمت سے واقف کرانا کچھ اور بات ہے۔ قرآن کریم میں جو آیات رسول اللہؐ کی شخصیت کے بارے میں ہیں ان میں سے کسی میں رسول اللہؐ کو کشور کشا نہیں کہا گیا ہے اور نہ کشور کشائی ان کے فضائل میں شمار کی گئی ہے۔ رسول اللہؐ کی دعوت و رسالت کا مقصد تو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ○
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ○

"اے نبیؐ ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، عذاب سے
ڈرانے والا اور سب کو اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا

عبداللہ انصاری سے روایت کیا ہے۔ زیارتِ اربعین میں صفوان کے وہ فقرے بہت مشہور ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ایک نور تھے، پدرانِ والا مقام کی پشت اور مادرانِ پاک کے رحم میں۔ جاہلیت کی نجاست نے آپ کو آلودہ نہیں کیا۔ شرک و کفر اور گمراہی کی تاریکی نے آپ کو اپنے کپڑے نہیں پہنائے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ دین کا ستون، مسلمانوں کے پشتیبان اور مومنین کی پناہ گاہ ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ امام ہیں، نیکوکار، پرہیزگار، پسندیدہ، پاکیزہ، ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتہ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے فرزندوں میں سے ائمہ تقویٰ کی سند، ہدایت کا نشان، قابلِ اطمینان وسیلہ اور اہلِ دنیا پر حجت ہیں۔"

ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ انسان دیندار ہو اور پوری لگن سے دین اور متعلقاتِ دین کی حمایت کرتا ہو لیکن پھر بھی دین شناس نہ ہو اور دین سمجھ کر بعض ایسی باتوں کا اعتقاد رکھتا ہو جن کا دین کی روح سے ذرا بھی واسطہ نہیں اور دین کے نام پر ایسے کام کرتا ہو جن کا مذہب نے قطعی حکم نہیں دیا اسی لیے اس حدیث کے مطابق جو سیوطی نے جامع الصغیر میں روایت کی ہے، رسولِ خدا نے فرمایا ہے: جس بندے کے ساتھ اللہ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔ دنیا اس کی نظروں میں حقیر ہو جاتی ہے اور اسے اپنے عیب دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بظاہر حدیث کے پہلے جزو کا یہی مطلب ہے کہ اللہ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، اسے دین شناس بنا دیتا ہے" تاکہ وہ

یہ سعادتمند بزرگ امام صادقؑ اور امام کاظمؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ کئی بار امام صادقؑ کو مدینہ سے عراق لے گئے۔ امامؑ ششم ان سے اونٹ کرائے پر لیتے تھے۔ خود صفوان بھی امامؑ کے ہمراہ جایا کرتے تھے۔ انھوں نے امامؑ ششم کی برکت سے امام علیؑ کی قبر کو پہچانا جو اس وقت غیر معروف تھی اور بیس سال تک امیر المومنینؑ کی قبر پہ مجاور رہے۔ صفوان شیعہ بزرگوں میں سے ہیں۔ انھوں نے ائمہ طاہرینؑ سے روایات نقل کی ہیں۔ زیارتِ وارثہ، زیارتِ عاشورا، دعائے علقمہ اور امیر المومنینؑ کی ایک زیارت انھی سے مروی ہیں۔ شیخ طوسیؒ نے مصباح المتہجد میں زیارتِ وارثہ صفوان ہی کے طریق سے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے زیارتِ عاشورا دو طریق سے روایت کی ہے۔ ایک علقمہ بن جعفر حضرمی عن الامام محمد الباقرؑ اور دوسرے صفوان جمال عن الامام الصادقؑ۔

صفوان بن سیف بن عمیرہ کہتے ہیں کہ میں امام صادقؑ کے ہمراہ تھا کہ آپ نے یہاں اس طرح زیارت کی اور دعائے علقمہ پڑھی۔ خاص بات یہ ہے کہ جو دعا، دعائے علقمہ کے نام سے مشہور ہے اور دعائے عاشورا کے بعد پڑھی جاتی ہے وہ صفوان نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے نہ کہ علقمہ نے امام باقرؑ سے، اس لیے اس کو دعائے صفوان کہنا چاہیے۔ معلوم نہیں دعائے علقمہ کے نام سے کیوں مشہور ہو گئی! اربعینِ امام حسینؑ کی بھی ایک زیارت انھی صفوان نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے۔

دوسری زیارتِ اربعین وہ ہے جو جابرؓ بن عبداللہ انصاری نے امامؑ کی زیارت کے موقع پر پڑھی تھی۔ اسے عطیہ بن سعد بن جنادہ عوفی نے جابرؓ بن

فرشتوں کا دین اور میرے آباءؑ کا دین ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دین خدا کے یہاں مقبول نہیں۔

حسن بن زیاد عطار نے بھی اپنے عقائد امامؑ کو پیش کیے اور امام نے انکے عقائد کی توثیق فرمائی۔

جن لوگوں نے اپنے عقائد اپنے دور کے امامؑ کو پیش کیے ان میں سے ایک صفوان بن مہران اسدی تھے جو ساربان تھے، اونٹ کرائے پر چلاتے تھے۔ انھوں نے اپنے عقائد امام صادقؑ کو پیش کرتے ہوئے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمدؐ خدا کے رسولؐ ہیں۔ جب تک وہ تھے مخلوق پر حجت تھے۔ ان کے بعد امیرالمومنین علیؑ حجۃ اللہ تھے۔

امامؑ نے کہا خدا تجھ پر رحمت کرے۔

صفوان نے پھر کہا: ان کے بعد حسنؑ ابن علیؑ حجۃ اللہ علی الخلق تھے

امامؑ نے کہا: تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔

پھر کہا: اس کے بعد حسینؑ بن علیؑ حجۃ اللہ علی الخلق تھے۔

امامؑ نے کہا: تجھ پہ خدا کی رحمت!

صفوان نے کہا: پھر علیؑ بن الحسینؑ حجۃ اللہ علی الخلق تھے۔

امامؑ نے فرمایا: تجھ پر خدا کی رحمت!

کہا: پھر محمدؑ بن علیؑ حجۃ اللہ علی الخلق تھے۔

امامؑ نے کہا: تجھ پر خدا کی رحمت!

صفوان نے عرض کیا: اب آپ حجۃ اللہ علی الخلق ہیں۔

امامؑ نے فرمایا: تجھ پہ خدا کی رحمت!

علیؑ اور فاطمہؑ سے نسبی تعلق دین کی جگہ نہیں لے سکتا۔

عبداللہ بن ابی یعفور نے بھی اپنے عقائد امامؑ کو پیش کیے۔ اسی طرح عمرو بن حریث نے اپنے عقائد امام موصوف سے بیان کیے تو انھوں نے فرمایا: یہی میرا اور میرے آباء کا دین ہے اور اسی عقیدے پر ہم ہر حال میں قائم ہیں۔ تقویٰ کا دامن کسی حال میں مت چھوڑو اور سوائے اچھی بات کے کوئی بات زبان سے نہ نکالو۔ یہ مت کہو کہ میں نے صحیح راستہ اختیار کیا بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے مجھے ہدایت دی اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہو۔

خالد بجلی بھی امام صادقؑ کے اصحاب میں سے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے عقائد امامؑ کو پیش کیے۔ جب ان کی تقریر طویل ہو گئی تو امامؑ نے فرمایا: بس چپ رہو، جو تم نے کہا وہ حق ہے۔

ایک اور صاحب یوسف نامی جو امامؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ انھوں نے بھی امامؑ سے درخواست کی کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے عقائد بیان کروں۔ اگر درست ہوں تو میں ان پر قائم رہوں۔ اگر کوئی عقیدہ حق کے منافی ہو تو میری اصلاح کر دیجیے۔

امامؑ نے فرمایا: کہو

یوسف نے کہا: میں خدا کی وحدانیت اور اس کے لاشریک ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ علیؑ میرے امام ہیں، حسنؑ میرے امام ہیں، حسینؑ میرے امام ہیں، علیؑ بن حسینؑ میرے امام ہیں، محمدؑ بن علیؑ میرے امام ہیں اور اب آپ خود میرے امامؑ ہیں۔ امامؑ نے کئی دفعہ کہا خدا تم پر اپنا فضل کرے جو تم نے کہا وہی خدا کا دین،

خلافِ دین ہو۔ انہی بزرگوں میں سے ایک عبدالعظیم حسنی ہیں جن کا سلسلۂ نسب چار واسطے سے امام حسنؑ تک پہنچتا ہے۔ یہ امام محمد تقی جوادؑ اور امام علی نقی ہادیؑ کے ہمعصر تھے اور خود ان کا شمار بزرگانِ اہلبیتؑ اور علمائے اسلام میں ہوتا ہے۔ بہرحال یہ امام ہادیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے عقائد آپ کی خدمت میں پیش کروں اور اگر آپ ان کی توثیق فرما دیں تو میں ان پر قائم رہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے عقائد پیش کیے۔ امامؑ نے ان کے عقائد سن کر کہا کہ یہی وہ دین ہے جو خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے لہٰذا تم ان عقائد پر ثابت قدم رہو، اللہ تمھیں دنیا و آخرت میں حق پر قائم رکھے۔

واقعی حیرت کی بات ہے کہ عبدالعظیم حسنی کو اتنے جلیل القدر عالم ہونے کے باوجود اس وقت تک اطمینان نہیں ہوا جب تک اپنے عقائد امامِ وقت کی خدمت میں پیش نہ کر دیے لیکن ایک عام شخص کو پورا اطمینان ہے کہ وہ جو کچھ جانتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہ وہی ہے جو رسولِ خدا، خدا کی طرف سے لائے۔

حمران بن اعین امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے ممتاز اصحاب میں سے ہیں۔ امام باقرؑ نے ان سے کہا کہ تو دنیا و آخرت میں ہمارے شیعوں میں سے ہے۔ ان کا شمار قرأت، تفسیر، نحو اور لغت کے علماء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے عقائد امام صادقؑ کی خدمت میں پیش کیے۔ امامؑ نے کہا کہ جو عقائد تم نے بیان کیے ہیں، ان میں اگر کوئی تمھاری مخالفت کرتا ہے تو وہ بے دین ہے۔

حمران نے کہا: چاہے علوی و فاطمی ہو؟

امامؑ نے فرمایا: چاہے محمدی و علوی و فاطمی ہو یعنی رسولِ خداؐ۔

تفسیرِ قرآن کے نام سے وہ باتیں لکھیں جو قرآن کی غرض وغایت کے خلاف تھیں۔ کیسے کیسے افسانے تاریخ کا جزو بن گئے اور کیسی کیسی عامیانہ باتوں کو مذہبی رسوم میں شمار نہیں کر لیا گیا اسی لیے تو ہم نے کہا ہے کہ ہر دیندار دین شناس نہیں ہوتا۔ دینداروں کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ کوشش دین شناس بننے کی کریں تاکہ ان کے ہاتھوں دین کی آبرو بھی محفوظ رہے اور دین کے نام سے جو کام وہ کریں اس سے خدا اور رسولؐ بھی راضی ہوں۔ دینی مراسم کا معاملہ انفرادی ذوق پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جاہلانہ طریقوں سے رسولِ خدا اور ائمۂ طاہرینؑ کی زیارت کی رسوم ادا نہیں کی جا سکتیں۔

ایک خطرناک اور مذہب کے بالکل الٹ خیال یہ ہے کہ جو کام بھی مذہبی رنگ اختیار کر لے وہ اچھا اور ثواب کا کام ہے' چاہے وہ دین کی روح کے منافی ہی کیوں نہ ہو اور اس دین کو لانے والے پیغمبر اس سے بیزار ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح جس رسم پر بھی امام حسینؑ کے مقدس نام کا ٹھپہ لگا دیا جائے اسے دنیا و آخرت کی سرخروئی کا باعث سمجھ لیا جاتا ہے' چاہے انکی مقدس روح کو اس سے تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے۔ جو بات بھی منبرِ حسینؑ سے کہی جائے وہ موجبِ اجر و ثواب اور عبادت ہے چاہے وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو یا بعض افراد کی مدح و قدح ہی کیوں نہ ہو۔ انہی خطرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بعض بزرگانِ دین نے جو خود عالم اور اس بات کے اہل تھے کہ دوسروں کی تعلیم و تربیت کر سکیں پھر بھی اپنے عقاید اور مذہبی خیالات کو توثیق کی غرض سے اپنے دور کے امامؑ کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی ایسی بات کے معتقد ہوں جو دین کے منافی ہو یا دین سمجھ کر کوئی ایسا کام کرتے ہوں جو

طرفینے مذہبی مراسم کی انجام دہی میں پوری کوشش کرتے ہیں لیکن چونکہ دین شناس نہیں لہذا عموماً ان کی کوششیں جاہلانہ اور عامیانہ ہوتی ہیں۔ کبھی ثواب کی نیت سے خدا سے لڑتے ہیں اور کبھی دین کی خاطر دین اور دینداروں پر حملہ کرتے ہیں اور کبھی اس ڈر سے کہ کافر نہ ہو جائیں دینداروں کو کافر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو رسولِ خدا حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسولؐ مانتا ہے مسلمان ہے لیکن یہ بات نہیں ہے کہ ہر مسلمان یہ سمجھتا ہو کہ مسلمانی کیا چیز ہے اور رسولِ خدا کی بعثت کا مقصد کیا تھا۔ دعا اور زیارت کو کیسے انجام دینا چاہیے اور کونسے عمل خدا سے قریب کرتے ہیں بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص یا جماعت کے مسلمان یا دیندار ہونے کے باوجود خیالات دین کے الٹے ہوں یا کوئی توحید کے دعوے کے باوجود شرک کرتا ہو یا نام اخلاص کا لیتا ہو مگر ریاکار ہو اس لیے اگر کسی شخص کے متعلق کہا جائے کہ وہ دین کے خلاف کام کرتا ہے یا فلاں شخص یا فلاں گروہ کی سوچ دین یا قرآن کے خلاف ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ شخص یا گروہ مسلمان یا دیندار نہیں۔

اسلامی تاریخ میں ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں جنھوں نے نہایت نیک نیتی سے اور رضائے الٰہی کی خاطر دین کے خلاف قدم اٹھائے ہیں۔ درحقیقت یہ انکی سمجھ کا پھیر تھا۔ وہ اپنی دانست میں دین کی حفاظت بلکہ ترویج کے لیے کام کر رہے تھے لیکن ان کے قدم الٹے پڑ رہے تھے۔ کتنے ہی لوگ قرآن کی ترویج اور اشاعت کے دلدادہ تھے لیکن انھوں نے قرآن کے خلاف کام کیے ہیں کتنے لوگوں نے دین کی خدمت کے خیال سے اپنی کتابوں میں غلط روایات اور من گھڑت افسانے لکھ دیئے ہیں جن سے بہت سے مسلمان گمراہ ہوئے۔ کتنے ہی لوگوں نے

روز اربعین

شہدائے کربلا کے چہلم کے موقع پر امام حسینؑ اور شہدائے واقعہ طف کی زیارت مستحب ہے۔ اسی لیے اربعین کے دن اطراف و اکناف سے آئے ہوئے شیعوں اور سنیوں کا کربلائے معلیٰ میں بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ لوگ ان بزرگوں پر جنھوں نے حق پرستی اور جانبازی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کیا درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اپنی اپنی زبانوں میں اور اپنے اپنے الفاظ میں رسوم زیارت ادا کرتے ہیں اور اس بلند مقصد سے اپنی دل بستگی کا اظہار کرتے ہیں جو ان بزرگوں کو میدان شہادت میں کھینچ لایا تھا لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ دعا اور زیارت اسی طریقے سے پڑھی جائے جو رسولِ خدا یا ائمہ طاہرینؑ سے منقول ہے اور دعا کے معاملے میں ان دعاؤں کو ترجیح دی جائے جو خود قرآن مجید میں آئی ہیں بڑے افسوس کی بات ہے کہ لوگ دور دور سے آکر امام ثامن علی بن موسیٰ رضاؑ کے مرقد مطہر کی زیارت سے شرفیاب ہوتے ہیں مگر مشہدِ مقدس میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں سوائے اس عامیانہ زیارت کے جو زیارت فروشوں نے بنائی ہوئی ہے اور کچھ نہیں پڑھتے اور ان تمام زیارتوں کی برکت سے محروم رہ جاتے ہیں جو ائمہ طاہرینؑ سے مروی ہیں۔

ہر مسلمان اسلام شناس نہیں ہوتا

لوگ امام رضاؑ کو صرف غریب الغرباء کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ لوگ دیندار ہونگے مگر دین شناس نہیں۔ دینداری اور چیز ہے، دین شناسی اور چیز۔ یہ لوگ خدا اور رسولؐ اور دین و مذہب پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنی

قرآن پڑھیے۔ اس کی جگہ کسی دوسری کتاب کو نہ دیجیے۔ ہر روز قرآن کی تلاوت کی عادت ڈالیے۔ مقدار کا تعین آپ کی اپنی سہولت پر منحصر ہے۔ حتی الامکان آیات کے ترجمے پر توجہ دیجیے۔ اگر عربی سمجھ میں نہیں آتی تو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ دیکھیے۔ جب موقع اور فرصت ہو' ان آیات کے متعلق اپنے گھر والوں اور بیوی بچوں سے بھی گفتگو کیجیے۔ قرآن سے بیگانہ رہنا اور قرآن کو نہ سمجھنا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ قرآن پڑھنے' سمجھنے اور عمل کرنے ہی کے لیے نازل ہوا ہے اس لیے قرآن سے لگاؤ پیدا کریں۔ فضائل کی عادت ڈالیں اور رذائل اور برائیوں سے اجتناب کریں۔ قرآن پاک کی تلاوت سے ثواب کا مطلب یہی ہے کہ اس سے روحانی تربیت ہوتی ہے' جو اچھا کام کرتا ہے' اسے ثواب ملتا ہے یعنی روحانی بلندی حاصل ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر نیک کام سے آدمی میں اخلاقی لحاظ سے کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اضافہ نہیں ہوتا اور آدمی کچھ اوپر نہیں اٹھتا تو پھر ثواب کے کچھ معنی نہیں۔ اسی طرح گناہ کا یہ مطلب ہے کہ آدمی پہلے سے کچھ پست ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو گناہ کے کچھ معنی نہیں۔ ثواب کے کام وہ ہیں کہ جو اگر توجہ اور ارادے سے کیے جائیں تو آدمی پر اچھا اثر چھوڑیں' اس کی روحانی ترقی کا موجب ہوں' اچھی عادتوں کو باقی رکھیں اور بری عادتوں کو ختم کر دیں۔ گناہ کے کام وہ ہیں جو روح کو زنگ آلود کریں' برائیوں کو ترقی دیں اور اچھی عادتوں کو کمزور کریں۔

قرآن کی تلاوت پسندیدہ عمل ہے بشرطیکہ نیکیوں میں اضافہ اور برائیوں میں کمی کا سبب ہو۔ نیکی کی عادت کو تقویت دے اور بری عادتوں کو ختم کر دے۔

وہی درجہ اور مقام حاصل ہوگا جس کا استحقاق اس نے دنیا میں پیدا کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید مسلمانوں کو اسی لیے عطا کیا ہے کہ وہ اسے مقدس اور مطہر کتاب سمجھیں، اس پر غور کریں اور اس سے استفادہ کریں۔

مسلمانوں کو دوسری ہر کتاب سے پہلے اور دوسری ہر کتاب سے زیادہ قرآن مجید سے لگاؤ پیدا کرنا چاہیے۔ قرآن سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس پر عمل کرنے کی نیت سے اسے پڑھنا چاہیے۔

کتنا اچھا ہو جو ہر مسلمان ہر روز اس نیت سے قرآن کی کچھ آیات تلاوت کیا کرے اور ان پر خوب غور کرے۔ اگر عربی نہیں جانتا تو ترجمہ دیکھے اور اپنے پروردگار کے کلام سے جس کی برابری کوئی دوسرا کلام نہیں کرسکتا کسبِ فیض کرے۔ اگر دس آیتیں ثواب کی غرض سے پڑھتا ہے تو ایک آیت روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے بھی پڑھ لے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک کوئی عمل انسان پر اچھا اثر نہ چھوڑے ثواب کا کچھ مطلب ہی نہیں۔ بہرحال ہر روز پابندی سے قرآن مجید کی تلاوت کرنی چاہیے۔ حتی الامکان اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہماری زبان میں بکثرت عربی کے الفاظ مستعمل ہیں اس لیے بہت تھوڑی کوشش سے قرآن مجید کے ترجمے سے مناسبت پیدا کی جاسکتی ہے۔ آج ہمارے تعلیمیافتہ لوگ عربی سے خوف کھاتے ہیں لیکن یہ ڈر اور رعب بآسانی دور کیا جاسکتا ہے۔ کسی چیز کا رعب اسی وقت تک رہتا ہے جب تک آدمی اسے جانتا اور سمجھتا نہیں۔ اگر قرآن اور اس کے مفہوم سے مناسبت پیدا ہو جائے اور اس کے مواعظ و حکم سے استفادہ کی عادت پڑ جائے تو پھر قرآن کی تلاوت میں بھی لذت محسوس ہونے لگے گی اس لیے

اگر پڑھا بھی جائے تو محض ثواب کمانے کے لیے، سمجھنے کے لیے اور عمل کرنے کے لیے نہیں، یہ سب بے بنیاد اور خلافِ مذہب باتیں ہیں۔ یہ قرآن میں غور و فکر اور اس سے استفادہ سے روکنا ہے۔ قرآن کی تلاوت کرنے اور آیاتِ قرآنی کے سننے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں سے کہا ہے کہ قرآن میں غور و فکر کریں۔ ارشاد ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا○

(سورہ محمد آیت ۲۴)

"کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔"

قرآن پر غور کیے بغیر کوئی اسے کیسے سمجھ سکتا ہے، کیسے اس سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے اور کیسے اسے دنیا و آخرت میں اپنا رہبر بنا سکتا ہے؟ امین الاسلام مرحوم نے اپنی تفسیر مجمع البیان کے مقدمے میں رسول اللہ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جس شخص نے قرآن پڑھا اور سمجھا ہے اس سے قیامت کے دن حساب کے بعد کہا جائے گا: قرآن پڑھتا جا اور ترقی کرتا جا۔ جس طرح دنیا میں ترتیل کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر اور صحت کے ساتھ پڑھتا تھا، اب بھی پڑھ۔ جتنا قرآن پڑھے گا، اتنے ہی تیرے درجات بلند ہوں گے۔ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ جنت میں وہی قرآن پڑھے گا اور آیات کے شمار کے لحاظ سے جنت کے درجات طے کرے گا جس نے دنیا میں قرآن کی تلاوت کی ہوگی اور ہر آیت کی تلاوت کے ساتھ روحانی، اخلاقی اور ایمانی بلندی حاصل کی ہوگی۔ جنت میں ہر شخص کو

اور ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات میں "یَاَیُّھَا النَّاسُ" (اے لوگو!) یا "یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (اے ایمان والو!) کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کا روئے سخن لوگوں کی طرف ہے، کبھی سب لوگوں کی طرف، کبھی خاص ایمان والوں کی طرف اور کبھی کافروں اور منافقوں کی طرف۔ قرآن وہ کتاب ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اسلام بھی تمام بنی نوعِ انسان کا مذہب ہے البتہ کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے اور وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور کچھ لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا وہ اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ اگر کچھ لوگ خدا کو نہیں مانتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا صرف ان کا خدا ہے جو اسے مانتے ہیں اور دیندار ہیں۔ وہ سب مومنوں اور کافروں کا خدا ہے۔ سب موجودات و ممکنات کا خدا ہے۔ قرآن بھی تمام بنی نوعِ انسان کے لیے نازل ہوا ہے۔ تمام اہلِ عالم اس کے مخاطب ہیں۔ وہ بھی جو اسے آسمانی کتاب مانتے ہیں اور وہ بھی جو ناسمجھی یا ضد سے اسے نہیں مانتے۔ رسولِ خداؐ بھی تمام انسانیت کے پیغمبر ہیں۔ ان کے بھی جو انھیں پیغمبر مانتے ہیں اور ان کے بھی جو انھیں پیغمبر نہیں مانتے۔ اسی طرح امام علیؑ بن ابی طالب اور دوسرے گیارہ امام اپنے اپنے دور میں تمام بنی نوعِ انسان کے امام ہوئے۔ امامِ زمانؑ آج تمام بنی نوعِ انسان کے امام اور حجتِ الٰہی ہیں، ان کے بھی جو ان کی امامت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے بھی جو کسی بھی وجہ سے ان کی امامت کے عقیدے سے محروم ہیں۔ بہرحال یہ سمجھنا کہ قرآن عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہے یا صرف تبرک کے طور پر گھر میں رکھنے کے لیے ہے یا

"بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں
سے اپنا حق ناپ کریں تو پورا لیں اور جب انھیں ناپ یا تول
کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ کیا یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ قیامت کے دن
زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جس دن سب لوگ رب العالمین
کے سامنے کھڑے ہونگے۔" (سورۂ مطففین۔ آیات ۱ تا ۴)

تو کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس آیت کا مطلب نہیں سمجھے، چلو رسول اللہ سے پوچھیں کہ اس آیت کا کیا مطلب ہے۔ قرآن مجید میں ایسی صریح اور روشن آیات ہیں کہ مسلمان انھیں تلاوت کر کے اور ان کے معنی پر غور کر کے ان سے سبق لے سکتے ہیں اور نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت یا اس کا ترجمہ جو بھی پڑھے گا، یہی سمجھے گا کہ خدا ایسے لوگوں کو عذاب کی وعید دے رہا ہے جو کوئی چیز بیچتے وقت کم ناپتے اور کم تولتے ہیں۔ دوسروں کا حق کم کر کے دیتے ہیں اور اپنا حق پورا لینا چاہتے ہیں۔

خدا کہتا ہے کہ ایسے لوگ گویا روز جزا پر یقین نہیں رکھتے اور اس دن سے بے خبر ہیں جب پروردگار کے حکم سے سب حساب کے لیے بلائے جائیں گے۔ قرآن مجید وہ کتاب ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ہدایت سے استفادہ کریں اور اسے اپنی روحانی و اخلاقی بیماریوں کا بہترین علاج سمجھیں۔ البتہ قرآن مجید میں کچھ آیات متشابہات ہیں جن کا سمجھنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء بھی ان کو سمجھنے سے قاصر ہیں یہ ایسی آیات کے لیے رسولؐ خدا اور ائمہ طاہرینؑ کی بیان کی ہوئی تفسیر سے استفادہ ضروری ہے لیکن قرآن کی سب آیات کی یہ بات نہیں۔ بیشتر آیات بالکل واضح ہیں

لوگوں پر ظاہر کر دیں اور وہ خود ان پر غور کریں۔"

آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسولؐ خدا سے جو تفسیر ان تک پہنچے اسے سیکھیں اور یاد کریں۔ قرآن کی جو آیات تشریح کی محتاج ہیں ان کو رسولؐ اللہ کی بیان کی ہوئی تفسیر کی مدد سے سمجھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو محکم آیات صاف اور واضح ہیں ان میں بھی رسولؐ اللہ کی تفسیر کی ضرورت ہے۔ رسولؐ اللہ نے قرآن کا کوئی ترجمہ نہیں کیا ہے۔ مراد وہ آیات ہیں جن کی تفصیل اور توضیح کی ضرورت ہے جن کا کوئی کچھ مطلب لیتا ہے اور کوئی کچھ۔

مسلمانوں کا دوسرا فریضہ جس کی اس آیت میں تصریح ہے یہ ہے کہ خود بھی قرآن مجید سے استفادہ کریں اور اس کو سمجھنے میں اپنی عقل استعمال کریں رسولؐ خدا جو قرآن کی تشریح اور تفسیر کرتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان قرآن کا مطلب سمجھنے سے محروم کر دیے گئے اور انہیں چاہیے کہ اس آیت کا مطلب بھی رسولؐ اللہ سے پوچھیں

"اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَائِ ذِى الْقُرْبٰى"

اس آیت کا مطلب تو اتنا صاف اور واضح ہے کہ جسے عربی سے ذرا بھی واقفیت ہو وہ اسے سمجھ سکتا ہے، اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی شخص بھی اس آیت کا سوائے اس کے کچھ مطلب نہیں سمجھے گا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ انصاف کریں، ظلم سے کام نہ لیں، نیکی کریں اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور محبت و مہربانی سے پیش آئیں۔ اس طرح جب مسلمانوں کے سامنے یہ آیت تلاوت کی گئی تھی:

پڑھتے رہے ہیں۔ وہ انکے درس تفسیر میں شریک ہوتے تھے۔ خود کہتے ہیں کہ میں نے ابنِ عباس رضؓ سے تین مرتبہ تفسیر پڑھی اور قرأتِ قرآن کے ستّر دور کیے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ابنِ عباس رضؓ کے دو درس تھے۔ ایک میں وہ قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے تھے اور دوسرے میں محض قرآن شریف پڑھاتے تھے عطیہ نے پہلے درس کے تین اور دوسرے کے ستر دور مکمل کیے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں

اس روایت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ و تابعین تفسیرِ قرآن اور تلاوتِ قرآن کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اور علمِ تفسیر اور تلاوتِ قرآن کے کتنے شیدائی تھے۔ یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کی دین و دنیا کی کامیابی اور فلاح قرآن ہی کے زیرِ سایہ ہے۔ قرآن اسی لیے نازل ہوا ہے کہ مسلمان ہمیشہ اس کی تلاوت کرتے رہیں اور اس کے مطالب پر غور کریں۔ قرآن کریم کی ایک آیت میں اس کی تصریح ہے کہ مسلمانوں کو دو کام کرنے چاہئیں، ایک تو یہ کہ قرآن کی تفسیر رسولِ خدا سے سیکھیں اور دوسرے یہ کہ خود بھی قرآن سمجھنے کی کوشش کریں اور اس پر غور کریں۔

سورۂ نحل آیت ۴۴ میں ہے:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝

"ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا ہے تاکہ آپ اس کے مضامین

عطیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ عطیہ نے ۸۱ھ میں عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کی ہمراہی میں عراق کے سفاک گورنر حجاج بن یوسف ثقفی کے خلاف جہاد کیا۔ ۸۵ھ میں عبدالرحمٰن کے مارے جانے کے بعد عطیہ بھاگ کر ایران چلے گئے۔ حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو لکھا کہ عطیہ کو حاضر کرکے اس سے کہو کہ علیؑ پر لعنت کرے، اگر انکار کرے تو اس کے چار سو کوڑے لگاؤ اور اس کا سر اور ڈاڑھی مونڈ دو۔ محمد بن قاسم نے عطیہ کو بلوایا اور حجاج کی چٹھی پڑھ کر سنائی۔ عطیہ علیؑ کی بدگوئی پر تیار نہیں ہوئے اور امیر المومنینؑ کی شان میں گستاخی سے صاف انکار کردیا۔ چار عطیہ اس پر تیار ہوئے کہ انھیں حجاج کے حکم کے مطابق چار سو کوڑے لگائے جائیں اور سر اور ڈاڑھی مونڈ دی جائے۔ جب قتیبہ بن مسلم خراسان کا حاکم ہوا تو عطیہ وہاں چلے گئے اور وہیں رہتے رہے۔ آخر جب عمر بن ہبیرہ عراق کا والی ہوا تو عطیہ نے اسے خط لکھا اور عراق واپسی کی اجازت مانگی۔ عمر نے اجازت دے دی۔ عطیہ کوفہ چلے گئے اور وہیں رہتے رہے یہاں تک کہ ۱۱۱ھ میں فوت ہوگئے۔ اس کے بعد طبری نے لکھا ہے کہ عطیہ کثیر الروایت اور ثقہ تھے۔

طبقات ابن سعد جلد ششم میں بھی یہ قصہ اسی طرح مذکور ہے۔ اتنا اضافہ ہے کہ عطیہ کی ماں ایک رومی کنیز تھی۔

عطیہ احادیث کے راوی اور مجاہد اسلام ہونے کے علاوہ ایک بڑے مفسر بھی تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر پانچ جلدوں میں لکھی تھی۔

بلاغات النساء کی روایت کے مطابق فدک کے بارے میں صدیقہ طاہرہؑ کا خطبہ عبداللہ محض یعنی عبداللہ بن حسن بن حسنؑ سے روایت کرتے تھے۔ عبداللہ محض کے والد حسن مثنیٰ امام حسنؑ کے بیٹے تھے اور ان کی والدہ فاطمہ امام حسینؑ کی صاحبزادی تھیں۔ عطیہ کچھ عرصے ابن عباسؓ سے

دی۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاریؓ جو بعض اقوال کے مطابق دونوں آنکھوں سے نابینا ہو چکے تھے، زیارتِ امامؑ کے قصد سے فوراً ہی کربلا روانہ ہو گئے ہوں اور ۲۰ صفر کو ٹھیک شہادتِ امامؑ سے چالیس روز بعد وہاں پہنچے ہوں اور اسی سے زیارتِ اربعین کی سنت کی ابتدا ہوئی ہو۔ جابرؓ اس سفر میں تنہا نہیں تھے۔ ان کے ہم سفر ایک اور بزرگ تھے جو سن و سال کے اعتبار سے ان کے مقابلے میں جوان تھے۔ غلطی سے بعض لوگوں نے انھیں جابر کا غلام کہا ہے۔ درحقیقت یہ بڑے باعزت شخص تھے لیکن بعض دوسرے حقائق کی طرح ان کی شخصیت کو بھی بہت سے مذہبی حلقوں میں بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عطیہ بن سعد بن جنادہ عوفی کوفی تھے۔ جو ایک بزرگ تابعی تھے یعنی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے رسولِ خداؐ کو تو نہیں البتہ اصحابِ رسولؐ کو دیکھا تھا اور ان سے اکتسابِ علم کیا تھا۔ ان میں عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل تھے۔

مورخ طبری نے کتاب منتخب ذیل المذیّل میں لکھا ہے کہ عطیہ بن سعد بن جنادہ کا تعلق قبیلۂ قیس کے خاندانِ جدیلہ سے تھا۔ ان کی کنیت ابوالحسن تھی۔ اس کے بعد اس مضمون کی روایت بیان کی ہے کہ عطیہ کے باپ سعد بن جنادہ کوفہ میں امام علی بن ابی طالبؑ کے پاس آئے اور کہا:

امیرالمومنینؑ! خدا نے مجھے بیٹا دیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر اس کا نام تجویز کر دیجیے۔ امام علیؑ نے کہا: "هٰذَا عَطِيَّةُ اللهِ"۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ اس جملے میں امیرالمومنینؑ نے نام بھی تجویز کر دیا چنانچہ عطیہ نام رکھا گیا۔ طبری نے

ضمیمہ

جابرؓ اور عطیہؒ کی کربلا میں آمد

شیخ طوسی علیہ الرحمتہ نے اپنی کتاب مصباح المتہجدؔ میں لکھا ہے کہ ۲۰ صفر وہ دن ہے کہ جب جابر بن عبداللہ انصاریؓ مدینہ سے امام حسینؑ کی قبر مطہر کی زیارت کے لیے کربلا آئے، وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے قبر امامؑ کی زیارت کی۔ اس روز امام حسینؑ کی زیارت مستحب ہے۔ یہی زیارت اربعین ہے۔ طوسیؒ کی عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جابرؓ مدینہ سے زیارت کے لیے روانہ ہو کر ۲۰ صفر کو کربلا پہنچے اور یہ بات کچھ بعید بھی نہیں کیونکہ اہلبیتؑ کے کوفہ پہنچنے کے فوراً بعد ابن زیاد نے عبدالملک بن ابی حارث سلمی کو عراق سے حجاز بھیجا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے مدینہ پہنچ کر عمرو بن سعید بن عاص اموی والیٔ مدینہ کو امامؑ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی اطلاع دے۔ عبدالملک فوراً ہی مدینہ روانہ ہو گیا اور چند روز بعد وہاں پہنچ کر والیٔ مدینہ کو باضابطہ اطلاع

نہیں ہے۔ وہ مردانِ مخلص و بے ریا کی خدمات کو نظرانداز نہیں کرتی۔ وہ نہ حقائق کو چھپاتی ہے نہ کسی کی بزرگی و پاکدامنی پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ جب تک تاریخ کی شہادت موجود ہے، سید الشہداء امام حسینؑ کی طہارت و عصمت، ان کے ایمان و تقویٰ اور ان کی دینداری و خدا پرستی میں شک کی گنجائش نہیں اور نہ ان کے دشمنوں کی ستمگری و خود پرستی پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ یاوہ گوئی اور لغو نویسوں کے قلم اور زبان کتنے ہی افسانے تراشیں تاریخ کا قطعی اور محکم فیصلہ نہیں بدلا جا سکتا۔ جہاں شک ہو وہ اسی محکم فیصلے کی روشنی میں دُور کیا جا سکتا ہے۔

قریہ قریہ موجِ خوں بیکر بھری ہے یوں شفق
جیسے سورج کے تعاقب میں پھرے دورِ فلک
طلعتِ شبیرؑ نے چیرے ہیں لاکھوں شب کدے
تب کہیں پہنچا ہے سورج کربلا کی صبح تک

امامؑ کے الفاظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ وہ پیش آنے والے واقعات پر اظہار رنج والم کرنا چاہتے تھے نہ لوگوں کو متاثر کرنا مقصود تھا۔ ان کے مدِ نظر مختصر جملوں میں دشمنانِ اہلِ بیتؑ کو شرمندہ کرنا اور انکے مظالم کو بے نقاب کرنا تھا۔

پھر چند جملوں کے بعد آپ نے فرمایا:

"لوگو! ہمارے ساتھ کافروں اور مرتدوں کا سا سلوک کیا گیا ہے حالانکہ ہم نے نہ کوئی گناہ کیا تھا نہ کسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے اور نہ ہم نے اسلام سے بے وفائی کی تھی۔ بخدا اگر رسولِ خداؐ نے ہمارے خلاف جنگ کا حکم دیا ہوتا تو یہ لوگ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کرتے۔"

امامؑ کا خطبہ ختم ہوا تو اہلِ بیتِ عصمت وطہارت اپنے گھروں کو آگئے۔ انھوں نے راہِ حق میں ثابت قدمی اور جاں بازی کا اعزاز ہمیشہ کے لیے حاصل کر لیا تھا۔ ان کے دشمنوں کا نام ظالموں اور جابروں کی فہرست میں درج ہو چکا تھا۔ ان کا اعزاز اور دشمن کی بدنامی تاریخ کا حصہ بن چکے تھے، نہ کوئی تاریخ کو مسخ کر سکتا ہے نہ بنی ہاشم کی نیک نامی کو مٹا سکتا ہے اور نہ غیروں کی رسوائی اور بدنامی کا داغ دھویا جا سکتا ہے۔ اہلبیتؑ کی گفتگو اور تقریریں جو انھوں نے مدینہ سے مکہ، مکہ سے عراق، عراق سے شام، شام سے مدینہ تک کیں، تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں۔ اب یہ ممکن نہیں کہ تاریخ کا چہرہ مسخ کر دیا جائے۔ شہیدانِ راہِ خدا اور باطل پرستوں کے کردار گڈمڈ کر دیے جائیں۔ نیک نامی کا جامہ جانبازوں کی بجائے ستم گروں کو پہنا دیا جائے۔ فضائل سے عاری لوگوں کو تاریخ میں جواں مرد وجانباز کے روپ میں پیش کیا جائے تاریخ ناشکری

عرفی اگر بگریہ میسّر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

معاویہ نے کہا تھا کہ علی بن ابی طالبؑ کے بعد زمانہ بانجھ ہوگیا ہے۔ وہ اب ایسا بطلِ جلیل پیدا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح امام حسینؑ جیسا فرزند پیدا کرنا بھی ناممکن ہے کیونکہ اگر ویسے ہی والدین ہوں اور ویسا ہی بیتِ عصمت وطہارتؑ ہو تو امام حسینؑ جیسا فرزند وجود میں آتے۔ جلد یا بدیر ہر نقصان کی تلافی ہوجاتی ہے مگر ان شخصیتوں کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے جن کو وجود میں لانے والے سازگار حالات کے اب پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

مدینہ واپسی پر امامؑ کا خطبہ

آخر میں اس خطبے کا نقل کرنا بھی ضروری ہے جو امام سجادؑ نے مدینہ کے باہر دیا تھا اور جس میں اس مقدس سفر کی روداد اہل مدینہ سے بیان کی تھی۔

امامؑ نے خدا کی حمد وثنا کے بعد روح فرسا مصائب پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ان چند مختصر جملوں میں واقعاتِ عاشورا کا خلاصہ بیان کیا۔

"ہر حال میں خدا کا شکر ہے۔ اس نے ہمیں بڑی مصیبتوں میں مبتلا کیا۔ اسلام میں بڑا رخنہ پڑ گیا ہے۔ میرے والد ابو عبداللہ اور ان کے عزیز اور ساتھی قتل ہوگئے۔ ان کی خواتین اور فرزندوں کو قیدی بنالیا گیا۔ میرے والد کے سر کو نیزے پر شہر بہ شہر گھمایا گیا۔ یہ ایسا سانحہ ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔"

کرتے وقت یزید نے امام سجادؑ کو بلایا اور ان سے کہا کہ ابنِ مرجانہ پر خدا کی مار، اگر آپ کے والد سے میری ملاقات ہو جاتی تو وہ جو کچھ تجویز پیش کرتے میں قبول کر لیتا اور حتی الامکان انھیں قتل نہ ہونے دیتا مگر مقدر میں یہی تھا کہ ایسے ہو۔ میری خواہش ہے کہ جب بھی کوئی ضرورت ہو آپ مدینہ سے مجھے لکھیں۔ یزید نے یہ بات کچھ نیکی کی نیت سے نہیں کہی تھی۔ وہ ابن زیاد کا ممنون تھا کہ اس نے امامؑ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور اس نے خود ابن زیاد کے خط کے جواب میں اسیرانِ اہلبیتؑ کے متعلق لکھا تھا کہ انھیں شام بھیج دو۔ یزید کی ابن زیاد پر لعنت صرف سیاسی مصلحت اور عوامی دباؤ کا نتیجہ تھی۔ امامؑ نے شام کے بازار میں ایک شامی کے جواب میں جو تقریر کی تھی اور جو آیات تلاوت کی تھیں، انھوں نے اپنا کام دکھایا تھا۔ یہاں تک کہ دمشق اور خود خلیفہ کے اپنے گھر میں مجلسِ عزا منعقد ہوئی تھی۔ شامی خواتین بھی فاجعۂ کربلا کی نوعیت سے باخبر ہو چکی تھیں اور شاید محرم ۶۱ھ کے اختتام سے قبل ہی اکثر بلادِ اسلامی میں شہادتِ سید الشہداءؑ کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور لوگوں کو صحیح واقعات کا علم ہو گیا تھا۔ دربارِ خلافت کی گرج چمک ٹھنڈی پڑی تو لوگوں کو ہوش آیا۔ وہ امامؑ کی مدد نہ کرنے پر خود اپنے آپ کو ملامت کرتے تھے اور اپنی ناقابلِ تلافی کوتاہی پر پچھتا رہے تھے۔ شدہ شدہ لوگوں کی یہ رائے ہو گئی جس کی بنا پر اہل کوفہ نے شہادتِ امامؑ سے پہلے امامؑ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ فتنے کے بادل چھٹے تو لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور تلافیٔ مافات کے درپے ہوئے۔ اگرچہ امام حسینؑ کا ہاتھ سے جاتے رہنا نقصانِ عظیم تھا جس کی آہ و زاری، پشیمانی اور ندامت سے تلافی ناممکن تھی۔

تو نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کی رسوائی کا داغ کبھی نہیں دھل سکتا اور یہ بدنامی کبھی نیک نامی میں نہیں بدل سکتی۔" دخترِ زہراؑ نے یزید کو تاریخ کی طاقت کی طرف توجہ دلائی اور اسے بدنامی اور رسوائی سے ہوشیار رہنے کے لیے کہا، لیکن یزید تو عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس نے حضرت زینبؑ کی گفتگو سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا نہ وہ یہ اندازہ لگا سکا کہ آگے چل کر تاریخ کیا کہے گی۔ اس موقع پر یزید اس حدیث کا مصداق تھا جو سیوطی نے جامع الصغیر میں رسولِ خدا سے روایت کی ہے کہ جب اللہ مقدر کا فیصلہ نافذ کرنا چاہتا ہے تو عقلمندوں کی عقل سلب کر لیتا ہے اور جب قضا و قدر کا فیصلہ نافذ ہو چکتا ہے تو ان کی عقل لوٹا دیتا ہے۔ اس وقت وہ پچھتاتے ہیں۔ اگر یزید کی عقل نہ ماری گئی ہوتی تو وہ سمجھتا کہ فرزندِ رسولؐ اور ان کے عزیزوں کو قتل کر کے وہ مسلمانوں پر حکومت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ یہ بات بھی نہیں سمجھ سکتا تھا تو اتنا تو اسے شعور ہونا چاہیے تھا کہ کھلم کھلا اسلام پر حملہ نہ کرتا، فرزندانِ رسولؐ سے انتقام لینے کی بات نہ کرتا۔ وحیِ آسمانی اور حضرت محمدؐ کی پیغمبری سے انکار نہ کرتا۔ غرض ثانیِ زہراؑ نے اپنے خطبے کے آخر میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا:

"اس خدا کا شکر ہے جس نے جوانانِ جنت کے سرداروں کا انجام مغفرت اور رحمت قرار دیا۔ جس نے جنت کو ان کی آرامگاہ بنایا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کو زیادہ سے زیادہ اپنے فضل اور رحمتوں سے نوازے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

یہی خطبے تھے جنھوں نے یزید کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ظاہر داری کے طور پر ہی سہی، ابنِ زیاد سے بیزاری کا اظہار کرے۔ لکھا ہے کہ اہلبیتؑ کو مدینہ روانہ

اس کا فرزند ہوں جس نے اپنی ردا میں حجرِ اسود کو اٹھایا۔"

تاریخ کے دوسرے صفحے پر یہ بھی تحریر ہے کہ یزید نے کہا تھا کہ بنی ہاشم نے لوگوں کو اس بہانے بیوقوف بنا کر حکومت کرنی چاہی ورنہ نہ کوئی خبر آئی نہ وحی اتری۔ اگر یزید کو خدا اور رسولؐ کی شرم نہیں تھی تو کیا وہ تاریخ کی طاقت سے بھی نہیں ڈرتا تھا؟ کیا اسے یہ خوف نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے "تاریخ میں لکھ لیا جائیگا۔

لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، قومیں بدلتی رہتی ہیں لیکن قوموں کے عروج، زوال اور حکومتوں کے بدلنے کا تاریخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تاریخ اپنی جگہ باقی رہتی ہے، افراد اور قوموں کے اچھے برے اعمال کی نگرانی کرتی ہے اور ایک کا قصور دوسرے کے سر نہیں منڈھتی۔

قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

"یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ ان کا کیا ہوا ان کے کام آئے گا اور تمھارا کیا ہوا تمھارے کام آئے گا اور تم سے ان کے کیے ہوئے کی پوچھ گچھ بھی نہیں ہوگی۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۴۱)

دخترِ امیر المومنینؑ حضرت زینبؑ نے اپنی اس تقریر میں جس کا ایک حصہ ہم گزشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں پہلے تو یزید کو عذابِ آخرت سے ڈرایا اور پھر دنیا اور تاریخ کے حساب کی طرف توجہ دلائی۔

وہ یہ کہنا چاہتی تھیں کہ اگر تو خدا سے نہیں ڈرتا اور یوم حساب پر تیرا ایمان نہیں یا گناہوں کے نتیجے میں تیرا ایمان جاتا رہا تو تاریخ کے حساب سے تو ڈر۔ حضرت زینب کبریٰؑ کے پیش نظر یہی مطلب تھا جب انھوں نے کہا: "یزید تو اپنی چالاکیاں کیے جا۔ تجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہو کوشش کر دیکھ۔ خدا کی قسم،

مسجدِ شام میں دیے گئے خطبے کی تفصیل

آپ نے وہ خطبہ دیکھا جو امام سجادؑ نے دارالحکومت میں دیا تھا۔ اس کے لفظ لفظ سے امامؑ کی صاف گوئی، دلیری اور بلند حوصلگی کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ تقریریں اور خطبات کسی جذباتی دباؤ یا ذہنی پریشانی کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ اپنے سفر شہادت و اسیری میں اہلبیتؑ نے موقع اور ضرورت کے لحاظ سے عین اس نقشے کے مطابق دیے تھے جو پہلے سے ان کے ذہن میں تھا جس طرح امام حسینؑ بخوبی جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اسی طرح دیگر اہلبیتؑ کو بھی مکمل بصیرت حاصل تھی۔ جہاں بولنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے بولتے تھے۔ اپنے تمام رنج و غم، افسردگی و پریشانی کو بھلا کر اس طرح حقائق کو بے نقاب کرتے تھے کہ پھر کسی ہیر پھیر کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ ہاں یہ بات یقینی ہے کہ اس وقت کے بیشتر لوگ ان تقریروں کی اہمیت اور ان کے مقصد کی گہرائی سے واقف نہیں تھے۔ بہت سے لوگ امام سجادؑ کے متعلق بھی یہی خیال کرتے تھے کہ غم کی شدت سے جذباتی ہو رہے ہیں، تقریریں اور واویلا کر رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ سکون ہو جائے گا اور سب بھول بھال جائیں گے لیکن تاریخ نے نہ صرف امامؑ کا خطبہ محفوظ رکھا بلکہ یزید کی گفتگو اور اس کے اشعار بھی پہلو بہ پہلو محفوظ کر لیے۔ امام سجادؑ نے دمشق میں بڑے فخر سے کہا تھا:

"میں فرزندِ مکہ و منیٰ ہوں، میں فرزندِ زمزم و صفا ہوں، میں

کے سبطین یعنی حسنؑ اور حسینؑ ہم میں سے ہیں۔ اس امت کے مہدیؑ یعنی امام آخرالزماں ہم میں سے ہیں۔ اب جبکہ یہ صورت ہے تو یزید کو چاہیے کہ اگر ہو سکے تو پہلے یہ اعزازات ہم سے چھین کر اپنے نام درج کرائے۔ بالفاظِ دیگر اگر ہو سکے تو تاریخ کو بدل دے تاکہ ہمارے اعزازات اُسے مل جائیں اور اس کی بدنامی اور بے دینی فراموش ہو جائے۔ اگر ایسا ممکن ہو تو یزید ہم سے اُلجھے ورنہ جب تک یہ اعزازات ہمیں حاصل ہیں اور نامورانِ بنی ہاشم جیسے ابوطالبؑ ان کے بھائی حمزہؓ، ان کے بیٹے علیؑ اور جعفرؓ، فرزندانِ امیرالمومنینؑ حسنؑ اور حسینؑ کو اسلام کے سچے خدمت گزاروں کی حیثیت حاصل ہے۔ کوئی ہمیں کیسے بدنام کر سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر خود رسولؐ اللہ ہاشمی ہیں۔ ہمارا حق کسی اور کو کیسے مل سکتا ہے۔ لوگوں کے دل جو ہمارے ساتھ ہیں وہ کیسے پھیرے جا سکتے ہیں۔ آخر تنگ آ کر یزید نے مؤذن کو اذان دینے کا حکم دیدیا۔ امامؑ بھی احتراماً خاموش ہو گئے مگر انھیں ایک اور موقع ملا اور اس سے بھی انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ جب موذن نے کہا: "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔ امامؑ نے عمامہ سر سے اتار کر کہا: اے مؤذن تجھے انہی پیغمبرؐ کی قسم جن کا تو نام لے رہا ہے۔ ذرا خاموش رہ۔ پھر یزید کی طرف دیکھ کر کہا یہ رسولِ کریمؐ تیرے جد ہیں یا میرے۔ اگر تو کہتا ہے کہ تیرے جد ہیں تو سب کو معلوم ہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ اگر تو مانتا ہے کہ یہ میرے جد ہیں تو تُو نے میرے باپ کو کیوں قتل کیا؟ ان کا مال کیوں لوٹا؟ ان کی خواتین کو قیدی کیوں بنایا؟ پھر ہاتھ بڑھا کر امامؑ نے اپنا گریبان چاک کر لیا اور سلسلۂ گفتگو جاری رکھا یہاں تک کہ افراتفری اور شوروغوغا میں مجلس ختم ہوئی اور لوگ منتشر ہو گئے۔

دولت، طاقت اور دوسرے مادی امتیازات پر تھا۔ روحانی عظمت، مکارم اخلاق اور دوسرے فضائل انسانی کی ان کے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ حجاز کیا ساری دنیا کا سب سے بڑا آدمی محمدؐ ہے، ولید بن مغیرہ نہیں۔

امام سجادؑ نے اپنے خطبے میں ان اسباب پر روشنی ڈالی جن کی بنا پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر اور ایک قوم کو دوسری قوم پر برتری اور فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ آلِ محمدؐ دوسروں سے برتر ہیں اور کوئی ان سے یہ برتری نہیں چھین سکتا نہ کوئی ان کی برابری کر سکتا ہے، کیونکہ یہ برتری انہیں خدا نے دی ہے۔ اسی نے انہیں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت کے لیے چنا ہے۔ امام سجادؑ نے کمال جرأت سے صاف صاف کہا:

"لوگو! ہمیں چھ خوبیاں عطا ہوئی ہیں اور سات خصوصیتوں کی وجہ سے ہمیں دوسروں پر برتری حاصل ہے۔ ہمیں جو خوبیاں عطا ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں: علم، بردباری، فیاضی، فصاحت، شجاعت اور مومنوں میں مقبولیت۔

یعنی مومنوں کے دلوں میں ہماری محبت ہے جو خدا نے ان کے دلوں میں ڈالی ہے، یہ زور زبردستی سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ زبردستی کسی کو عقیدتمند نہیں بنایا جا سکتا۔ آپ یزید کو بتلانا چاہتے تھے کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ باایمان لوگ ہم سے محبت کریں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کو پسند کریں اور ہمیں دشمن سمجھیں۔

پھر آپ نے فرمایا کہ ہمیں اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ نبیٔ مختار محمدؐ ہم میں سے ہیں۔ ان کے وصی علیؑ بن ابی طالب ہم میں سے ہیں۔ شیر خدا اور شیر رسولؐ حمزہؓ بن عبدالمطلب ہم میں سے ہیں۔ جعفر طیارؓ ہم میں سے ہیں۔ اس امت

شخص جسے بغیر بتلائے خود ہی راستہ نہ سوجھے۔" (سورہ یونس۔آیت ۳۵)

اس آیت میں کوئی دلیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ مقصود صرف لوگوں کو اس عقلی قاعدے کی طرف توجہ دلانا ہے کہ قوم کا رہبر وہ ہونا چاہیے جو دوسروں کے مقابلے میں راہِ راست سے زیادہ واقف ہو اور جو خود رہبری کا محتاج ہو وہ دوسروں کی رہنمائی کیا کریگا۔ ع

آنکہ خود گم است کرا رہبری کند

مشرکین مکہ ہر چند کہ رسول اسلامؐ کو پیغمبر نہیں مانتے تھے مگر وہ اس عقلی قاعدے کے منکر نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی پیغمبر آنا ہی ہے تو اس کام کے لیے قوم کے کسی بڑے کا انتخاب ہونا چاہیے البتہ بڑائی سے کیا مراد ہے۔ اس معاملے میں وہ غلط فہمی کا شکار تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بڑا وہ ہے جس کے پاس بہت مال و دولت ہو یا بہت سے بیٹے اور بھائی بند ہوں یا طاقت ہو جس سے وہ اپنی بڑائی اور برتری کا سکہ دوسروں پر بٹھا سکے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر خدا ہم اہلِ حجاز کے لیے کوئی پیغمبر بھیجنا چاہتا تھا تو پھر مکہ کے سربرآوردہ شخص یعنی ولید بن مغیرہ مخزومی یا طائف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی کو کیوں نہیں بھیجا۔

"انھوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دو بستیوں کے بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔" (سورہ زخرف۔آیت ۳۱)

مشرکین مکہ یہ توضیح کہتے تھے کہ آسمانی کتاب حجاز کے کسی بڑے آدمی پر نازل ہونی چاہیے تھی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن غلطی یہ تھی کہ وہ ولید یا عروہ کو بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک بڑائی اور برتری کا دارومدار

سے منبر نہیں بن جاتا۔ یہ لکڑیاں تو یہاں اس لیے رکھی گئی ہیں کہ منبر کا جو مقصد ہے اسی کو ختم کر دیا جائے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو خطیب کا روپ دھار کر کسی منبر نما چیز پہ چڑھ کر خطاب کرتا ہے مبلغ دین نہیں کہلا سکتا۔ یہ خطیب جو دنیا کی خاطر دین کو بیچ رہا ہے اور مخلوق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خدا کے غضب کو دعوت دے رہا ہے، دوزخی ہے۔ امام علیؑ جیسی ہستی کی بدگوئی سے خدا ہرگز خوش نہیں ہو سکتا، نہ یزید کی حمد و ثنا سے خدا کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ ایسی باتیں کہوں جو سامعین کے لیے موجب اجر اور ثواب ہوں یعنی جو باتیں خطیب کر رہا ہے وہ راہِ راست سے بھٹکانے والی ہیں اس لیے ان کا نتیجہ سوائے گناہ اور بدبختی کے کچھ نہیں۔ غرض لوگوں نے امامؑ کو تقریر کی اجازت دینے کے لیے یزید سے اصرار کیا مگر وہ برابر انکار کرتا رہا اور آخر کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ علم و دانش ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اگر میں نے اسے موقع دیا تو یہ مجھے ذلیل کر دیگا لیکن آخر لوگوں کے اصرار نے اپنا کام کیا اور امام سجادؑ نے منبر پہ قدم رکھا اور پھر اس طرح گفتگو کی کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں اور آنسوؤں کا سیلاب آ گیا۔ انھوں نے اسلامی نظام اور اہلبیتؑ کے مرتبے پر روشنی ڈالی اور ان کے فضائل و مناقب سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک عقلی قاعدے سے بھی استفادہ کیا جس پر سب عقلا کا اتفاق ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص رہبری اور پیشوائی کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں سے برتر و ممتاز ہو اور اس امتیاز کی بنا پر ہی رہبر چنا جائے۔ اسی قاعدے کی بنیاد پہ قرآن کہتا ہے:

"جو شخص حق کا راستہ بتلاتا ہو آیا وہ اتباع کے لائق ہے یا وہ

ملحوظِ خاطر رکھیں۔ خدا کا پیغام بے کم و کاست مخلوقِ خدا تک پہنچائیں مخلوق کی خوشامد میں کوئی ایسی بات زبان پر نہ لائیں جو خدا کی ناراضگی کا باعث ہو اور اس فرمانِ خداوندی پر پورا یقین رکھیں:

"ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو خیالات اس کے دل میں آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ نامۂ اعمال لکھنے والے دو فرشتے اس کے دائیں بائیں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ کوئی لفظ منہ سے نکالنے بھی نہیں پاتا کہ نگراں فرشتہ تیار رہتا ہے"۔ (سورۂ قٓ۔ آیت ۱۶ تا ۱۸)

یہ خدا کا فرمان ہے۔ امام سجادؑ بھی خدا ہی کی جانب سے اس طرف توجہ دلا رہے تھے کہ انسان کا ہر اچھا برا عمل لکھا جاتا ہے۔ کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے خدا کے غضب کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور اس دن کو نہیں بھولنا چاہیے جب یہ شخص جسے آج تم بہت طاقتور سمجھ رہے ہو کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔

امام سجادؑ نے خطیب کو ملامت کرنے اور اس کی بیجا گفتگو پر اسے سرزنش کرنے کے بعد یزید کی طرف رخ کیا اور کہا: مجھے اجازت ہے کہ میں بھی ان لکڑیوں پر کھڑا ہو کر کچھ کہوں جس سے خدا بھی خوش ہو اور سامعین کے لیے بھی اجر و ثواب کا باعث ہو۔

قارئین! امامؑ کے اس مختصر جملے میں بہت ہی لطیف طنز پنہاں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ امامؑ کو جو کچھ کہنا تھا اس کا خلاصہ اسی مختصر جملے میں آگیا۔ اول تو انھوں نے منبر نہیں لکڑیاں کہا۔ مقصد یہ تھا کہ محض منبر کی شکل بنالنے

کے چالیس سالہ پروپگنڈے کا موثر اور کافی جواب نہیں ہوسکتی تھیں اس لیے ضروری تھا کہ خود اہلبیتؑ اس شہر کے لوگوں سے ملیں اور ان کی غلط فہمیاں دور کریں۔ بنی ہاشم کے ممتاز افراد نے اسلام اور مسلمانانِ عالم کی جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں ان کا زندہ ثبوت پیش کریں اور بنی امیہ کی رسولِ خدا اور مسلمانوں سے شرمناک دشمنی کا پردہ چاک کریں۔ یہی وجہ ہے کہ امام سجادؑ نے منبر و مجلس کے آراستہ ہونے کو غنیمت سمجھا۔ اگرچہ وہ مجلس آپ کے والد امام حسینؑ اور دادا امیرالمومنینؑ کی بدگوئی کے لیے منعقد کی گئی تھی لیکن آپ اس میں شریک ہوئے۔ آخر خطیب منبر پر آیا اور حمد و ثنا کے بعد امام علیؑ اور امام حسینؑ کے خلاف خوب زبان درازی کی اور معاویہ اور یزید کی تعریف میں بکواس کی حد کر دی اور ہر اچھی بات کو ان سے منسوب کیا۔ گویا یہی دونوں باپ بیٹے فضائل و مکارم کا سرچشمہ تھے۔ لوگوں کے پاس جو کچھ تھا وہ آلِ ابوسفیان ہی کا عطیہ تھا۔ دین و دنیا کی بھلائی انہی لوگوں پر موقوف تھی اور خدائے متعال کی رضا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ انہی لوگوں کا اتباع تھا۔

یہ موقع تھا کہ امام سجادؑ نے بلاخوف و خطر بہ آوازِ بلند فرمایا: او بدبخت خطیب! تو کیوں مخلوق کو خوش کرنے کے لیے خدا کی ناراضگی مول لے رہا ہے۔ تیرا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

ہر چند اس جملے میں امامؑ کا روئے سخن دمشق کے خطیب کی طرف تھا جو یزید کو خوش کرنے کے لیے خدا کو ناراض کر رہا تھا اور دوزخ کا راستہ اختیار کر رہا تھا لیکن اس میں ہر مقرر کے لیے نصیحت ہے اور سب مسلمان مقررین کو ہوشیار کیا گیا ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں صرف خدا کی رضامندی کو

سچ تو یہ ہے کہ ان تقریروں کی کامیابی کے لیے مناسب فضا بزرگ صحابی ابوذر غفاریؓ کی کوششوں نے پہلے ہی پیدا کردی تھی۔ اہلبیتؑ کی شام میں آمد سے اور دمشق میں ان کی گفتگو سن کر لوگوں کے دلوں میں اس بے جگری کی یاد تازہ ہوگئی جس سے ابوذرؓ نے معاویہ کی بے راہ روی کا مقابلہ کیا تھا۔

ابوذرؓ بڑے صاف گو، دلیر اور متدین صحابی تھے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ دربار خلافت اپنی ڈگر سے ہٹ گیا ہے تو انھوں نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا، نکتہ چینی کی اور خلیفہ کے حاضر و غائب پر کوچہ و بازار میں ہر جگہ تنقید کی۔ غلط نہیں ہوگا کہ اس قسم کی اسلامی تحریکوں کا بانی انھیں سمجھا جائے کیونکہ وہ صحابیٔ رسولؐ اور تاریخی ترتیب کے لحاظ سے دوسروں سے مقدم تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابوذرؓ شہر بدر کیے گئے، تکلیفیں اٹھائیں اور آخر مدینہ سے دور کسمپرسی کی حالت میں ربذہ میں وفات پائی لیکن وہ اس حالت میں بھی کبھی خاموش نہیں بیٹھے۔ جب تک ہو سکا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

معاویہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد کچھ اور لوگوں نے ابوذرؓ کے کام کو جاری رکھا۔ ابوذرؓ وفات پا چکے تو حجر بن عدی کندیؓ نے ان کی جگہ لے لی اور جو کہنا چاہیے تھا وہ کہا۔ بڑی دلیری اور جرأت سے اس حکومت کا مقابلہ کیا جس نے اسلام کے نام پر امیرالمومنینؑ کے خلاف دشنام طرازی کو مذہبی فریضہ قرار دیدیا تھا بلکہ عبادات کی مقبولیت کی شرط ٹھہرایا تھا۔ اسی جدوجہد میں انھوں نے جان دیدی۔ حجرؓ، دمشق نہیں پہنچ سکے۔ دمشق کے نزدیک مرج عذراء کے مقام پر ہی انھیں قتل کر دیا گیا لیکن وہ وہیں اپنی بات کہتے اور امام علیؑ کا دفاع کرتے رہے مگر ابوذرؓ ہوں یا حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی، ان کی کوششیں اموی حکومت

اہلبیتؑ سے بغض وعداوت کا مرکز رہا۔ ۶۱ھ میں کسی نہ کسی بہانے امام سجادؑ وہاں پہنچے تو انھیں موقع ملا کہ براہِ راست لوگوں سے بات کرکے ان حقائق پر سے پردہ اٹھائیں جو پچھلے چھیالیس سال سے اہلِ دمشق کی نظروں سے اوجھل تھے۔ تقریر کرنے کا یہ موقع امامؑ کو یونہی نہیں مل گیا تھا بلکہ بڑی تکالیف اٹھانے کے بعد ہاتھ آیا تھا لیکن بڑا غنیمت تھا۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا کہ خود خلیفہ کے اصرار پر امیرالمومنینؑ اور امام حسینؑ کے فرزند دمشق آئیں اور اس منبر سے جو ان کے آباء کرام کی بدگوئی کے لیے وقف تھا، بنی امیہ کے چھیالیس سالہ مسموم پروپیگنڈے کا زور توڑیں اور ایک ہی تقریر میں ان لوگوں کا رنگ بدل دیں جو سالہا سال سے گمراہی میں مبتلا تھے۔ اہلِ شام نے تو اس سے قبل ان مقدس بزرگوں کے نام بھی کم ہی سنے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس وقت تک بیشتر اہلِ شام کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسلام میں سید الشہداء حمزہؓ بن عبدالمطلب کا لقب ہے یا یہ کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ امام سجادؑ اور ان کی پھوپھی زینبؑ کو موقع میسر آتا یا یہ موقع جو انھیں ملا تھا وہ اس سے فائدہ نہ اٹھاتے تو خلافتِ بنی امیہ کے خاتمے یعنی ۱۳۲ھ تک کوئی دمشق کے ناسازگار ماحول میں بزرگانِ اہلبیتؑ کی عظمت کی بات بھی کر سکتا یا اسلام کی قابلِ قدر شخصیتوں کی حیثیت سے ان کا تذکرہ کر سکتا لیکن ان تقریروں کے بعد یہ صورت ہوئی کہ بنی امیہ کی ہزار ماہانہ حکومت جس میں امیرالمومنینؑ کے دوستوں نے بڑے دکھ اٹھاتے تھے اور مصیبتیں جھیلی تھیں وہ تو ختم ہو گئیں لیکن ان کی تقریروں کا اثر اسی طرح قائم و دائم رہا۔

کو نقصان پہنچانے کی نیت سے کھیلا گیا تھا مگر اس ڈرامے کو کھیلنے والے یہ نہ سمجھ سکے کہ جو صورت بھی پیش آئے اہلِ حق اس سے کچھ فائدہ ہی اٹھاتے ہیں اور ان کی تباہی کے لیے جو نقشہ بھی بنایا جائے وہ اللہ کے فضل و کرم سے ان کے استحکام ہی کا سبب بنتا ہے۔ اس شہر میں امام سجادؑ کی تقریر کی خاص طور پر بہت ضرورت تھی کیونکہ شہر دمشق جب سے مسلمانوں نے فتح کیا اس وقت سے لیکر اسیرانِ اہلبیتؑ کے وہاں پہنچنے تک یعنی چھیالیس سال سے مسلسل بنی امیہ کے زیر اثر چلا آرہا تھا اور وہاں کی اسلامی حکومت پر ہمیشہ اہلبیتؑ کے دیرینہ دشمنوں یعنی امویوں کا تسلط رہا تھا۔

سنہ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر کی وفات سے چار روز قبل مسلمان مجاہدین نے خالد بن ولید کی سرکردگی میں دمشق کا محاصرہ شروع کیا تھا۔ حضرت عمر نے خلیفہ ہونے کے بعد خالد بن ولید کو برطرف کر دیا۔ خالد کی جگہ ابو عبیدہ نے لے لی۔ ایک سال اور کچھ دن دمشق کا محاصرہ جاری رہا۔ رجب سنہ ۱۴ھ میں مسلمان دمشق کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئے۔ دمشق کی امارت کچھ مدت یزید بن ابی سفیان کے پاس رہی۔ سنہ ۱۸ھ میں یزید کے طاعونِ عمواس میں فوت ہونے پر حضرت عمر نے یزید کے بھائی معاویہ کو دمشق کا امیر مقرر کر دیا۔ سنہ ۱۸ھ سے سنہ ۳۵ھ یعنی امیر المومنینؑ کی حکومت کے آغاز تک شام کی حکومت بدستور معاویہ ہی کے ہاتھ میں رہی۔ امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ کی پنجسالہ حکومت کے دوران میں بھی یہی صورت رہی اور دمشق اہلبیتؑ سے دشمنی کا مرکز بنا رہا۔ سنہ ۴۱ھ میں امام حسنؑ کے دستبردار ہونے پر دمشق اسلامی حکومت کا دارالخلافہ بن گیا اور اگلے بیس سال یعنی سنہ ۶۱ھ تک پہلے سے بڑھ کر بنی ہاشم خصوصاً

یعقوبی نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے رسولِؐ خدا سے درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے ساتھ مدینہ چلیں اور عہد کیا تھا کہ اپنے اور بیگانے، گورے اور کالے ہر ایک کے مقابلے میں آپ کا ساتھ دینگے۔ عباس بن عبدالمطلب نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے ان سے معاہدہ کر لینے دیجیے۔ آنحضرتؐ نے اپنے چچا کو اجازت دیدی۔ عباس نے ان سے عہد لیا کہ رسولِؐ خدا اور ان کے ساتھیوں کی اسی طرح حفاظت کرینگے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے اور پرائے، گورے اور کالے ہر ایک کے مقابلے میں ان کا ساتھ دینگے۔ رسولِؐ خدا نے بھی وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنے عہد پہ قائم رہیں گے تو انکی جگہ جنت ہوگی۔

تاریخ عاشورا کی سند

تاریخ عاشورا کے سلسلے میں ایک قیمتی حوالہ جو سند کا کام دیتا ہے وہ خطبہ ہے جو امام سجادؑ نے دمشق میں ۶۱ھ میں دیا تھا۔ غالباً یہ خطبہ خاص دمشق کی جامع مسجد میں دیا گیا تھا۔ امام سجادؑ کو ایک مناسب موقع ملا تھا جس سے انھوں نے بہترین طریقے سے فائدہ اٹھایا۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امامؑ کو بہترین موقع اس دن ملا جب خلیفۂ وقت کے سرکاری خطیب نے منبر پہ امام علی ابن ابی طالبؑ اور ان کے فرزندوں کی بدگوئی کی اور معاویہ اور فرزندانِ معاویہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کیے۔ یہ ڈرامہ خود یزید نے کھیلا تھا۔ اسی نے حکم دیا تھا کہ خطیب منبر پہ آکر اہلِ شام کو امام حسینؑ اور ان کے پدرِ گرامیؑ کے معائب سے آگاہ کرے۔ (العیاذ باللہ) یہ ڈرامہ بھی بہت سے ایسے ڈراموں کی طرح اہلِ حق اور تحریکِ حق

اگلے سال یعنی ۱۲؁ سالِ بعثت میں اہل مدینہ میں سے بارہ اشخاص نے عقبہ کے پاس منیٰ میں رسولِ خدا سے بیعت کی۔ ان میں سے پانچ تو وہی پچھلے سال والے تھے اور سات دوسرے تھے۔ ان سب سے رسول اللہ نے اس بات پر بیعت لی کہ کسی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کرینگے، زنا نہیں کرینگے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کرینگے، حرام کے بچے پیدا نہیں کرینگے، حرام کاموں میں رسول اللہ کی نافرمانی نہیں کرینگے۔ رسولِ خدا نے بھی ان سے وعدہ کیا کہ اگر تم اپنی بات پر قائم رہے تو تمھیں جنت ملیگی۔ اگر تم نے ان میں سے کوئی گناہ کیا اور تم پر حد جاری ہوگئی تو وہ حد اس گناہ کا کفارہ ہو جائے گی۔ اگر جرم چھپا رہا تو پھر تمھارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو سزا دے اور چاہے تو معاف کردے۔ یہ بارہ اشخاص یثرب جانے لگے تو آنحضرت نے مصعب بن عمیر عبدری رضؓ کو ان کے ساتھ کردیا تاکہ اسلام کی تبلیغ کریں اور جو کوئی مسلمان ہو جائے اسے قرآن پڑھائیں۔ مصعب کی تبلیغ سے مدینہ میں اس طرح اسلام پھیل گیا کہ اوس و خزرج کا کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جس میں کچھ مسلمان مرد اور عورتیں نہ ہوں۔

۱۳؁ سالِ بعثت میں کچھتر مسلمان مرد اور عورتیں منیٰ میں عقبہ کے نزدیک رسولِ خدا کے پاس جمع ہوگئے اور رسولِ خدا کے چچا عباس کی موجودگی میں آنحضرت سے بیعت کی۔ یہ بیعت آدھی رات کو مناسکِ حج ختم ہونے کے بعد انجام پائی۔ اس وقت تک عباس مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن انھیں اپنے بھتیجے کی سلامتی سے دلچسپی تھی اس لیے وہ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اہل مدینہ سے عہد لیا کہ وہ اپنی بات پر قائم رہیں گے اور بیوفائی نہیں کرینگے۔ عباس نے کہا کہ اگر تمھیں ذرا بھی اندیشہ ہو کہ وعدہ پورا نہیں کرسکو گے تو رسولِ خدا کو بلاوجہ انکے گھر سے مت لیجاؤ۔

میں تم سے بات کروں۔ وہ بیٹھ گئے تو آپ نے انھیں اسلام لانے کی دعوت دی اور قرآنِ حکیم کی کچھ آیات تلاوت فرمائیں۔ اہلِ یثرب رسولؐ اللہ کی گفتگو سن کر آپس میں کہنے لگے: بخدا یہ وہی پیغمبرؐ ہیں جن کی بعثت سے یہودی ہمیں ڈراتے ہیں۔ یہ چھ آدمی تھے جن کا تعلق قبیلۂ خزرج سے تھا۔ انھوں نے رسولؐ اللہ کی دعوت قبول کر لی اور وہیں اسلام لے آئے۔ پھر کہنے لگے کہ ہماری قوم میں آپس میں ناچاقی اور دشمنی ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی برکت سے آپس میں ہماری صلح صفائی ہو جائے۔ اب ہم یثرب واپس جاتے ہیں وہاں ہم لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں گے، ہو سکتا ہے کہ خدا انھیں ہدایت دیدے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم باعزت اور طاقتور ہو جائیں گے۔ ادھر تو اوس و خزرج کے قحطانی قبیلے اسلام قبول کر رہے تھے اور اپنے شہر میں رسولؐ اللہ کی ہجرت کا سامان کر رہے تھے، اُدھر آپ کے اپنے قبیلے قریش کے لوگ آپ کے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان کے خیال میں ان کی فلاح و بہبود رسولؐ اللہ کے قتل پر ہی منحصر تھی۔ سچ ہے جس کا اپنے ساتھ نہیں دیتے، اللہ اس کی مدد کے لیے غیروں کو آمادہ کر دیتا ہے۔

یہ چھ خزرجی مدینہ واپس آئے۔ رسولؐ اللہ سے ملاقات اور بات چیت کا حال ایک اہم خبر کے طور پر لوگوں کو سنایا اور انھیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ اسلام کے فوائد بیان کیے اور متوقع عزت، طاقت اور خوشحالی سے آگاہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یثرب میں اسلام پھیلنے لگا اور اوس و خزرج کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں رسولِ خداؐ کا چرچا نہ ہو۔ سب سے پہلے اسلام لانے والے انصاریوں کی تعداد بعض نے دو اور بعض نے آٹھ لکھی ہے۔

اپنی طاقت میں اضافہ کریں مگر قریش نے ایسی شرائط پیش کیں جو اُن کے لیے ناقابلِ قبول تھیں۔ اس کے بعد وہ طائف گئے اور قبیلۂ ثقیف سے مدد کی درخواست کی۔ انھوں نے بھی ٹال مٹول کی اور وہاں سے بھی خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ اسی اثنا میں رسولؐ اللہ نے ۴ سالِ بعثت سے علانیہ اپنی دعوت کا آغاز کر دیا تھا۔ دس سال تک متواتر آپ عرب کے میلوں مثلاً عکاظ اور ذوالمجاز میں اور حج کے موقع پر منیٰ اور مکہ وغیرہ میں لوگوں سے رابطہ قائم کرتے اور انھیں اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ رسولِ خدا ایک ایک قبیلے کے پاس جاتے اور کہتے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ایمان لاؤ گے تو دنیا میں عرب و عجم پر تمھاری حکومت ہو گی اور مرنے کے بعد جنت ملے گی مگر بجز یثرب کے ان دو قبیلوں یعنی اوس اور خزرج کے کسی کو آپ کی دعوت قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوئی اور بجز یثرب کے کوئی شہر بے خانماں مسلمانوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ صرف یہی ایک شہر تھا جس نے ہمیشہ کے لیے رسولِ خدا کے جسمِ اطہر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ۱۰ سالِ بعثت میں حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کی وفات کے بعد رسولِ خدا کا مکہ میں رہنا دشوار ہو گیا۔ طائف کے شہر نے بھی رسولؐ اللہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں آپ نے قبائل سے رابطہ کرنے کی اور زیادہ کوشش کی۔ اہلِ یثرب سے آپ کی دو مختصر ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ بعثت کے گیارھویں سال موسمِ حج میں منیٰ کے مقام پر آپ نے اہلِ یثرب کی ایک جماعت سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم قبیلۂ خزرج کے آدمی ہیں۔ آپ نے کہا کہ کیا یہودیوں سے تمھارا معاہدہ ہے؟ انھوں نے اقرار کیا۔ آپ نے کہا کہ ذرا بیٹھو تو

قبیلے رسول اللہ کی نصرت اور پذیرائی پر آمادہ ہو گئے اور توقع سے بڑھ کر پیغمبرِ اسلام کے لیے جاں نثاری کا ثبوت دیا۔ یہ عدنانی یا اسمٰعیلی نہیں تھے قبیلۂ قریش اور خاندانِ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے ساتھ ان کا کوئی نسبی تعلق نہیں تھا لیکن خدا نے انہی غیروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ پیغمبرِ اسلام کے لیے جو مکہ میں تنگ آ چکے تھے اور جن کا اپنے گھر میں رہنا ناممکن ہو گیا تھا اپنی آغوش وا کر دیں، انھیں اور ان کے اصحاب کو اپنے گھروں میں جگہ دیں اور انھیں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز سمجھیں۔ اس کے لیے اسبابِ پیغمبرِ اسلام کی ولادت سے سینکڑوں سال قبل ہی سے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

اوس اور خزرج

سدِ مآرب کی تباہی کے بعد یمن کی بہت سی اراضی ناقابلِ کاشت ہو گئی تھی اور بحیرۂ احمر کا سمندری راستہ کھل جانے کے باعث یمن کی اقتصادی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ ان دو اسباب کی بنا پر کئی یمنی قبائل جنوبی عرب سے ہجرت کر کے شمالی عرب میں وادی القریٰ اور یثرب کے علاقوں میں آ بسے۔ ان دو قبیلوں کو بھی اللہ نے کسی نہ کسی بہانے یثرب میں پہنچا دیا جہاں وہ مستقل طور پر آباد ہو گئے۔

جس دن سے یہ قبیلے مدینہ میں آ کر آباد ہوئے تھے ان کے درمیان جنگ برپا رہتی تھی۔ آخر یہ تنگ آ گئے اور انھیں خوف ہوا کہ اس طرح تو تباہ و برباد ہو جائیں گے اور یثرب کے یہودی قبائل بنی نضیر اور بنی قریظہ وغیرہ ان پر غالب آ جائیں گے۔ ناچار ان میں سے کچھ لوگ مکہ گئے تاکہ قریش سے مدد حاصل کر کے

کو اذیتیں دیں، بعض کو ہولناک طریقوں سے مار ڈالا۔ رسول اللہؐ کے متعلق بدزبانی اور یاوہ گوئی کی یہاں تک کہ آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ آپ کے ہجرت کر جانے کے بعد بھی یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور لڑائی چھیڑ دی۔ فتنے برپا کیے، آپ کے ساتھیوں کو قتل کیا، آپ کے خلاف یہودیوں کو اکسایا۔ انھیں عہد شکنی پر آمادہ کیا، بدوی قبائل میں اپنے شعراء بھیج کر انھیں ورغلایا یہاں تک کہ ۵ھ میں مشرکین مکہ نے بدویوں اور یہودیوں کا بارہ ہزار کا لشکر مسلمانوں پر حملے کے لیے اکٹھا کر لیا۔ یہ سب کام رسول اللہؐ کے اپنے قریشی اعزہ و اقرباء نے انجام دیا۔ وہی ناشکرے یہ سب کچھ کرتے رہے۔ ہجرت کے بعد بھی اپنی دشمنی سے باز نہیں آتے اور فتح مکہ تک جب ان میں بالکل دم نہیں رہا معاندانہ کارروائیاں کرتے ہی رہے۔ امیر المومنین امام علیؑ معاویہ کو لکھتے ہیں:

"ہماری قوم قریش نے ہمارے نبیؐ کو قتل کرنے اور ہمارا نام و نشان مٹانے کی کوشش کی۔ ہماری زندگی اجیرن کر دی۔ ہمارے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟ ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کیا۔ ہمیں ایک ناہموار پہاڑی میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور ہمارے خلاف جنگ کی آگ بھڑکائی۔" (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۹)

پہاڑی میں پناہ لینے پر مجبور کیا یعنی مکہ کی ایک گھاٹی "شعب ابیطالب" میں تین سال اور چند مہینے تک محصور و محبوس رکھا۔

یہ تھا رسول اللہؐ کے اپنے عزیزوں کا سلوک اور یہ نمونہ ہے انکی دشمنی اور بیوفائی کا اس شخص کے ساتھ جس کی سربلندی اور نام آوری سب سے زیادہ انہی کی عزت و افتخار کا سبب تھی۔ ان سنگدل اور بیوفا قریشیوں کے مقابلے میں جو گویا خود اپنی عزت و ناموری کے دشمن تھے، دو یمنی الاصل قحطانی

بھائی امام حسنؑ کی خلافت کے دور میں عراق میں رہے تھے، ورنہ پوری زندگی مدینہ ہی میں گزاری تھی۔ مدینہ وہ شہر تھا جہاں رسولؐ اللہ کو تبلیغ کے لیے سازگار ماحول ملا تھا۔ مکہ تو اس وقت قید خانہ بن چکا تھا۔ مدینہ ہی میں مناسب فضا میسر آئی تھی۔ اسی شہر سے پیغمبرؐ اسلام کی دعوت ساری دنیا میں پھیلی۔

قریش کا رسولِؐ خدا سے سلوک

مدینہ نے اسلام کے پھیلنے کے لیے جو سہولت بہم پہنچائی تھی، امام علیؑ نے بھی ایک خطبے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

رسولِؐ خدا مکہ میں متولد ہوئے، مدینہ کو ہجرت کی۔ اس شہر سے آپ کا نام بلند ہوا اور آپ کی آواز دنیا کے کانوں تک پہنچی۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۱۵۶)

رسولؐ اللہ کے اقربا نے تو ان سے دشمنی کی، لڑے اور انھیں گھر سے نکال دیا لیکن اوس اور خزرج نے ان کو قبول کر لیا۔ انھیں اپنے شہر میں لے آئے اور ان کے لیے جان و مال کی قربانیاں دیں۔ یہی حقیقت امام علیؑ نے اپنے کلماتِ قصار میں بیان کی ہے۔ ایک کلمے میں آپ نے کہا ہے کہ "جس کا اپنے ساتھ نہیں دیتے اس کی مدد کے لیے خدا غیر اور بیگانے مہیا کر دیتا ہے۔" رسولؐ اللہ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔ قریش کے پچیس خاندان جو سب رسولؐ اللہ کے رشتے دار تھے اور جن کا سلسلۂ نسب رسولؐ اللہ کے اجداد یعنی ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، عدنان اور نضر بن کنانہ تک پہنچتا تھا، یہ سب عدنانی اور قریشی رسولؐ اللہ کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں تک ان سے ہو سکا انھوں نے اسلام کو پھیلنے سے روکا، رسولِؐ خدا کے پیروکاروں

سے پرخاش رکھتا تھا۔ عثمان کے قتل اور امام علیؑ کے خلیفہ ہو جانے کے بعد شام چلا گیا۔ جنگِ صفین میں معاویہ کے ساتھ تھا۔ کہتے ہیں کہ جنگ صفین میں انصار میں سے صرف دو ہی صحابی معاویہ کے ساتھ تھے۔ ایک یہ نعمان دوسرے سلمہ بن مخلد۔ نعمان ۶۵ھ تک زندہ رہا۔ اسی سال خلافت کا سودا سمایا اور کچھ طرفدار اکٹھے کر لیے لیکن مروان بن حکم کے مقابلے میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ بہر حال کچھ بھی ہو اس سفر میں تو شام سے مدینہ تک اہلبیتؑ کے ساتھ بہت ادب و احترام کا برتاؤ کیا اور اس حسنِ سلوک کو ہر مسلمان قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ اہلبیتؑ مدینہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہی مدینہ جو آغازِ ہجرت یعنی پچھلے اکسٹھ برس سے رسولؐ اور آلِ رسولؐ کا مسکن رہا تھا جہاں کے باشندوں یعنی انصار نے جو قبائل اوس اور خزرج سے تعلق رکھتے تھے رسولؐ اللہ کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ وہی شہر جس نے اپنے دروازے رسولؐ اللہ کے لیے اس وقت کھول دیے تھے جب اور سب دروازے بند ہو چکے تھے۔ وہی شہر جس نے مہاجروں کو جو مکہ اور حجاز کے دوسرے نواحی علاقوں سے بھاگ کر آئے تھے، اپنی آغوش میں جگہ دی تھی۔ رسولؐ خدا کو بھی اس شہر سے ایسا تعلق خاطر تھا کہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد بھی آپ نے مکہ میں قیام نہیں فرمایا اور جنگ حنین اور غزوۂ طائف کے بعد بھی مدینہ ہی واپس تشریف لے آئے اور باقی عمر وہیں گزاری۔ فقط ۱۰ھ میں مناسکِ حج ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے تھے اور حج سے فراغت کے بعد مدینہ واپس آ گئے۔

امام حسینؑ اور ان کے بہن بھائی مدینہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ امام حسینؑ اپنی عمر کے ستاون سال میں سے صرف چار سال اور چند مہینے اپنے والد اور اپنے

نعمان بن بشیر

نعمان بن بشیر کو حکم ہوا کہ اہلبیتؑ کی واپسی کا انتظام کرو اور ایک دیانتدار اور نیک آدمی ان کے ہمراہ بھیجو۔ شیخ مفید کی روایت کے مطابق خود نعمان بن بشیر کو بھی ساتھ جانے کا حکم ہوا تھا۔ اخبار الدوّل میں ہے کہ نعمان بن بشیر تیس آدمیوں کے ساتھ اہلبیتؑ کی ہمراہی میں شام سے مدینہ گیا تھا۔ راستے میں اس نے اہلبیتؑ کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اس قدر ادب و احترام کا برتاؤ کیا کہ مدینہ پہنچ کر امیرالمومنینؑ کی بیٹی فاطمہ نے جو اسیروں میں شامل تھیں اپنی بہن زینبؑ سے کہا کہ یہ شخص ہم سے بہت اچھی طرح پیش آیا ہے اسے کچھ انعام دیدو لیکن نعمان نے انعام قبول نہیں کیا اور کہا کہ اگر میں نے کوئی خدمت کی ہے تو وہ خدا کی خوشنودی اور رسولؐ خدا سے آپ کی قرابت کا لحاظ کرتے ہوئے کی ہے۔

یہ نعمان بن بشیر اور اس کے باپ دونوں صحابی تھے۔ اس کے باپ بشیر بن سعد خزرجی پہلے شخص تھے جنھوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر کی بیعت کی۔ لکھا ہے کہ بیعت میں ان کا مقصد رضائے الٰہی نہیں تھا بلکہ اس لیے بیعت کی تھی کہ کہیں سعد بن عبادہ خزرجی کو خلافت نہ مل جائے چونکہ وہ سعد سے حسد رکھتے تھے اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ خود ان کے سوا کوئی دوسرا خزرجی خلیفہ ہو جائے۔ اسی خیال سے ابوبکر کی بیعت میں جلدی کی اور مہاجرین سے بھی پہلے بیعت کرلی۔ خود نعمان ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے امام علیؑ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اہل کوفہ چونکہ امام علیؑ کے طرفدار تھے اس لیے یہ ان

پھیل گئی۔ جب امام سجادؑ نے دیکھا کہ سارا شہر اُمنڈ آیا ہے تو آپ نے اشارے سے لوگوں کو خاموش کیا۔ اس موقع پر انھوں نے ضروری سمجھا کہ اپنے کئی ماہ کے سفر کی روداد سے مسلمانانِ مدینہ کو آگاہ کریں۔ اس کا تذکرہ ہم انشاء اللہ آگے چل کر کریں گے۔

جب اہلبیتؑ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو وہ ہر چند کہ سوگوار اور غمزدہ تھے لیکن انھیں اپنی کامیابی اور دشمن کی بے بسی کا پختہ یقین اور اطمینان تھا۔ وہ ابھی شام ہی میں تھے کہ یزید کی بے بسی کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارتاً کہا ہے کہ انھیں جلد ہی قید سے رہائی مل گئی تھی اور خلیفہ کے حکم پر انھیں دمشق منتقل کر دیا گیا تھا۔ اہلِ دمشق ان کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے۔ جیسا کہ طبری نے لکھا ہے' خاندانِ معاویہ کی عورتیں بلا استثناء ہاشمی خواتین کے پاس تعزیت کے لیے آئیں اور امام حسینؑ کا پرسہ دیا۔ تین دن تک خلیفہ کے محل میں مجلسِ عزا برپا رہی۔ یزید دوپہر اور شام کا کھانا امامِ سجادؑ کی موجودگی کے بغیر نہیں کھاتا تھا۔ ایک دن امام حسنؑ یا امام حسینؑ کا ایک چھوٹا بچہ امامؑ کے ساتھ موجود تھا۔ یزید نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا: تم میرے بیٹے خالد کے ساتھ لڑو گے؟ اس نے کہا: ہاں مگر ایک شرط پر۔ ایک چھری مجھے دو اور ایک اسے' پھر لڑوں گا۔ اتنے مصائب اٹھانے کے بعد بھی بچے کی دلیری سے یزید بہت متاثر ہوا اور کہا: شبیر کا بچہ بھی شیر ہی ہوتا ہے۔

اور کہا: "اے اہلِ یثرب! اس شہر میں بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو؟ حسینؑ بن علیؑ قتل کر دیے گئے، ان کے غم میں آنسو رواں ہیں۔ امامؑ کا قاصد اتنا ہی کہنے پر اکتفا کر سکتا تھا لیکن اتنی بات کو اس نے اپنے اور اپنے امامؑ کے مقصد کے لیے کافی نہیں سمجھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ روئیں اور نوحہ سرائی کریں۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ واقعۂ کربلا کے متعلق ایک سند در دھیا ہو جائے تاکہ آئندہ آنے والوں کے لیے تاریخ عاشورا کے مطالعے کی راہ ہموار ہو سکے۔"

امام حسینؑ کی تحریک صرف مجالسِ عزا منعقد کر کے ثواب کمانے کے لیے نہیں تھی۔ اسے صرف ایک اثر انگیز واقعہ کے طور پر منبروں پر مذہبی تقریروں کا موضوع بنانے اور رونے رلانے کے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ امام حسینؑ کی تحریک کی تاریخ، اسلامی تاریخ کا ایک زندہ و درخشندہ باب ہے جس کی اصل روح کا مطالعہ کرنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی قدر و قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ دوسرے موضوعات کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ امامؑ کے فرستادہ نے دوسرے شعر میں اموی خلافت کو ہمیشہ کے لیے رسوا کر دیا۔ اس نے قبرِ رسولؐ کے قریب فریاد کرتے ہوئے کہا:

ان بدطینت اور کافر سیرت لوگوں نے فرزندِ رسولؐ کو قتل کر دیا۔ ان کے جسم کو خاک و خون سے آلودہ کیا اور ان کے سر کو نیزہ پر چڑھایا۔

اس کے بعد لوگوں کو اہلبیتؑ کی آمد کی اطلاع دی اور کہا کہ اس وقت وہ شہر سے باہر اترے ہوئے ہیں۔

یہ سنتے ہی لوگوں نے ادھر کا رُخ کیا۔ راستے بند ہو گئے۔ افراتفری

دبانے کی پوری کوشش کی تھی اور محاصرے کے دوران آب رسانی کا کام بھی انجام دیا تھا۔ عمرو بن سعید نہیں سمجھتا تھا کہ اس جھوٹ اور بہتان سے اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں کہ اس کی رسوائی میں مزید اضافہ ہو۔ عمرو بن سعید نے مسجد نبوی میں بر سرِ منبر امامؑ کی شہادت کا اعلان کیا لیکن جس طرح دوسرے موقعوں پر اہلِ بیتؑ دشمن کی یاوہ گوئی کے جواب میں اظہارِ حقیقت کرتے رہے، خاندانِ عصمت و طہارت کی ایک خاتون نے حاکمِ مدینہ کی بدگوئی کا وہ جواب دیا جو تاریخ کے صفحات پر درج ہو گیا۔ لکھا ہے کہ اس موقع پر عقیل بن ابی طالب کے گھرانے کی ایک لڑکی دیگر ہاشمی خواتین کے ساتھ رسولؐ اللہ کے مرقدِ مطہر پہ آئی اور قبر سے لپٹ کر دو شعر پڑھے اور ان میں تاریخِ عاشورا کا خلاصہ بیان کر دیا۔ اشعار کا مطلب یہ ہے:

"روزِ قیامت اپنی حسینؑ بن علیؑ کے نانا جنھیں قتل کر کے تم خوش ہو رہے ہو تم سے پوچھیں گے کہ تم تو آخری امت تھے، تم نے میرے بعد میری اولاد سے یہ کیا سلوک کیا کہ ان کے مردوں کو تو خون میں نہلا کر قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔"

اہلِ بیتؑ کی مدینہ واپسی

اس طرح اہلِ مدینہ کو شہادتِ امامؑ سے آگاہی ہوئی۔ اب وہ اس کے منتظر تھے کہ اسیرانِ اہلبیتؑ کب واپس آتے ہیں۔ آخر وہ تاریخی دن بھی آ گیا۔ امامِ سجادؑ اور ان کے ہمراہی مدینہ کے قریب پہنچ کر سواریوں سے اترے۔ خواتین کو اتارا، پھر ایک آدمی بھیجا کہ مدینہ جا کر امامؑ کی آمد کی اطلاع کر دے۔ امامؑ کا فرستادہ کہتا ہے کہ میں مسجد نبوی پہنچا۔ وہاں پہنچ کر میں نے آوازِ گریہ بلند کی

سیاسی منظر سے ہٹا دیے گئے اور آلِ ابی سفیان کی سربراہی پختہ ہو گئی۔ وہ قریشی یہ مختصر جواب سنتے ہی سمجھ گیا کہ کیا کچھ پیش آیا ہے۔ اس نے کہا "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ معلوم ہوتا ہے حسینؑ بن علیؑ قتل کر دیے گئے۔ عبدالملک کہتا ہے کہ جب میں عمرو بن سعید بن عاص اموی کے پاس پہنچا تو اُسے بھی عراق کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ کہو عراق سے کیا خبر لائے؟ میں نے کہا کہ ایسی خبر لایا ہوں کہ امیر سن کر خوش ہو جائیں گے اور وہ خبر یہ ہے کہ حسینؑ بن علیؑ قتل ہو گئے اور جھگڑا ختم ہو گیا۔ عمرو بن سعید اموی یہ خبر سن کر پھولا نہیں سمایا۔ کہنے لگا جاؤ اور لوگوں کو ان کے مارے جانے کی خبر سناؤ۔ میں وہاں سے باہر نکلا اور بآوازِ بلند اعلان کیا کہ حسینؑ بن علیؑ عراق میں شہید ہو گئے۔ بنی ہاشم کی خواتین نے یہ سنکر اس طرح آہ و زاری شروع کی کہ میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ عمرو بن سعید نے زنانِ بنی ہاشم کی آہ و فغاں کی آوازیں سنیں تو ایک قہقہہ لگایا اور کہا:

"یہ گریہ عثمان بن عفان پر گریہ کا بدلہ ہے۔" یعنی آج ہاشمی خواتین رو رہی ہیں اور بین کر رہی ہیں۔ کل اسی طرح اموی خواتین عثمان پر بین کر رہی تھیں۔ عمرو بن سعید بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا جس میں یزید اور ابنِ زیاد مبتلا تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ تاریخ کو توڑا مروڑا جا سکتا ہے، وہ حسینؑ بن علیؑ کے قتل کو عثمان کے قتل سے مربوط کرنا اور یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالب اور ان کے بیٹے قتلِ عثمان میں ملوث تھے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ عثمان کے ابتلاء میں ان کا کردار صرف نصیحت، محبت اور خیر خواہی کا تھا۔ قتلِ عثمان میں ان کا ذرا بھی ہاتھ نہیں تھا بلکہ انھوں نے تو فتنے کو

وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائیں گے اور مومنین کو اپنی چالبازیوں سے بے بس کر دینگے لیکن وہ اپنے سوا کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس فریب کاری میں خود ان کا اپنا ہی نقصان ہے۔ جتنا ناپسندیدہ کاموں پر اصرار کرینگے اور پھر ان پر فخر کرینگے، اتنا ہی تاریخ کی عدالت سے راہِ گریز ان کے لیے مسدود ہو جاتے گی۔ ابن زیاد نہیں جانتا تھا کہ تاریخ اسے ایک بدترین شخص کے طور پر یاد رکھے گی اور تاریخ کا فیصلہ اس کے حق میں کیا ہوگا اور امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا نام تاریخ میں کیسے روشن ہوگا اور ان کی تحریک اور جدوجہد کس طرح تاریخِ انسانیت کی درخشاں ترین جدوجہد قرار پائے گی۔

بہرصورت عبدالملک سلمی چونکہ ابنِ زیاد سے مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا لہٰذا وہ اس کے حکم سے مدینہ روانہ ہوا اور بعجلت تمام حجاز پہنچ گیا۔ اہلِ مدینہ نے جو دیکھا کہ عراق سے ایک قاصد آیا ہے، سمجھ گئے کہ ضرور عراق کے واقعات کی خبر لایا ہوگا۔ ایک قریشی نے جس کا نام تاریخ میں مذکور نہیں، عبدالملک کو دیکھ کر اس سے پوچھا کہو عراق سے کیا خبر لائے ہو؟ اس کا مقصد یہی معلوم کرنا تھا کہ حسینؑ بن علیؑ اور اموی دربارِ خلافت کی کشمکش کا کیا نتیجہ نکلا۔ خلیفہ کے خلاف اہلِ کوفہ کی جدوجہد کہاں تک کامیاب ہوئی اور اب وہاں کس کی حکومت ہے۔ عبدالملک نے جواب میں اتنا کہا کہ صحیح خبر امیر کے پاس ہے۔ یعنی جو کچھ ہوا ہے میں اس کی اطلاع امیر کو دونگا۔ عقلمندوں کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ جب حالات کی اطلاع امیر کو دی جا رہی ہے جو یزید کا مقرر کردہ ہے اور خود بھی اموی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام حسینؑ

ہی کے اندر مسلمان حق سے اس قدر دُور جا پڑے تھے کہ آپ کے فرزندوں اور عزیزوں کے قتل کی خبر ایک مژدہ کے طور پر شہر کے حاکم کو بھیجی جاتی ہے، جہاں آپ نے ہجرت کی تھی اور جو آپ کا مدفن ہے۔ عبدالملک بن ابی حارث کو یہ خبر مدینہ لے جانے میں تامل تھا اور امامؑ کے عزیزوں اور متعلقین سے شرم آتی تھی۔ اس نے معذرت کی اور یہ چاہا کہ اسے اس خدمت سے معاف رکھا جائے لیکن ابن زیاد کے ہاتھ میں طاقت تھی اور وہ امامؑ کو قتل کرا کے پہلے سے بھی زیادہ تند خو ہو گیا تھا۔ اس نے عبدالملک کو دھمکی دی اور کہا کہ تجھے یہ خوش خبری لیکر مدینہ جانا ہی پڑے گا اور تجھ سے پہلے یہ خبر مدینہ نہیں پہنچنی چاہیے۔ کچھ درہم و دینار بھی دیے اور کہا کہ بہانے بازی مت کر، فوراً روانہ ہو جا۔ اگر تیرا اونٹ راستے میں بیکار ہو جائے تو فوراً دوسرے اونٹ کا انتظام کر۔ ابنِ زیاد یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس اصرار میں خود اس کا اپنا ہی نقصان ہے۔ شہادتِ امامؑ کی جتنی تفصیلات لوگوں تک پہنچیں گی وہ تاریخ کا جزو بن جائیں گی اور اتنا ہی اسکی اور یزید کی رسوائی کا سامان جمع ہو جائیگا۔
امام عالیمقامؑ کو تو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ امامؑ کا نقصان تو (اگر یہ تعبیر درست ہو) اس میں ہے کہ ان کی شہادت کی خبر ظاہر نہ ہو۔ دشمن کے اخلاقی بگاڑ اور اس کی غلط روی کا حال تاریخ میں درج نہ ہو اور موجودہ اور آئندہ مسلمان حقیقتِ حال سے بے خبر رہیں۔ ابن زیاد ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودتے ہیں اور اپنی ذلت و رسوائی کا سامان خود جگہ جگہ پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ لوگ اللہ اور مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ درحقیقت خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں"۔
(سورۂ بقرہ۔ آیت ۹)

آپ نے فرمایا: "میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے جعفرؓ کی آمد کی زیادہ خوشی ہے یا فتح خیبر کی۔" پھر وہ دن جب ۸ھ میں حضرت جعفرؓ، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ کی موتہ (شام) میں شہادت کی خبر مدینہ آئی۔ پھر وہ دن جب رسولؐ اللہ تیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ غزوۂ تبوک سے صحیح سلامت واپس تشریف لاتے۔ یہ بڑا خطرناک سفر تھا۔ وہ دن جب رمضان ۸ھ میں رسولِؐ خدا نے مکہ فتح کیا۔ اس عظیم فتح کی خبر مدینہ پہنچی تو خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی بُت پرستی کی بساط ہمیشہ کے لیے جزیرہ نمائے عرب سے الٹ دی گئی۔ وہ دن جب ۱۱ھ کے اوائل میں رسولؐ اللہ نے وفات پائی اور تمام اہلِ مدینہ غمزدہ و سوگوار ہو گئے۔ آپؐ کی وفات کے بعد بھی مدینہ نے ایسے اہم تاریخی واقعات دیکھے جن سے کم و بیش مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی زندگی متاثر ہوتی رہی۔

یہاں تک کہ ۶۱ھ آ گیا اور چھ ماہ کی تشویش کے بعد بنی ہاشم اور مسلمانانِ مدینہ کو امام حسینؑ اور ان کے جاں نثار ساتھیوں کی شہادت کی خبر ملی۔ ایک دفعہ پھر رسولِؐ خدا کی وفات کا نقشہ نظر دل میں گھوم گیا۔

قتلِ حسینؑ پر اظہارِ مسرت

شیخ مفید اور طبری لکھتے ہیں کہ جب امام حسینؑ کے قتل کے بعد ان کا سر عبیداللہ بن زیاد کے پاس لایا گیا تو اس نے عبدالملک بن ابی حارث سلمی کو بلایا اور حکم دیا کہ فوراً مدینہ روانہ ہو جاؤ اور عمرو بن سعید بن عاص حاکمِ مدینہ کو جا کر حسینؑ بن علیؑ کے قتل کا مژدہ سناؤ۔

واقعی حیرت کا مقام ہے کہ رسولِؐ خدا کی وفات کے صرف پچاس سال

مدینہ کے تاریخی ایام

ان دنوں مدینہ اہم تاریخی واقعات کی آماجگاہ تھا۔ وہ دن جب ۲ھ میں تین سو تیرہ مسلمانوں نے غزوۂ بدرِ کبریٰ میں نو سو پچاس مشرکین مکہ پر فتح حاصل کی۔ ان کے ستّر سے زیادہ آدمی قتل کر دیے اور ستر سے زیادہ کو قید کر لیا۔ اس فتح کا مژدہ مدینہ میں پہنچا اور رسولِ اکرمؐ اور مسلمان کامیاب و کامران اپنے گھروں کو لوٹے۔ وہ دن جب شوال ۳ھ میں مسلمانوں نے تین ہزار مشرکین مکہ کا مقابلہ کیا، ستر سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے اور رسولِؐ خدا اور مسلمان مجاہد غمزدہ اور سوگوار مدینہ واپس آئے۔ وہ دن جب ۴ھ میں چالیس یا ستر بزرگ صحابہ کی بیرِ معونہ میں شہادت کی خبر آئی۔ وہ دن جب اسی سال نو صحابہ کی سریۂ رجیع میں شہادت کی خبر مدینہ پہنچی۔ وہ دن جب ۵ھ میں تین ہزار مسلمانوں نے جنگ خندق میں دشمن کے بارہ ہزار کے لشکر پر یا جیسا کہ مسعودی نے "التنبیہ والاشراف" میں لکھا ہے چوبیس ہزار کے لشکر پر فتح پائی اور تائیدِ غیبی سے رسولِؐ خدا نے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ دن جب بالترتیب ۲، ۴ اور ۵ھ میں بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے اور مدینہ کی فضا ان پیمان شکن یہودیوں سے پاک ہو گئی۔ وہ دن جب ۷ھ میں مسلمانوں کو خیبر کے یہودیوں پر فتح حاصل ہوئی اور اس شاندار فتح کی خبر مدینہ پہنچی۔ وہ دن جب جعفر بن ابی طالب اور دوسرے مہاجرین جو تقریباً تیرہ سال قبل ہجرت کر کے مسیحی ملک حبشہ چلے گئے تھے بخیر و عافیت واپس آئے اور رسول اللہؐ اس قدر مسرور ہوئے کہ

بیعتِ عقبہ کے بعد جس میں بہتر افراد نے بیعت کی، جب قریش کو پتا چلا کہ قبیلہ اوس و خزرج کا رسولؐ اللہ سے معاہدہ ہوگیا ہے اور انھوں نے آپ کی بیعت کرلی ہے تو قریش کا رویہ پہلے سے بھی سخت ہوگیا اور انھوں نے مسلمانوں کو اور زیادہ ستانا شروع کردیا۔ مسلمانوں کی زندگی مکہ میں ناقابلِ برداشت ہوگئی تو انھوں نے رسولؐ اللہ سے ہجرت کی اجازت طلب کی۔ آپ نے مدینہ جانے کی اجازت دیدی اور کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے بھائیوں کا اور جائے امن کا انتظام کردیا ہے۔ تم اپنے انصار بھائیوں کے پاس چلے جاؤ چنانچہ تھوڑے تھوڑے مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ جاتے رہے اور خود رسولِ اکرمؐ اللہ کے حکم کے منتظر رہے۔ اسی اثنا میں آپ کے قتل کی تجویز پر قریش میں اتفاق رائے ہوگیا۔ انھوں نے اپنی دانست میں قتل کا منصوبہ بڑی احتیاط سے بنایا تھا لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ اپنے پیغمبرؐ کو وطن سے دور ایسے لوگوں کے پاس پہنچانا چاہتا تھا جو باپ، بھائی سے زیادہ مہربان اور جاں نثار ہوں۔ چنانچہ آپ ماہِ ربیع الاوّل ۱۴ سالِ بعثت کی چاند رات کو مکہ سے نکلے۔ رات کو غارِ ثور میں پوشیدہ رہے اور پھر دو مسلمانوں اور ایک مشرک کے ساتھ جسے بطور رہبرِ ہجرت پر ساتھ لیا تھا مدینہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ بارھویں ربیع الاول کو مدینہ کے محلہ قُبا میں اُترے۔ اہلِ مدینہ نے پرجوش خیر مقدم کیا اور شہر خوشی کے نغموں سے گونج اٹھا۔

"کوہِ وداع کی گھاٹیوں سے ــــــ چاند نکل آیا ہے
جب تک کوئی پکارنے والا خدا کو پکارے
ہم پر خدا کا شکر واجب ہے"

دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس واپس چلے جائیں اور ہم بے سہارا رہ جائیں۔"

رسول اللہ نے مسکرا کر کہا: "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میرا خون تمہارا خون اور میری عزت تمہاری عزت ہے۔ میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔ جس کے ساتھ تمہاری جنگ ہوگی میں اس کے ساتھ جنگ کرونگا اور جس کے ساتھ تمہاری صلح ہوگی، اس کے ساتھ میں صلح کرونگا۔"

اس پر سب انصار پکار اُٹھے کہ ہمیں رسول اللہ کی بیعت منظور ہے اور ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ ان کے لیے ہمارے بزرگ جان دیں اور ہم سب مال و متاع ان پر نچھاور کردیں۔

عباس بن عبدالمطلب، رسول اللہ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: "آہستہ بات کرو۔ جاسوس لگے ہوئے ہیں۔ سن رسیدہ لوگوں کو آگے رکھو تاکہ وہ ہم سے بات کریں اور بیعت کے بعد منتشر ہو جاؤ۔ ہر شخص واپس اپنی جگہ پر چلا جائے۔"

سب سے پہلے براء بن معرور نے اور ایک قول کے مطابق ابوالہیثم بن تیہان نے اور ایک دوسرے قول کے مطابق اسعد بن زرارہ نے بیعت کی۔ اس کے بعد ستر اشخاص نے رسول خدا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے اسی گروہ میں سے بارہ نقیب منتخب کیے اور انھیں ذمے دار ٹھہرایا کہ اپنی قوم کے حالات کی نگرانی کریں۔ اس طرح شہر یثرب جس کا نام ہجرت نبوی کے بعد مدینۃ الرسول ہوگیا، دعوتِ اسلامی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ ذی الحجہ ۱۳ سال بعثت سے مدینہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کا آغاز ہوا۔ دوسری

دیکر بھی تم ان کے وفادار رہو گے تو پھر ان کا دامن ہر گز نہ چھوڑو کیونکہ دنیا اور آخرت کی بھلائی اسی میں ہے۔"

اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم جان و مال کی قربانی پر خوشی سے بیعت کے لیے آمادہ ہیں۔ پھر انھوں نے رسولِ خداؐ سے پوچھا: اگر ہم آپ کے وفادار رہیں تو ہمیں کیا ملے گا۔"

آپ نے فرمایا: "جنت۔"

انھوں نے کہا: "تو پھر لائیے ہاتھ، ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔"

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے اپنی گفتگو کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے کیا۔ پھر اسلام کی دعوت دی اور اس کے بعد فرمایا کہ میں تمھاری بیعت اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ تم میری اس طرح حمایت کرو گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہو۔

براء بن معرور نے رسولِ خداؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبیٔ برحق بنا کر بھیجا۔ ہم آپ کا اسی طرح دفاع کرینگے جس طرح ہم اپنے ناموس اور اپنی خواتین کا کرتے ہیں۔ اے رسولِ خداؐ! ہماری بیعت قبول کر لیجیے۔ خدا کی قسم ہم لوگ جنگ آزمودہ ہیں اور سپہ گری تو پشت ہا پشت سے ہمارا پیشہ ہے۔"

اس پر ابو الہیثم بن تیہان نے جو ایک بزرگ انصاری اور شہدائے صفین میں سے تھے، براء بن معرور کی بات کاٹ کر کہا "یا رسول اللہؐ! ہمارے اور یہودیوں کے درمیان تعلقات ہیں جو اب منقطع ہو جائیں گے ایسا نہ ہو کہ ہم تو اپنے حلیفوں کو آپ کی خاطر چھوڑ دیں اور جب آپ کو خدا کامیابی

معزز و محترم ہیں۔ ہم میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ ہم سب بنی ہاشم چاہے ان پر ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں' ان کے جاں نثار ہیں اور ہمیشہ ان کے لیے سینہ سپر رہے ہیں۔ اپنے شہر اور قبیلے میں محمدؐ کی عزت ہے اور انکا احترام کیا جاتا ہے۔ اب وہ تمھارے ساتھ جانا چاہتے ہیں تو اچھی طرح سوچ لو۔ اگر تم ان کا ساتھ دے سکو، دشمنوں سے ان کی حفاظت کر سکو اور سب عربوں کے مقابلے میں جو تم سے لڑنے آئیں گے ثابت قدم رہ سکو تب تو بہتر ہے لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم انھیں اپنے شہر میں لیجا کر انکا ساتھ چھوڑ دو گے تو ابھی سے جواب دیدو۔ آپس میں صلاح کر کے فیصلہ کر لو۔ فیصلے کے بغیر یہاں سے نہ جاؤ کیونکہ صاف بات ہی اچھی ہوتی ہے۔"

اس پر براء بن معرور نے جو ایک بزرگ صحابی تھے کہا: "ہم نے تمھاری بات سن لی۔ بخدا اگر ہمارے دل میں کچھ اور خیال ہوتا تو ہم صاف صاف کہہ دیتے۔ ہم اس بات پر قائم ہیں کہ ہم رسولؐ خدا کا پورا پورا ساتھ دینگے اور راہِ خدا میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

عباس بن عبادہ نے کہا: "گروہِ خزرج! جانتے ہو تم کس بات پر ان صاحب کی بیعت کر رہے ہو؟ لوگوں نے کہا ہمیں معلوم ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم اس پر بیعت کر رہے ہو کہ جنگ میں انکا ساتھ دو گے اور جان و مال کی قربانی سے پیچھے نہیں ہٹو گے۔ اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یہ دیکھ کر کہ مال ہاتھ سے جا رہا ہے اور قوم کے بزرگ مارے جا رہے ہیں کسی وقت ساتھ چھوڑ دو گے تو بہتر ہے کہ ابھی سے بیعت کا خیال دل سے نکال دو۔ کیونکہ ایسی بات سے دنیا و آخرت کی رسوائی ہو گی۔ ہاں اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جان و مال کی قربانی

رسولؐ اللہ ستر قیدیوں اور بے شمار مالِ غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس آئے ہیں یا ستّر سے زیادہ جاں نثاروں کی شہادت کے بعد صرف دست و پا شکستہ اصحاب کو لیکر جنگِ احد کے بعد انصاری مرد اور خواتین کے عکس العمل کا جو اثر دشمن کے حوصلوں پر ہوا تھا وہی اثر کوفہ اور شام میں اہلبیتؑ کے طرزِ عمل کا ہوا۔ اہلبیتؑ کا طرزِ عمل بالکل غیر متوقع تھا۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس قدر مصائب و شدائد برداشت کرنے کے بعد بھی سر اونچا کر سکیں گے ہر جگہ تقریریں کر سکیں گے اور فاتح اور طاقتور دشمن کو نیچا دکھائیں گے عام خیالات کے بدلنے سے خود یزید پر یہ اثر ہوا کہ اسیرانِ اہلبیتؑ کے دمشق پہنچنے پر پہلے ہی دن اس نے یہ کہا: "ابنِ مرجانہ پر خدا کی مار۔ اگر اس کی تمھارے ساتھ رشتے داری ہوتی تو وہ ہرگز تمھارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا اور تمھیں اس افسوسناک حالت میں نہ بھیجتا۔"

انصارِ مدینہ کی بیعت

نبوت کے تیرھویں سال مدینے کے سربرآوردہ لوگوں نے منیٰ کی گھاٹی میں رسولِؐ خدا کی بیعت کی۔ عباس بن عبدالمطلب اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے اہلِ مدینہ سے عہد لیا کہ رسولِؐ خدا کی حمایت میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ عباس نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:

"اے گروہِ خزرج! اب جبکہ تم محمدؐ کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دے رہے ہو، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ اپنے خاندان میں بہت

اور بہت سے گرفتار ہوئے تھے لیکن یہ طرزِ فکر کہ جنگِ بدر مسلمانوں کے لیے اور اسلام کی ترقی کے لیے جنگ احد سے زیادہ نفع بخش تھی اس بات کا نتیجہ ہے کہ جنگِ احد کے جو آثار مرتب ہوئے تھے ان پر پوری توجہ نہیں دیگئی۔ بدر میں مسلمانوں نے اپنے زورِ بازو کا مظاہرہ کیا تھا۔ دشمن کو معلوم ہوگیا تھا کہ اگر مسلمان تین سو تیرہ بھی ہوں اور ان کے پاس صرف چھ زرہیں اور سات تلواریں ہوں تب بھی وہ نو سو پچاس افراد کے لشکر پر بھاری رہیں گے۔ کچھ کو مار دینگے کچھ کو قید کرلیں گے اور باقی کو بھگادیں گے لیکن ابھی قریش کو اس کا تصور بھی نہیں تھا کہ اگر کسی دن اہلِ مدینہ کے اعزہ واقربا راہِ خدا میں شہید ہو جائیں گے تو وہ عورتیں جن کے شوہر، بھائی، بیٹے جنگ میں مارے گئے ہوں رسولِ خداؐ کی سلامتی پر اظہارِ مسرت کریں گی اور اگر کسی دن رسول اللہؐ زخمی مسلمانوں کو دشمن کا تعاقب کرنے کا حکم دینگے تو وہ زخموں پر پٹیاں باندھ کر اس طرح دوڑ دینگے جیسے انھیں ذرا بھی چوٹ نہ آئی ہو۔ جنگ احد دشمن کو مرعوب کرنے میں جنگ بدر سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ احد کے امتحان میں مسلمانوں نے بدر سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ فتح وکامرانی کے موقع پر تو لوگ بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن جب شکست وناکامی سے دوچار ہوتے ہیں تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ جنگ بدر کے بعد بھی قریش کو امید تھی کہ اگر وہ کسی دن مسلمانوں پر غالب آگئے اور انصار کے کچھ آدمی مارے گئے تو رسولِ خداؐ کی نصرت واعانت کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جائیگا اور وہ بددل ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دینگے۔ یہ تو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ

کے شوہر، بھائی اور باپ شہید ہو گئے تھے۔ جب اسے اپنے عزیزوں کی شہادت کی خبر ملی تو اس نے پوچھا۔ رسولؐ اللہ کس حال میں ہیں؟ لوگوں نے کہا: رسولؐ اللہ خیریت سے ہیں، انھیں کوئی خطرہ نہیں۔ کہنے لگی: میں خود رسولؐ اللہ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب رسولؐ اللہ کو دیکھ کر اطمینان ہو گیا تو کہا: آپ خیریت سے ہیں تو پھر کوئی بھی مصیبت آئے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

اگر ایک عورت جو پہلے بت پرست اور گمراہ تھی، اسلامی تربیت اور رسولؐ کی تعلیم کے نتیجے میں ایمان و اخلاص اور راہِ حق میں جاں نثاری کے اس درجے پر پہنچ سکتی ہے کہ رسولِؐ خدا کو زندہ سلامت پا کر وہ ہر غم بھول جاتی ہے اور ہر مصیبت کو حقیر سمجھنے لگتی ہے تو غور کرنے کی بات ہے کہ اس تربیت اور تعلیم کا علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیؑ پر کیا اثر ہوا ہوگا اور وہ ایمان و اخلاص اور فداکاری کے کس مرتبے پر پہنچ گئی ہوں گی۔ اگر اوس و خزرج کی مسلمان خواتین اس درجہ روحانی عظمت کا اظہار کر سکتی تھیں تو زینبِ کبریٰؑ کی روحانی بلندی کا کیا کہنا۔ تب ہی تو اتنی مصیبتوں کے بعد بھی انھیں وہ قلبی اطمینان اور روحانی سکون حاصل تھا کہ انھوں نے فرمایا: "میں نے تو کوئی بری بات نہیں دیکھی"۔ یہی راز تھا مسلمانوں کی عظمت اور ان کی حیرت انگیز ترقی کا۔ یہ نورِ ایمان کی روشنی تھی جس نے دشمن کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اور اس کے کس بل نکال دیے تھے۔

شاید کوئی کہے اور شاید کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ جنگِ احد میں مسلمانوں کو بڑی ہزیمت اٹھانا پڑی۔ کتنے ہی مسلمانوں کے عزیز شہید ہو گئے البتہ جنگِ بدر میں خوب کامیابی ہوئی تھی۔ دشمن کے بہت سے آدمی مارے گئے

سخت پریشان تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہندہ سے پوچھا کہو کیا خبر ہے؟ انھوں نے کہا۔ بڑی اچھی خبر ہے۔ رسول اللہ زندہ سلامت ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی مصیبت آئے تو کوئی بات نہیں۔

یہ مسلمان خاتون جو اپنے عزیزوں کی لاشیں مدینہ میں دفن کرنے کے لیے لے جا رہی تھیں ان کی قوتِ ایمانی کس قدر زبردست تھی، ان کا حوصلہ کتنا بلند تھا کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ زندہ ہیں تو پھر کیا غم! اس خوش خبری کے ہوتے ہوئے کون سی خبر ہے جو ہمیں افسردہ کر سکتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ میں احد سے اور بھی کئی خوشخبریاں لائی ہوں۔ ایک تو یہ کہ متعدد مسلمانوں کو شہادت کی سعادت نصیب ہوئی۔ دوسری یہ کہ آیت نازل ہوئی ہے کہ:

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝ (سورۂ احزاب آیت ۲۵)

"اللہ نے غصے میں بھرے ہوئے کافروں کو پسپا کر دیا۔ انھیں کچھ فائدہ نہیں ہوا اور اللہ نے مسلمانوں کو مزید خون خرابے سے بچا لیا۔ اللہ قدرت والا اور عزت والا ہے۔"

یعنی کافر غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے واپس گئے ہیں کیونکہ انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس خاتون سے پوچھا گیا کہ اونٹ پر کیا لاد رکھا ہے؟ کہا میرا بھائی، میرا بیٹا اور میرا شوہر شہید ہو گئے ہیں، ان کی لاشیں مدینہ لے جا رہی ہوں۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اسی جنگ احد میں بنی دینار کی ایک عورت

مارے جائیں، اسکے بیٹے شہید ہو جائیں، دس بھتیجے اور چچازاد قتل ہو جائیں اور اس کے بعد اسے، اس کی بہنوں اور اس کے بھائیوں کی اولاد کے ساتھ قید کر لیا جائے اور وہ پھر بھی اسیری و گرفتاری کے باوجود اپنا اور اپنے شہیدوں کا دفاع کرے اور وہ بھی اس شہر میں جو کبھی اس کے باپ کا دارالحکومت تھا اور جہاں وہ اپنے باپ کی حکومت کے دوران میں تقریباً چار سال رہی تھی، لیکن غم زدگی اور افسردہ دلی کے تمام اسباب جمع ہونے کے باوجود اپنی مصیبت کا کوئی گلہ شکوہ نہیں کرتی بلکہ صاف کہتی ہے کہ کوئی بات خلافِ توقع نہیں ہوئی ہے۔ اگر ہمارے مرد شہید ہو گئے تو وہ آئے ہی اسی لیے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو البتہ پریشانی کی بات تھی۔ اب جبکہ انھوں نے اپنا مقدس فرض انجام دے دیا ہے اور شہادت کا رتبہ پا لیا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اس کامیابی پر خدا کا شکر ادا کیا جائے۔

اسلامی تربیت کا اثر

واقدی کی روایت ہے کہ جنگ احد میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے یہاں تک کہ خود رسولِ خداؐ کی شہادت کی خبر مشہور ہو گئی تھی۔ ایک انصاری خاتون ہندہ بنتِ عمرو بن حزام، جو حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کی پھوپھی تھیں، احد آئیں اور اپنے شہیدوں یعنی اپنے بیٹے خلاد، اپنے شوہر عمرو بن جموح اور اپنے بھائی عبداللہ بن عمرو کی لاشوں کو فرشِ خاک سے سمیٹا اور تینوں شہیدوں کو ایک اونٹ پر بار کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ راستے میں ازواجِ رسولؐ سے ملاقات ہوئی جو رسول اللہؐ کی شہادت کی خبر پا کر احد کی طرف جا رہی تھیں اور

شام پہنچ کر اس کا اثر زائل کر دیا۔ دمشق کے بازار میں آیۂ تطہیر سنائی اور اہلبیتِ ؑ رسول ؐ کے حقوق بیان کیے۔ آخر غمزدہ اور سوگوار ہونے کے باوجود مطمئن اور آسودہ خاطر مدینہ واپس آئیں۔ شاید بعض شیعیانِ اہلبیت ؑ کو مطمئن اور آسودہ خاطر کے الفاظ گراں گزریں لیکن اگر وہ ان کامیابیوں کو نظر میں رکھیں جو اہلبیت ؑ کو اس سفر میں حاصل ہوئیں اور جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں تو وہ خود اعتراف کریں گے کہ اہلبیت ؑ کے جذبات کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ نامناسب نہیں۔ ہم سے قبل خود دخترِ امیر المومنین ؑ نے اسی قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور ہم نے اسی عظیم المرتبت خاتون کی پیروی کی ہے جس کی دلیری اور صاف گوئی کی مستند شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں۔

ابن طاؤس کی روایت ہے کہ جب ابنِ زیاد نے حضرت زینب ؑ کبریٰ سے کہا: "دیکھا خدا نے تمہارے خاندان کے ساتھ کیا کیا" تو زینب ؑ نے جواب میں کہا کہ میں نے تو کوئی بری بات نہیں دیکھی۔ ان لوگوں کی شہادت مقدر تھی سو وہ خلدِ بریں میں چلے گئے۔ عنقریب اللہ تجھے اور انھیں اکٹھا کریگا، پھر جھگڑے کا فیصلہ ہوگا۔ دیکھیں کس کے حق میں فیصلہ ہوتا ہے۔ اے پسرِ مرجانہ! تیری ماں تجھ پر روئے۔"

سلام ہو آپ پر اے ثانیٔ زہرا ؑ! آپ نے قید کی حالت میں بھی ایسی صاف گوئی سے کام لیا اور وہ بھی اس شخص کے سامنے جسے اہلبیت ؑ سے پشتینی دشمنی تھی۔ ہمارے خیال میں دخترِ علی ؑ کے حوصلے اور جرأت کی یہ مثال ان خطبوں سے بھی زیادہ وقیع ہے جو انھوں نے کوفہ اور شام میں دیے تھے۔

انسانیت کی تاریخ میں اور کون عورت ہو گی جس کے چھ یا سات بھائی

کے یعنی عون اور محمد، پانچ افراد اولادِ عقیل میں سے یعنی جعفر بن عقیل، عبدالرحمٰن بن عقیل، مسلم بن عقیل کے دو بیٹے عبداللہ اور محمد اور ایک محمد بن ابی سعید بن عقیل۔ ان سترہ افراد کے نام زیارتِ ناحیہ میں آئے ہیں۔ ان کے علاوہ امامؑ کے ہمراہی تقریباً پچپن سے زیادہ نہیں تھے۔ اگر شروع میں کچھ تھے بھی تو کوفہ اور عراق کی صورتِ حال واضح ہو جانے کے بعد انھوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اگر آج امامؑ کے حامیوں اور محبّوں کی گنتی کی جائے تو شمار سے باہر ہے لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس زمانے کے لوگ بہت برے تھے اور آج کے لوگ امام شناسی اور جاں نثاری میں ان سے بڑھ گئے ہیں؟ یہ بات نہیں جب تک امتحان کی نوبت نہیں آئی تھی اور مسلم اور ہانی قتل نہیں ہوئے تھے امامؑ کے عقیدتمند بے شمار تھے اور امامؑ کے اردگرد درود و سلام کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بہت ہی اچھا دور تھا جس میں امامؑ کو چھ مہینے کے مختصر عرصے میں بہتّر روشن ضمیر اور ثابت قدم ساتھی میسر آ گئے تھے۔ امامؑ کو اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ کشور کشائی کے لیے تو نکلے نہیں تھے کہ بڑا لشکر درکار ہوتا۔ امامؑ کے مقصد کے لیے یہی بہتّر عظیم المرتبت افراد جن میں ایک شیر خوار بچہ بھی شامل تھا کافی تھے۔ انکے علاوہ وہ باہمت اور بزرگ خواتین تھیں جنھوں نے ہر حالت میں اپنی بات کہہ کر تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ مردانہ وار خدماتِ شائستہ انجام دیں اور بستی بستی عاشورے کے واقعات سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پانی بند کرنے، گھوڑے دوڑانے اور طفلِ شیر خوار کے قتل کا ماجرا سنایا۔ دمشق اور اس کے گرد و نواح کے لوگ پچھلے بیالیس سال سے اہلبیتؑ کے متعلق گمراہ کن پراپگنڈے کا شکار تھے۔ انھوں نے

شانے اور بازو بیکار نہ ہو جاتے تو تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ امامؑ کے ساتھیوں میں نافع پہلے شخص تھے جنھیں گرفتار کر کے ان کی گردن مار دی گئی۔

مرتے دم بھی انھوں نے اپنے ایمان اور یقین کامل کا مظاہرہ کیا۔ جب انکا سر قلم کرنے کے لیے تلوار اٹھائی گئی تو انھوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری موت بدترین لوگوں کے ہاتھوں لکھی تھی۔

یہ حوصلہ تھا ان لوگوں کا جن پر سلام بھیج کر ہم کہتے ہیں "یَا لَیْتَنَا کُنَّا مَعَکُمْ فَنَفُوْزَ مَعَکُمْ" کاش ہم بھی تمھارے ساتھ ہوتے تو تمھاری طرح سرفراز و سرخرو ہوتے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس وقت وہاں نہیں تھے۔ اس امتحان اور ابتلاء سے بچ گئے اور آپ جیسے بزرگوں کا خون بہانے میں شریک نہیں ہوئے لیکن وہ دن حقیقت سے نزدیک تر تھا یا یہ شکر گزاری؟

آلِ ابی طالبؑ جو کربلا میں شہید ہوئے

۶۰ھ میں امام حسینؑ مدینہ سے مکہ گئے اور وہاں سے کوفہ کے قریب تک پہنچے۔ ہر جگہ انھوں نے لوگوں کو اپنی حمایت اور حق کے دفاع کی دعوت دی، تقریریں کیں۔ اس کارروائی میں چھ ماہ سے زیادہ لگے لیکن مشہور یہی ہے کہ بہتّر سے زیادہ مخلص افراد نہ مل سکے۔ ان میں بھی سترہ تو آلِ ابی طالبؑ تھے دو خود امامؑ کے فرزند یعنی علی اکبرؑ اور طفلِ شیر خوار، تین امام حسنؑ کے فرزند یعنی قاسمؑ عبداللہ اور ابوبکر، پانچ امامؑ کے بھائی یعنی عباس، عبداللہ، جعفر اور عثمان، یہ چاروں تو ام البنینؑ کے بیٹے تھے اور پانچویں محمد بن علی، دو بیٹے عبداللہ بن جعفر

جائے تو میرے یقین میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوگا۔" اب امام علیؑ نے یہ بات کہی ہو یا نہ کہی ہو اس میں شک نہیں کہ وہ یقین کے اسی مرتبے پر تھے اور یہ کوئی غیر متوقع بات بھی نہیں۔ امیرالمومنینؑ کا تو یہ مرتبہ ہونا ہی چاہیے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ زہیرؓ بن قین کو بھی ایک حد تک یہ مقام حاصل تھا۔ انھوں نے جو کچھ امامؑ سے کہا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ زہیرؓ جو امامؑ کا عقیدت مند اور جاں نثار ہے، امامؑ کی صحبت میں رہ کر اس درجے تک پہنچ گیا ہے کہ اگر پردہ ہٹا دیا جائے تو اس کے یقین میں مزید کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ یہی یقین اور ضمیر کی روشنی تھی جس نے اصحابِ امامؑ کو ہر آزمائش میں لغزش سے محفوظ رکھا۔

نافع بن ہلال بجلی، امامؑ کے ہمراہیوں میں سے تھے۔ دشمن پر تیر چلاتے جاتے اور رجز پڑھتے جاتے تھے۔ میں ہلال بجلی ہوں، میں دینِ علیؑ پر ہوں یعنی عین معرکۂ کارزار میں بھی نامِ علیؑ کی تبلیغ سے غافل نہیں تھے۔ علیؑ کا نام لے رہے تھے اور ان کی مدح میں مشغول تھے۔ یہاں تک کہ عمر بن سعد کے بارہ آدمیوں کو قتل اور متعدد کو زخمی کیا۔ آخر بازو ٹوٹ گئے معذور ہو گئے تو دشمن نے گرفتار کر لیا۔ ابن سعد کے پاس لے جایا گیا تو اس نے پوچھا: نافع! تم نے یہ مصیبت کیوں مول لی؟ شاید ابنِ سعد کا خیال تھا کہ اکثر لوگوں کی طرح یہ بھی پشیمانی کا اظہار کر کے معافی مانگیں گے مگر نافع نے کہا: خدا میری نیت سے واقف ہے۔ اس وقت ان کی ڈاڑھی سے خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے پھر بھی ہمت کر کے کہا کہ میں نے تمھارے بارہ آدمیوں کو قتل کیا ہے اور بہت سوں کو زخمی بھی کیا ہے۔ مجھے اس پر قطعاً پشیمانی نہیں ہے۔ اگر میرے

پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ "یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَاَفُوْزَ مَعَکُمْ" وہ ذرا سوچے اور دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف سے کہے کہ اس کا یہ فقرہ سچ شمار ہوگا یا جھوٹ؟ کیا واقعی اس کی یہ آرزو ہے کہ کاش وہ عابس بن ابی شبیب شاکری کے ہمراہ ہوتا اور انہی کی طرح دشمن کی سنگ باری کے وقت سر سے خود اور جسم سے زرہ ہٹا دیتا اور حق کی حمایت میں اس کا جسم پتھروں سے کچلا جاتا؟ یا اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ امامؑ کے ہمراہیوں نے کیا کارنامے انجام دیے ہیں اور کس ہمت و جرأت سے دشمن کے وار سہے ہیں؟ اسی لیے ان کی ہمراہی کی آرزو کرتا ہے۔ اس حالت میں اس کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ حقیقت سے بہت دور ہیں۔ اصحابِ امامؑ کی نورانیت اور ان کا ایمان تو اس درجہ پر تھے کہ وہ امامؑ کی تسلی کے لیے جو کچھ کہتے تھے اس میں بھی یقین کا نور جھلکتا تھا۔

اصحابِ حسینؑ منزلِ یقین پر

طبری نے لکھا ہے کہ زہیر نے نمازِ ظہر کے بعد سخت جنگ لڑی۔ وہ کہتے جاتے تھے: میں زہیر بن قین ہوں۔ میں اپنی تلوار سے حسینؑ کو دشمنوں سے بچا رہا ہوں۔ انھوں نے امامؑ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: آگے بڑھیں، آپ تو ہادی اور مہدی ہیں۔ آج آپ نبی کریمؐ، حسن مجتبیٰؑ، علی مرتضیٰؑ، جعفر طیارؓ اور حمزہؓ سے ملاقات کریں گے۔

زہیرؓ یقین کے اس مرتبے پر فائز تھے کہ اپنے امامؑ کو تسلی دے رہے تھے کہ دلگیر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کچھ عجب نہیں۔ جیسا کہ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا ہو: "اگر میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا

خدا کے عذاب سے بچنے کی کوشش کرو۔ تمھارا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔ تمھارا نفع اور نقصان میرے ہاتھ میں نہیں البتہ تم میرے رشتہ دار ہو اور میں تمھارے ساتھ عزیزداری کا برتاؤ ضرور کروں گا۔"

اگر رسولؐ اللہ سے رشتے داری ایمان اور عمل صالح کی جگہ نہیں لے سکتی اور دخترِ رسولؐ کے لیے بھی ضروری ہے کہ حسنِ عاقبت کے لیے وہی راستا اختیار کرے جو دوسروں کے لیے ضروری ہے بلکہ خود رسولِ خدا کے لیے بھی رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ایمان اور عمل صالح کے سوا کوئی راستا نہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد یہ سب آیاتِ قرآنی احادیثِ نبویؐ اور نہج البلاغہ کے خطبے منسوخ سمجھ لیے جائیں اور بہشت میں جانے کا ایمان اور اعمالِ حسنہ کے سوا کوئی اور راستا نکل آئے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ واقعۂ کربلا سے پہلے تو مسلمانوں کو صداقت و امانت، عبادات و واجبات شرعی کی پابندی اور دروغ گوئی، شراب نوشی، سود خوری اور اکلِ حرام سے پرہیز کی ضرورت تھی لیکن اب یہ باتیں اتنی ضروری نہیں رہیں؟ اب یہ ممکن ہے کہ چاہے کوئی ظلم و ستم میں قاتلانِ حسینؑ سے بھی بازی لے جائے لیکن امامؑ اور اصحابِ امامؑ پر درود و سلام بھیج کر مطمئن ہو جائے کہ وہ حشر میں ان ہی بزرگوں کے ساتھ ہوگا۔ اصحابِ حسینؑ تو روحانی عظمت، خلوص، ایمان اور راستگوئی کا پیکر تھے۔ انہی کے حالات پڑھ کر ہم ہوا خواہی اور طرفداری کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوتے ہیں۔ اصحابِ امامؑ ہی نے ہمیں عشق، ایمان، جاں نثاری اور طرفداری کا مطلب بتایا ہے حتیٰ کہ ان کے وہ رجز بھی جو انھوں نے روزِ عاشورا دشمن کے مقابلے میں پڑھے، ان کی شخصیت اور روحانی عظمت

نظر انداز کر دی جائیں گی۔ مندرجہ بالا آیت کے نزول پر آپ نے قریش کو جمع کیا اور فرمایا: "اے قریش! اپنے آپ کو آتشِ جہنم سے بچاؤ کیونکہ تمھارا نفع اور نقصان میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

مطلب یہ تھا کہ نفع یا نقصان اور ثواب یا عذاب کے لیے ایک قانون مقرر ہے۔ اچھا کام کرو گے تو فائدہ ہوگا اور ثواب ملے گا۔ بُرا کام کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے اور سزا پاؤ گے۔ پھر آپ نے فرمایا: اے اولادِ کعب بن لوئی! اپنے آپ کو آتشِ جہنم سے بچاؤ کیونکہ تمھارا نفع و نقصان میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اے بنی قصیّ! اپنے آپ کو آتشِ دوزخ سے بچاؤ۔ میں نہ تمھیں ثواب دلا سکتا ہوں نہ عذاب سے بچا سکتا ہوں۔ اے بنی عبد مناف! تم خود اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے بچانے کی کوشش کرو کیونکہ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کو مانو گے تو بہشت میں جاؤ گے، مشرک رہو گے تو دوزخی ہو گے۔ میرے پاس ایسی کنجی نہیں ہے کہ اپنے مشرک رشتہ داروں کو چور دروازے سے بہشت میں پہنچا دوں۔ مجھے اس کا بھی حق نہیں ہے کہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو ان فرائض سے معافی دلا دوں جو خدا کی طرف سے عاید کیے گئے ہیں۔ اے بنی زہرہ بن کلاب! خود کو عذاب سے بچاؤ۔ اے بنی عبد المطلب! وہ کام کرو کہ عذاب سے بچو۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ اے بنی ہاشم! اے بنی عبد شمس! خدا پرستی کے ذریعے اپنے آپ کو عذاب سے بچاؤ۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ چچا عباس! آپ بھی اپنے آپ کو عذاب سے بچائیں۔ پھوپھی صفیہ! آپ بھی اپنے بچاؤ کی فکر کریں کیونکہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ دنیاوی فائدہ میرے ہاتھ میں ہے نہ آخرت کا نفع۔ خدا پر ایمان لاؤ اور کہو لاالٰہ الا اللہ۔ اے فاطمہؑ دخترِ محمدؐ! تم بھی

کوئی یار ملے گا نہ مددگار اور جو مرد یا عورت کوئی نیک کام کرے گا
بشرطیکہ مومن ہو تو جنت میں داخل ہوگا اور کسی پر ذرا بھی ظلم
نہیں ہوگا۔"

یعنی ثواب وعقاب اور سزا و جزا کا تعلق تمھاری یا اہل کتاب کی خواہش سے نہیں۔ قانونِ الٰہی نہ تمھاری خاطر بدل سکتا ہے نہ اہل کتاب کی۔ قانون یہی ہے کہ جو شخص کوئی برائی کریگا وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ خدا کے سوا کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا اور جو باایمان مرد یا عورت نیک اور صالح ہوگا' وہ جنت میں جائے گا۔ کسی کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں ہوگی۔

دعوتِ ذوالعشیرہ

جب رسول اکرمؐ کو دینِ اسلام کی علانیہ تبلیغ کا حکم ہوا اور آیت انذار وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ○ (اپنے قریبی رشتے داروں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤ اور انھیں دینِ مبینِ اسلام کی دعوت دو) نازل ہوئی تو آپ نے اسی دن بار بار اپنے عزیزوں سے کہا کہ میری رشتے داری کے بھروسے پر خدا کی بندگی سے منہ نہ موڑو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ معاملہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ سنتِ الٰہی کے برخلاف نہ میں تمھیں کوئی نفع پہنچا سکتا ہوں اور نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں۔ اگر تمھیں کوئی نفع پہنچے گا تو اسی طریقے سے پہنچے گا جو اللہ نے مقرر کر دیا ہے اور اگر کوئی نقصان پہنچے گا تو وہ بھی قانون الٰہی کے مطابق ہی ہوگا۔ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ قریش کی یا بنی ہاشم کی یا بنی عبدمناف کی یا بنی عبدالمطلب کی یا میری بیٹی فاطمہؑ کی یا میری پھوپھی صفیہ کی غلطیاں

اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى مَنْ
كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

"اور یہودیوں نے یہ بھی کہا کہ آتش دوزخ ہمیں چند روز سے زیادہ نہ چھوئے گی۔ ان سے کہہ دو کہ کیا اس بارے میں تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی معاہدہ کر لیا ہے کہ اللہ وعدہ خلافی نہ کریگا یا اس سے ایسی بات منسوب کرتے ہو جس کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں۔"

اس کے بعد قانونِ خداوندی کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"بات یہ ہے کہ جو شخص قصداً برائی اختیار کرتا ہے اور اس کے قصور اس طرح اس کا احاطہ کر لیتے ہیں کہ نیکی کا اثر باقی نہ رہے تو ایسے لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔"

سورۂ نساء کی آیات ۱۲۳-۱۲۴ میں بھی یہی بات زیادہ واضح اور جامع انداز میں کہی گئی ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ
سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَھُوَ
مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○

"نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے، جو کوئی برائی کریگا وہ اس کی سزا پائے گا اور اسے خدا کے سوا

اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کرتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ اس سے نا امید ہو گئے تھے کہ لوگوں کو مذہبی جذبات کی بنا پر جہاد پر آمادہ کیا جا سکتا ہے اسی لیے انھوں نے قومی جذبات کا سہارا لیا اور فرمایا کہ اگر تم ثواب آخرت کے حصول کے لیے جہاد پر آمادہ نہیں ہو تو کم از کم اس برے انجام سے ڈرو جو جہاد نہ کرنے کی صورت میں مرتب ہو گا۔ سنت الٰہی تغیر ناپذیر ہے۔ اگر تم ثواب اخروی نہیں چاہتے تب بھی اپنی عزت اور آزادی کے بچاؤ کے لیے اٹھو اور اپنے ملک کی سرحدیں دشمن کے تعرض سے بچاؤ۔ قوموں میں اپنی عزت و آبرو نہ گنواؤ۔ دشمن کو یہ موقع نہ دو کہ وہ تمھیں بے بس کر دے۔

اس کے بعد امیر المومنینؑ کہتے ہیں: دیکھو میں رات دن تنہائی میں اور سب کے سامنے تم سے کہتا رہا ہوں کہ تم ان لوگوں کا مقابلہ کرو اور اس سے پہلے کہ وہ تم پر حملہ کریں تم ان پر حملہ کر دو۔ جس قوم پر خاص اس کے گھر میں اندر آکر دشمن حملہ کر دے وہ ذلیل ہو جاتی ہے لیکن تم سستی برتتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تم پر حملے ہونے لگے اور بہت سے علاقے تمھارے ہاتھ سے نکل گئے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں واضح طور پر اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہم میں مبتلا ہو کر حقیقت کی طرف سے چشم پوشی نہ کرو۔

سورۂ بقرہ کی آیات ۸۰-۸۱ میں زمانۂ رسالت کے یہودیوں کے بارے میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ

یہ سب باتیں سنتِ الٰہی کے خلاف ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اور ہر موقع پر اپنے اصحاب کو سنتِ الٰہی کے تغیر ناپذیر ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ان کے اصحاب اور شیعہ ایسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ سنتِ الٰہی کو بدلا جا سکتا ہے اور جن باتوں سے دنیا بھر کے اور لوگوں کو نقصان پہنچا ہے وہ ان کے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہیں اور جن کاموں نے دوسروں کو کمزور اور ذلیل کیا ہے وہ ان کے ذریعے عزت اور طاقت حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک اور خطبے میں امیر المومنینؑ نے جہاد کے بارے میں فرمایا: "جو جہاد کو ناپسندیدہ سمجھ کر اس سے روگردانی کرتا ہے اللہ تعالےٰ اسے ذلیل کر دیتا ہے۔ اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور اسے انصاف نہیں ملتا۔"

یہاں بھی امام علیؑ نے راہِ خدا میں جہاد کرنے اور سرحدوں کی حفاظت کرنے کی فضیلت اور ثواب کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں کہا کہ جو جہاد نہیں کرتا اور اپنے وطن کا دفاع نہیں کرتا اس کا روزِ قیامت یہ حشر ہوگا۔ امیر المومنینؑ نے اپنے بیان میں ثواب و عذاب کی بات نہیں کی۔ انھوں نے ایک قانونِ الٰہی کی طرف توجہ دلائی کہ جو قوم جہاد کا فریضہ ادا نہیں کرتی اور اپنی سرحدوں کی حفاظت نہیں کرتی تو خواہ اس کے پیغمبر خاتم الانبیاءؐ اور امام امیر المومنینؑ ہی کیوں نہ ہوں، ذلیل، بے بس اور کمزور ہو جاتی ہے، قوموں کی برادری میں ذلیل و حقیر ہو جاتی ہے، عقل و فراست کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے، جہاد اور دفاع کے فریضے سے پہلوتہی کے نتیجے میں اپنا حق کھو دیتی ہے اور حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ ایسی قوم کے ماتھے پر ذلت کا داغ لگ جاتا ہے اور کوئی

سربراہ کوئی ظالم ہو تو اس گروہ میں اتفاق و اتحاد کے باوجود اسے کامیابی نہ ہو۔ قانونِ الٰہی یہی ہے کہ پہلا گروہ باہمی اختلافات اور اپنے سربراہ کی نافرمانی کی وجہ سے شکست سے دوچار ہوگا اور اس کے ہاتھ سے اس کے سربراہ کی تمام خوبیوں کے باوجود طاقت اور حکومت نکل جائے گی اور دوسرا گروہ اپنے سربراہ کے ظالم ہونے کے باوجود ترقی کریگا اور کامیاب ہوگا کیونکہ سنت الٰہی یہی ہے کہ وہی فریق کامیاب ہوتا ہے اور غالب آتا ہے جس میں باہمی اتحاد ہو، جو اپنے سربراہ کا فرمانبردار ہو اور جو مخلص اور دیانتدار ہو۔

امام علیؑ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے اصحاب کو کسی دھوکے میں رکھیں یا ان سے غلط بیانی کریں کہ تم بے فکر رہو چونکہ تمہارے امام علیؑ ہیں، اس لیے تمہارے لیے دنیا میں کامیابی اور آخرت میں رستگاری ہے۔ اگر تم میں اتحاد و اتفاق نہیں تو کوئی بات نہیں، تمہارے امام امیرالمومنینؑ ہیں۔ اگر تم بددیانت ہو تو کوئی حرج نہیں، امام تو علیؑ ہیں۔ اگر تم اپنے امامؑ کی اطاعت نہیں کرتے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ امام علیؑ موجود ہیں۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے اپنا گھر اجاڑتے ہو تو کیا غم ہے جب تمہارے حاکم علیؑ ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ دوسری طرف چونکہ تمہارے دشمنوں کا سربراہ ایک ظالم شخص ہے، اس لیے کچھ بھی ہو انھیں ضرور شکست و ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا، چاہے ان میں اتحاد و اتفاق تم سے زیادہ ہو، چاہے وہ تم سے زیادہ دیانتدار ہوں، چاہے تم سے زیادہ اپنے حاکم کے مطیع و فرمانبردار ہوں اور چاہے تم سے زیادہ اپنے اور اپنے ملک کے لیے مفید و سودمند ہوں۔ ظاہر ہے کہ امیرالمومنینؑ اس قسم کی غلط بیانی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ

قانونِ الٰہی پر امام علیؑ کا خطبہ

امیرالمومنین امام علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں، جو نہج البلاغہ میں موجود ہے، فرمایا تھا: میرا خیال ہے کہ یہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے کیونکہ باطل پر ہونے کے باوجود ان میں اتفاق ہے اور وہ اپنے حاکم کے اطاعت گزار ہیں اور دل سے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ تم اپنے امام کی نافرمانی کرتے ہو۔ وہ اپنے علاقے کے مفاد کا خیال رکھتے ہیں اور تم اپنے علاقے میں تباہی مچاتے ہو۔ اگر میں تم میں سے کسی کو لکڑی کا ایک پیالہ بھی سپرد کردوں تو ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں کوئی اس کا دستہ ہی نہ اُڑا لے۔

امیرالمومنینؑ نے ان کلمات میں الٰہی آیات کی تفسیر اور تشریح کی ہے اور بتلایا ہے کہ قانونِ خداوندی اور سنتِ الٰہی سے سرتابی ممکن نہیں۔ وہ اپنے اصحاب سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ تم فقط اس وجہ سے کہ تمہارا امام علیؑ ہے غالب نہیں آسکتے اور دوسرے محض اس لیے مغلوب نہیں ہوں گے کہ ان کا حاکم بُرا شخص ہے۔ غالب و مغلوب ہونے سے متعلق خدائی قانون یہ نہیں ہے کہ جس فریق کے ساتھ امامِ عادل ہو وہی غالب آجائے چاہے اس فریق میں اتحاد مفقود ہو اور چاہے وہ اپنے امام کی نافرمانی کرتا ہو، امام کو دھوکا دیتا ہو اور خود اپنے علاقے میں تباہی پھیلاتا ہو۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو اسی لیے شکست ہوئی تھی کہ مسلمانوں نے رسولِ خداؐ کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی حالانکہ یہ سب مسلمان، خدا، رسولؐ اور قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے مقابلے میں خدا اور رسولؐ کے دشمن تھے۔ اسی طرح یہ بھی سنتِ الٰہی نہیں ہے کہ اگر کسی گروہ کا

یعنی یہ لوگ جو بت پرستی نہیں چھوڑتے اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اپنی چالوں سے اسلام کی ترقی میں مانع ہوں، کیا یہ بھی وہی سلوک چاہتے ہیں جو اگلوں کے ساتھ ہوا ہے کیونکہ سنتِ الٰہی تو بدلتی نہیں۔

سورۂ مومن کی ۸۵ ویں آیت میں ہے کہ:

فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ○

"سو اُن کو اس وقت ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہی سنتِ الٰہی ہے جو اس کے بندوں میں چلی آرہی ہے چنانچہ اس وقت کافر گھاٹے میں رہ گئے۔"

یعنی جن لوگوں نے ہمارے پیغمبروں کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا، جب ہم نے ان پر عذاب بھیجا تو وہ عذاب کی سختی سے گھبرا کر کہنے لگے کہ ہم ایمان لاتے ہیں لیکن چونکہ عذاب آنے کے بعد ایمان لائے تھے اس لیے انھیں اس ایمان سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہی سنتِ الٰہی ہے۔

ان تمام آیات کے مجموعے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدائے متعال کسی کی خاطر اپنی روش اور سنت نہیں بدلتا۔ نہ کسی کو بلاوجہ سرخرو کرتا ہے، نہ بلاوجہ ذلیل۔ اِس کی بھی وجہ ہوتی ہے اور اُس کی بھی۔ خدا نے کسی قوم کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ ہمیشہ پسماندہ اور نادار رہے۔ جنھیں دولت، عزت اور سربلندی ملی ہے وہ بھی قانونِ الٰہی کے تحت ملی ہے اور جن کے حصے میں ذلت و رسوائی آئی ہے وہ بھی قاعدے کے مطابق ہے۔

جو اِن سے پہلے ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا جو کفر پر اڑے رہے۔

سورہ فتح کی ۲۳ ویں آیت میں کہا گیا ہے کہ:

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

"اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ دکھا کر بھاگتے۔ پھر نہ ان کو کوئی حامی ملتا نہ مددگار۔ وہی اللہ کا دستور (سنت) جو پہلے سے چلا آتا ہے اور اللہ کے دستور میں تم کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔"

یعنی اگر مشرکینِ مکہ حدیبیہ میں جنگ کرتے تو انھیں کوئی فائدہ نہ ہوتا اور بھاگتے ہی بن پڑتی اور پھر ان کا کوئی یار و مددگار نہ ہوتا۔ پچھلے کافروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یہی سنتِ الٰہی ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایمان اور کفر کی آویزش میں کامیابی ہمیشہ اہل ایمان ہی کا مقدر ہے۔

سورۂ فاطر کی ۴۳ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝

"بُری تدبیروں کا وبال انھی پر پڑتا ہے جو یہ چالیں چلتے ہیں۔ تو کیا وہ اسی دستور کے منتظر ہیں جو اگلوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے تم اس سنتِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے اور نہ ہی اس میں کوئی تغیر پاؤ گے۔"

سورۂ بنی اسرائیل کی ۷۷ ویں آیت میں بھی یہی بات اس طرح دہرائی گئی ہے:

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝

"جیسا کہ ہمارا ان کے بارے میں دستور رہا ہے جن کو ہم نے تم سے پہلے رسول بنا کر بھیجا تھا اور تم ہمارے اس قاعدے میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔"

سورۂ انفال کی ۳۸ ویں آیت میں بھی سنت کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

"ان کافروں سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ کفر سے باز آجائیں گے تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے لیکن اگر کفر پر ہی ڈٹے رہیں گے تو کفار سابقین کے حق میں ہمارا دستور (سنت) نافذ ہو چکا ہے۔"

یعنی ان کے بارے میں وہی پرانا قاعدہ جاری ہوگا جو ہمارا دستور ہے اور جس طرح وہ لوگ ہلاک کیے گئے یہ بھی ہلاک کر دیے جائیں گے۔

سورۂ حجر کی ۱۳ ویں آیت میں یہ بات اس طرح کہی گئی ہے:

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

"یہ ایمان نہیں لاتے۔ یہ دستور اگلوں ہی سے ہوتا چلا آیا ہے۔"

یعنی کفارِ مکہ جو رسولِ خدا سے دشمنی اور عناد پر اڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے ہیں ان کا معاملہ واضح ہے۔ ہم ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے

ہیں یعنی خدائے متعال کا وہ طرزِ عمل جو گزشتہ قوموں کے ساتھ رہا ہے۔ ہر جگہ اللہ تعالیٰ یہی فرماتا ہے کہ میری سنت میں تغیر نہیں ہوتا۔ عزت و سربلندی کا ایک طریقہ ہے، میں اس کو نہیں بدلتا۔ بدبختی و بیچارگی کا بھی ایک راستہ ہے جو ناقابلِ تغیّر ہے۔

سورۂ احزاب کی ۶۲ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

"ان لوگوں میں جو پہلے ہو گزرے ہیں اللہ نے اپنا یہی دستور رکھا ہے اور تم خدا کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔"

مطلب یہ ہے کہ گنہگاروں اور منافقوں کے بارے میں اللہ کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اتمام حجت کے لیے پہلے پیغمبروں کو بھیجتا ہے اور حق و باطل کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں، خدا ان کو ہلاک اور نیست و نابود کر دیتا ہے اور جو لوگ خدا اور رسولؐ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں، نفاق اور ریاکاری کا راستہ اختیار کرتے ہیں، خدا کے ساتھ بھی ہوتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے ساتھ بھی۔ رسولؐ کے ساتھ مل کر مالِ غنیمت میں حصہ بٹورتے ہیں اور دوسرے فائدے حاصل کرتے ہیں اور دشمنوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں اور فتنہ پھیلاتے ہیں، خدا ایسے لوگوں کو رسوا کرتا ہے۔ ان کے لیے ہر طرف سے راستہ بند کر دیتا ہے۔ وہ نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی سنت اور دستور ہے۔ اس میں کوئی تغیّر و تبدل نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ مکر و نفاق کسی دن رسوائی کا باعث ہو تو کسی دن سرخروئی کا۔

بھی ہو اچھی ہے لیکن اتنی بات سے کوئی نیک نہیں بن جاتا اور نہ بروں کے زمرے سے خارج ہو سکتا ہے۔ نیکوں میں شمار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی روش اختیار کی جائے۔ صرف اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم نیکوں کا طرفدار ہوں اور بدکاروں کا مخالف ـــ قرآن مجید نے گزشتہ پیغمبروں کے قصوں اور اگلی قوموں کی سرگزشت کے بیان پر خاص توجہ دی ہے لیکن مقصد مسلمانوں کو فقط یہ بتانا نہیں ہے کہ حضرت موسٰیؑ اچھے آدمی تھے اور فرعون بُرا تھا یا قوم عاد و ثمود بے راہ تھی اور فلاں دوسری قوم راہِ راست پر تھی حضرت موسٰیؑ اور دوسرے پیغمبروں یا نجران کے ان عیسائیوں کے اچھا ہونے سے جو شاہِ یمن ذونواس کے ہاتھوں مارے گئے تھے یا ذونواس کے بُرا ہونے سے مسلمانوں کو کیا فائدہ اور کیا نقصان؟

گزشتہ قوموں کی تاریخ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان ان عوامل پر غور کریں جن سے بعض قوموں کو عزت اور سرفرازی نصیب ہوئی اور بعض دوسری قوموں کے حصے میں ذلت و رسوائی آئی اور ان باتوں پر عمل کریں جن سے قوموں کو سربلندی اور سرفرازی ملتی ہے اور ان سے بچیں جن کی وجہ سے بعض قومیں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو کر نابود ہو گئیں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ خدائے لم یزل ولایزال کی سنت کبھی نہیں بدلتی۔ اگر کوئی قوم کسی وجہ سے سرفراز ہوئی تو وہ وجہ ہمیشہ سرفرازی کا موجب ہوگی اور اگر کوئی قوم کسی سبب سے بدبختی کا شکار ہوئی تو وہ سبب ہمیشہ بدبختی ہی کا باعث ہوگا۔

سنت الٰہی ناقابلِ تغیر ہے

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی سنت کا لفظ آیا ہے اس کے معنی روش کے

اوران کی بد فطرتی اور بد کاریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صالح اور سعادتمند افراد پر درود و سلام بھیجا ہے اور زبوں فطرت اور بد خصلت لوگوں پر لعنت کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہ اسلام میں شہیدوں اور راہِ حق میں جان دینے والوں پر درود بھیجنا اور ان لوگوں پر جنھوں نے ان بزرگوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور انھیں قتل کیا لعنت کرنا ایک مستحسن فعل اور اچھی بات ہے لیکن اتنی سی بات سے دین و دنیا کی بھلائی اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ فکر و عمل میں نیکوں کا طریقہ اختیار کیا جائے اور برے لوگوں کے طریقوں سے اجتناب کیا جائے۔ ورنہ پھر وہی بات ہوگی جو فرمانِ خداوندی ہے کہ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ نیک اور فرشتہ خصلت بھی گزر گئے اور بد باطن و بد خصلت بھی۔ انھوں نے جو کچھ اچھے یا برے کام کیے اس کا بدلہ انھیں ہی ملیگا۔ نہ تمھیں نیکوں کی نیکی کا اجر مل سکتا ہے، نہ بروں کی بدی کے تم ذمہ دار ہو۔ اس آیت کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے اسے سورۂ بقرہ میں دس آیتوں سے بھی کم کے فرق سے دہرایا گیا ہے۔ کسی کو صرف یہ کہہ کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے کہ امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب عظیم انسان تھے اور ابنِ زیاد، یزید اور اس کے کارندے برے اور بدراہ تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کتنے ہی لوگ زبان سے تو امام حسینؑ کی روحِ مقدسہ پر درود بھیجتے ہوں لیکن اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے لحاظ سے ابن زیاد کی پیروی کرتے ہوں۔ کتنے لوگ ہیں جو ماضی کے برے لوگوں پر تنقید کرتے اور انھیں برا کہتے ہیں لیکن خود رفتار و کردار کے لحاظ سے انھی برے لوگوں کی روش اختیار کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ حق کی تائید اور اہلِ باطل کی مخالفت جس طرح

یہ آیت انہی الفاظ میں سورۂ بقرہ میں دو جگہ آئی ہے۔ ایک جگہ آیت ۱۳۳ کے بعد جس کا مضمون یہ ہے کہ "کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا اور انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم میرے بعد کس کی پرستش کروگے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اسی خدائے واحد کی پرستش کرینگے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ پرستش کرتے آئے ہیں"۔

اس کے بعد یہ آیت ہے کہ "یہ ان بزرگوں کی ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ ان کا کیا ہوا اُن کے کام آئیگا اور تمھارا کیا ہوا تمھارے کام آئیگا اور تم سے ان کے کیے ہوئے کاموں کے بارے میں کوئی بازپرس نہیں ہوگی"۔

دوسری جگہ یہی آیت ۱۴۰ نمبر کی آیت کے بعد ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور بنی اسرائیل کے بارہ قبائل یہودی یا نصرانی تھے؟ اے محمدؐ کہہ دیجیے کہ تم زیادہ واقف ہو یا اللہ؟ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفا کرے جو اسے خدا سے پہنچی ہو۔ اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے"۔ اس کے بعد پھر وہی آیت ہے "یہ ان بزرگوں کی ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ ان کا کیا ہوا ان کے کام آئیگا اور تمھارا کیا ہوا تمھارے کام آئیگا اور تم سے ان کے کیے ہوئے کاموں کے بارے میں کوئی بازپرس نہیں ہوگی"۔

ہم نے اب تک واقعاتِ عاشورا کے ضمن میں متعدد نیک، دلیر، جاں نثار اور مومن و متقی حضرات کا تذکرہ کیا ہے اور راہِ خدا میں ان کے عزم و استقلال، شجاعت و جوانمردی، جرأت و ہمت، صبر و رضا اور اخلاقی بلندی پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح گنہگار و سرکش، دروغگو و مفتری لوگوں کے نام بھی لیے ہیں

میں تجھے بہت گھٹیا سمجھتی ہوں اور تجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ تجھے سرزنش کروں۔ مگر کیا کروں، سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ تجھے سرزنش کرنے سے ہمارے شہید واپس نہیں آجائیں گے۔ میرے بھائی حسینؑ قتل کر دیے گئے اب شیطان کے ساتھی ہمیں اس لیے احمقوں کے پاس لیے پھرتے ہیں تاکہ احکامِ خداوندی کی بے حرمتی کی قیمت وصول کر سکیں۔ انکے ہاتھوں سے ہمارا خون ٹپک رہا ہے اور ان کے منہ سے ہمارے گوشت کے ریزے جھڑ رہے ہیں۔ پاک شہیدوں کے لاشے بھیڑیوں اور بیابانی درندوں کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔ ممکن ہے آج تجھے خون بہا کر کچھ فائدہ ہوا ہو لیکن کل یومِ حساب تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اس دن تو اعمال کا حساب دینا ہی ہو گا۔ اس دن تو اور تیرے گماشتے آپس ہی میں لڑیں گے۔ اس دن تجھے معلوم ہو گا کہ تیرے باپ نے تیرے لیے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ تجھے فرزندانِ رسولؐ کے قتل کا موقع فراہم کر دیا۔ بخدا میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی اور اس کے سوا کسی سے شکایت نہیں کرتی مگر تو خواہ کچھ بھی کر لے یہ رسوائی کا داغ دھل نہیں سکتا۔"

دخترِ زہراؑ نے آخر میں خدا کا شکر ادا کیا اور کہا: "شکر ہے اس خدا کا جس نے سردارانِ جنت کو بہشت بریں میں جگہ دی۔ وہ ان کے درجات اور بلند کرے اور اس کا فضل ان کے مزید شاملِ حال ہو۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔"

تاریخ کا کیا فائدہ ہے؟

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا ہے کہ وہ انھیں اونٹوں پر بٹھا کر شہر بہ شہر گھمائیں ان کا کوئی دیکھنے اور پوچھنے والا تک نہیں۔"

اس کے بعد کہا: "جو ہمارا دشمن ہے وہ ہم سے کینہ کیوں نہیں رکھے گا۔ تو بڑی بیباکی سے کہتا ہے کہ کاش میرے بزرگ جو بدر میں قتل ہو گئے آج موجود ہوتے۔ تجھے خوفِ خدا نہیں، تو نے ابو عبداللہؑ کے دانتوں پر چھڑی ماری۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ تو تو آلِ رسولؐ اور آلِ عبدالمطلب کے درخشاں ستاروں کا خون بہا کر پہلے ہی شرم و حیا سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جلد ہی تجھے بھی خدا کے پاس جانا ہے۔ اس وقت تو تمنا کریگا کہ کاش تو اندھا اور بہرہ ہوتا اور یہ نہ کہتا کہ آج میرے بزرگوں کے لیے خوشی کا دن ہے۔"

اس کے بعد بنتِ رسولؐ نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ "خدایا جنھوں نے ہم پر ظلم کیا ہے تو ان سے ہمارا انتقام لے۔" پھر یزید سے مخاطب ہو کر کہا: "اے یزید! تو نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قبر کھود لی ہے۔ تو جلد ہی رسولؐ خدا کے پاس جائے گا اور اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ فرزندانِ رسولؐ بہشتِ بریں میں ہیں اور یہ خدا کا وعدہ ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○ اور جو خدا کی راہ میں قتل ہوئے انھیں مردہ تصور نہ کرو۔ وہ زندہ ہیں۔ انھیں خدا کے یہاں سے رزق ملتا ہے۔ یزید! جب خدا حاکم ہوگا اور حضرت محمدؐ منصف ہوں گے اس وقت تیرے باپ سے جس نے تجھے مسلمانوں پر مسلط کیا باز پرس ہوگی اور اس روز معلوم ہوگا کہ ظالموں کو کیا سزا ملتی ہے اور کس کا بُرا انجام ہوتا ہے۔ اے دشمنِ خدا! قسم ہے خدا کی

کے مطابق ایک دن آیاتِ خداوندی کی تکذیب کرنے لگے گا اور ان کا مذاق اڑانے لگے گا اور عذابِ جہنم کا مستحق ہو گا۔

اس کے بعد حضرت زینبؑ نے کہا: یزید! تو نے جو ہمارے لیے زمین و آسمان کے سب راستے بند کر دیے کہ آج ہم قیدیوں کی طرح ادھر سے اُدھر ہنکائے جا رہے ہیں تو کیا تو سمجھتا ہے کہ اس سے ہم کچھ ذلیل ہو گئے یا تجھے کچھ عزت مل گئی۔ تو نے جو دیکھا کہ تیرے حسبِ منشا کام ہو رہا ہے تو تُو اکڑنے ہی لگا۔ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ تو تجھے ڈھیل دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝ (سورة آل عمران آیت ۱۷۸)

کافروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم نے جو انھیں ڈھیل دی ہے، اس میں کچھ ان کا فائدہ ہے۔ ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ ان کے گناہوں میں اور اضافہ ہو۔ بیشک ان کے لیے رسواکن عذاب ہے۔

حضرت زینبؑ نے اس کے بعد یزید کو یاد دلایا کہ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر رسولِ خدا نے اہلِ مکہ پر احسان کر کے سب کو آزاد کر دیا تھا اور یزید ان ہی آزاد شدگان کی اولاد میں سے تھا۔ اس کے والدین اور اس کے دادا ابوسفیان آزاد شدگان ہی میں سے تھے۔ رسول اکرمؐ نے ان کے سابقہ اعمال سے صرفِ نظر کر کے ان سب کو آزاد کر دیا تھا اور فرمایا تھا جاؤ تم آزاد ہو۔ بنتِ رسولؐ نے اپنے خطبے کے دوسرے حصے میں اسی دن کی یاد کو موضوعِ سخن بنایا اور کہا:

"اے آزاد شدگان کی اولاد! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تو اپنی عورتوں اور کنیزوں کو تو پردے میں رکھتا ہے اور بناتِ رسولؐ کی بے پردگی کرتا ہے انھیں

دربارِ یزید میں حضرت زینب کا خطبہ

اب ہم زینب کبریٰ ؑ کی اس تقریر پر نظر ڈالتے ہیں جو انھوں نے یزید کے دربار میں کی تھی۔ یہ تقریر بلاغات النساء میں موجود ہے۔ ذکر اسی تقریر کا تھا درمیان میں تاریخ کی اہمیت کی بات آگئی۔

یزید نے عبداللہ بن زبعری سہمی کے وہ کفر آمیز اشعار پڑھے جو اس نے بحالتِ کفر کہے تھے۔ ساتھ ہی خود بھی ان میں کچھ اضافہ کیا اور صریحاً کہا کہ میں فرزندانِ محمدؐ سے اپنے آباء کا انتقام لینا چاہتا ہوں جو یارانِ محمدؐ کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ زینبؑ بنتِ علیؑ اٹھیں، تقریر شروع کی اور یزید کی سہ سالہ خلافت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔

حضرت زینبؑ نے کہا کہ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ يَا يَزِيْدُ۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا ہے کہ جو برے کام کرتے ہیں ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نشانیوں کو جھٹلانے لگتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں یعنی تو جو آج خدا کی نشانیوں کو جھٹلا رہا ہے اور ان کا استخفاف کرتا ہے اور جس طرح مکہ کے بت پرستوں نے جنگ احد میں کچھ مسلمانوں کی شہادت سے خوش ہو کر گیت گائے تھے، تو بھی فرزندانِ رسولؐ کی شہادت سے خوش ہو کر شعر خوانی کر رہا ہے اور رسولِ خداؐ سے انتقام کی باتیں کر رہا ہے، تو تیرا یہ حال کیوں ہے اور یہاں تک نوبت کیسے پہنچی؟ یہ سب تیرے اعمال کی شامت ہے۔ جو شخص گناہوں پر اصرار کرے گا وہ قرآنی فیصلے

تو ہے، تیرا باپ ہے اور وہ ہے جس نے تجھے عراق کا حاکم بنا کر بھیجا ہے اور اس کا باپ ہے۔ تم لوگ فرزندانِ پیغمبرؐ کو قتل کرتے ہو اور پھر حق و صداقت کا نام لیتے ہو!!"

حاضرین پہ گویا بجلیاں گری تھیں۔ شہادت حسینؑ کا اعلان کیا کم تھا کہ اس پہ عبداللہ کا دھماکہ خیز جواب اس سے بڑھ گیا۔ کربلا کی روح، ملوکیت کا چہرہ صحرا میں نوچ آئی تھی۔ اب مسجد میں بر سرِ عام اس پہ تھپڑ لگا رہی تھی۔

ابنِ زیاد تو اس زعم میں تھا کہ تاریخ پہ بھی اس کی حکومت ہے چنانچہ عبداللہ کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گیا اور چلا کر کہا: اس کو پکڑ کر ہمارے پاس لاؤ۔ ایک شور برپا ہو گیا۔ ان بزرگ نے جو کچھ کہا تھا، سوچ سمجھ کر کہا تھا اپنی جان پہ کھیل کر کہا تھا۔ ابنِ زیاد کی لغو بیانی کو درگزر کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ابنِ زیاد کے حکم سے انھیں سولی پر لٹکا دیا گیا مگر وہ تاریخ عاشورا کا ایک روشن باب اپنے خون سے لکھ چکے تھے۔

ابنِ زیاد نے امامؑ کے سرِ مقدس کو دیکھا تو ہنسا۔ ہاتھ میں جو چھڑی تھی وہ امامؑ کے دندان مبارک پر مارنے لگا۔ زید بن ارقم ایک بوڑھے صحابی اس موقع پہ دربار میں موجود تھے، انھوں نے جو دیکھا تو ابنِ زیاد سے کہا: اپنی چھڑی ان ہونٹوں سے ہٹا! خدائے واحد کی قسم میں نے سینکڑوں بار رسولؐ اللہ کو اپنے لب ان لبوں پر رکھتے دیکھا ہے۔ یہ کہا اور دہاڑیں مار کر رونے لگے۔

ابنِ زیاد شاید سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مسلمان بھی رہے اور فرزندانِ رسولؐ کو قتل بھی کرے۔ مسلمان بھی ہو اور بانیانِ اسلام کو دروغگو بھی گردانے، اسلام کے پیاروں کا خون بھی بہائے اور تاریخ میں مسلمان بھی کہلائے۔

یزیدؔ امامؑ کو قتل کرا سکتا تھا، ان کے ہمراہیوں کو شہید کر سکتا تھا، اہلبیتؑ کو گرفتار کر سکتا تھا لیکن تاریخ کا چہرہ مسخ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ابنِ زیاد نے سانحۂ کربلا کی باضابطہ اطلاع دینے کے لیے کوفہ کی جامع مسجد میں جا کر کئی ہزار کے مجمع سے خطاب کیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا: "اللہ کا شکر ہے کہ جس نے حق اور اہلِ حق کی مدد کی۔ امیر المومنین یزید ابن امیر معاویہ اور ان کے حامی کامیاب ہوئے اور کذّاب ابن کذّاب حسینؑ ابن علیؑ اور ان کے ساتھی مارے گئے۔" ممکن تھا کہ اس تقریر سے لوگ کچھ مدت کے لیے شبہ میں پڑ جاتے اور خیال کرتے کہ حاکمِ وقت مسجد میں مسلمانوں کے عام اجتماع میں اس قدر زور دے کر جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں کچھ حقیقت ضرور ہو گی اور شاید بعض ناواقف اور کم فہم تو یہ سمجھتے کہ جب یہ اس واقعہ پر خدا کا شکر ادا کر رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے بڑی خیر کی کہ حسینؑ مارے گئے۔ چلو اچھا ہی ہوا لیکن پیشتر اس کے کہ مجمع منتشر ہوتا ایک مسلمان نے اپنی جان پر کھیل کر ابنِ زیاد کی بکواس کا جواب دے ہی دیا۔ شیخ مفید اور طبری لکھتے ہیں کہ ابھی ابنِ زیاد کی تقریر ختم نہیں ہوئی تھی کہ عبداللہ بن عفیف ازدی غامدی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

یہ عبداللہ شیعیانِ علیؑ میں سے تھے۔ ایک آنکھ جمل میں کھوئی، دوسری صفین میں۔ کئی برسوں سے یہ مسجد کے ہی ہو رہے تھے۔ سوائے رکوع و سجود اور صلوٰۃ و درود کے کوئی کام بھاتا نہ تھا۔ ہر روز صبح کو مسجد میں آ جاتے، دن بھر عبادت میں مشغول رہتے اور رات کو گھر واپس چلے جاتے۔

غرض ابنِ زیاد کی بدتمیزی جب حد سے تجاوز کر گئی تو ایک کونے سے سفید ریش عبداللہ نے ابنِ زیاد کو للکارا اور کہا: "او بےشرم مرجانہ! کذّاب ابنِ کذّاب

ماہین ہوئی، وہ خطوط ہیں جو یزید نے ابنِ زیاد کو، ابنِ زیاد نے یزید اور عمر بن سعد کو، عمر بن سعد نے ابنِ زیاد کو اور ابنِ زیاد نے حاکمِ مدینہ کو لکھے۔ اس مواد کی مدد سے سانحۂ عاشورا سے متعلق ہر واقعہ کی پوری تفصیل بیان کی جاسکتی ہے اور کسی دوسرے مواد کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ جب یزید نے ابنِ زیاد کو خط لکھ کر عراقین (کوفہ و بصرہ) کا حاکم مقرر کیا تھا تو لکھا تھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ مسلم بن عقیل مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے کوفہ آئے ہیں۔ یہی بات ابنِ زیاد نے اس وقت کہی جب حضرت مسلم کو گرفتار کرکے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ ابنِ زیاد نے سختی سے جھڑک کر کہا: ابنِ عقیل! اس شہر کے لوگ مطمئن اور خوش و خرم تھے۔ تم نے آکر ان میں تفرقہ ڈال دیا اور انھیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ ابنِ زیاد نے یزید ہی کے الفاظ دہرائے تھے۔ اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ حضرت مسلم نے جواب میں کہا: بات یہ نہیں ہے، نہ میں لوگوں میں پھوٹ ڈالنے اور اختلافات پیدا کرنے آیا ہوں اور نہ میں از خود آیا ہوں بلکہ یہاں کے باشندوں نے ہمیں خط لکھے تھے اور شکایت کی تھی کہ تیرے باپ زیاد نے ان پر ظلم کیا ہے اور بہت سے نیک لوگوں کو مروا دیا ہے۔ ہم انصاف قائم کرنے کے لیے آئے ہیں اور لوگوں کو قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ یزید اور ابن زیاد کے فقرے تو تاریخ میں درج ہوتے اور حضرت مسلم کا وہ مختصر جواب درج نہ ہوتا جس میں زیاد جیسے بدنام زمانہ ظالم کی حکومت کا پردہ چاک کیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید آنے والی نسلیں یہی خیال کرتیں کہ واقعی حضرت مسلم فتنہ جو اور شر پسند فسادی تھے اور یہ غیر ممکن تھا۔

پر ماری اور کچھ شعر پڑھے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ کاش! میرے آباؤ اجداد جو بدر میں مارے گئے تھے آج زندہ ہوتے اور آلِ محمدؐ کی یہ حالت دیکھتے تو خوش ہوتے۔ زینبِ کبریٰؑ اس پر کیسے خاموش رہ سکتی تھیں خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ جانشینیٔ پیغمبرؐ کا بھی دعویدار تھا اور ساتھ ہی پیغمبرؐ سے انتقام بھی لینا چاہتا تھا۔ پیغمبرؐ نے جن مشرکین مکہ کو جنگِ بدر میں قتل کیا تھا وہ اُن کی بجائے بزرگانِ اسلام کو قتل کر رہا تھا۔ ایسے شخص کے بالمقابل خاموشی کے یہ معنی تھے کہ اہلِ شام اس کی باتوں کو سنجیدگی سے لیں اور ان پر یقین کر لیں بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ زینب کبریٰؑ اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکتی تھیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا اپنا فرض سمجھ کر کہا اور خدا نے بھی ان کی گفتگو کو محفوظ رکھا۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

تاریخ بہت طاقتور ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ اہلبیتِ عصمت و طہارت کے خطبے اور تقریریں دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہیں اور آج بھی معتبر کتابوں میں موجود ہیں خوش قسمتی سے واقعۂ کربلا کی تاریخ سے متعلق مکمل مواد محفوظ ہے۔ اس میں وہ خطبے ہیں جو امام حسینؑ اور ان کے اہلبیتؑ نے مکہ میں، حجاز و عراق کے راستے میں، کربلا میں، کوفہ میں، شام میں اور مدینہ میں دیئے، وہ گفتگو ہے جو متفرق لوگوں کے استفسار کے جواب میں امامؑ اور اہلبیتؑ نے کی، وہ رجز ہیں جو امامؑ اور آپ کے اصحاب نے دشمن کے مقابلے میں روزِ عاشور پڑھے۔ یہ سب معتبر کتابوں میں درج ہیں۔ اسی طرح وہ خط و کتابت ہے جو امامؑ اور اہلِ کوفہ و بصرہ کے

ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں خوب سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے کہتے ہیں جو اُن کے پیش نظر ہوتا ہے۔

حضرت زینبؑ نے اس سوال کے جواب میں کہ دیکھا خدا نے تمھارے خاندان کے ساتھ کیا کیا، کہا: ”خدا نے ان کے لیے شہادت مقدر کی تھی، وہ شہید ہو گئے۔ جلد ہی خدا تمھیں اور انھیں حساب کتاب کے لیے اکٹھا کرے گا تو اس کے سامنے جھگڑے کا فیصلہ ہو گا۔“

ابنِ زیاد اس جواب سے اس قدر برافروختہ ہوا کہ اگر عمرو بن حریث اسے ملامت نہ کرتا تو شاید وہ امامؑ کی بہن کے قتل کا حکم دے دیتا لیکن پھر بھی کیا ہوتا۔ حضرت زینبؑ نے تو اپنی بات کہہ ہی دی تھی اور یہ بھی بتلا دیا تھا کہ فاسق و فاجر کون ہے اور اہلبیتؑ کا کیا مقام ہے۔

ایک مہینہ اور گزرا تو اس سے بھی بڑی اور اہم مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ضروری تھا کہ اور زیادہ واضح انداز میں اور دو ٹوک بات کی جائے۔ اہل شام، کوفہ والوں کی نسبت اہلبیتؑ سے زیادہ ناآشنا تھے اور زیادہ غلط فہمی میں مبتلا تھے اس لیے بات کو اور زیادہ زور دے کر کہنے کی ضرورت تھی۔ یہ مجلس اس وقت کے مرکزِ خلافت یعنی دمشق میں تشکیل پائی تھی۔

یہاں بھی زینب کبریٰؑ نے خطبہ دیا اور گفتگو کی۔ اس خطبے کو بھی احمد بن ابی طاہر بغدادی متوفی ۲۸۰ھ نے اپنی کتاب بلاغات النساء میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب یزید کی نظر اسیرانِ اہلبیتؑ پر پڑی اور انھیں سامنے کھڑا ہوا دیکھا تو حکم دیا کہ ایک طشت میں امامؑ کا سر اس کے سامنے لایا جائے اور جو لکڑی اس کے ہاتھ میں تھی وہ امامؑ کے دندانِ مبارک

جلو میں مجلس میں تشریف لائیں اور محل کے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ ابنِ زیاد نے پوچھا کہ یہ جو عورت کونے میں بیٹھی ہے کون ہے؟ کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ دوبارہ پوچھنے پر حضرت زینبؑ کی ایک کنیز نے کہا کہ یہ دخترِ رسولؐ حضرت فاطمہؑ کی بیٹی زینبؑ ہیں۔

اس موقع پر حضرت زینبؑ پر ایک بھاری ذمہ داری تھی۔ ضروری تھا کہ اول وہ خود ضبط سے کام لیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیں اور دوسرے ابن زیاد کی بات کا جواب دیں اور اسے لوگوں کو دھوکے میں مبتلا کرنے کا موقع نہ دیں۔

ابن زیاد نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمھیں ذلیل کیا۔ تمھارے آدمی مارے گئے اور تمھارا تازہ جھوٹ کھل گیا" ابن زیاد نے کامیابی کے نشے میں یہ کفر آمیز کلمات کہے۔ ورنہ بنی ہاشم نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ کیا ان کا تازہ جھوٹ یہ تھا کہ وہ محمد رسولؐ اللہ کہتے تھے یا کوئی اور جھوٹ تھا؟ بہرحال حضرت زینبؑ نے فوراً جواب دیا "خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عزت بخشی اور ہمیں رجس سے پاک رکھا۔ رسوا فاسق ہوتا ہے اور جھوٹ فاجر بولتا ہے اور الحمد للہ کہ وہ ہم نہیں کوئی اور ہے۔"

دخترِ امیر المومنینؑ کا یہ دندان شکن جواب سن کر ابن زیاد بولا: "دیکھا خدا نے تمھارے خاندان کے ساتھ کیا کیا" گویا وہ حضرت زینبؑ کی ہمت شکنی کرنا چاہتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ ان کا حوصلہ پست کر کے انھیں اپنی خوشامد پر آمادہ کرے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اہلبیتؑ اپنے معاملے میں بہت ہوشیار

عورتوں کو قید ہونا ہی تھا اور اس بہانے سے بازاروں اور گزرگاہوں میں تقریر کرنا اور دشمن کے پروپیگنڈے کا جواب دینا ہی تھا تو اس کام کے لیے دختر امیرالمومنینؑ سے زیادہ موزوں اور کون ہو سکتا تھا۔ انھوں نے جاں نثاری کا سبق رسولؐ خدا کی سب سے بڑی جاں نثار یعنی خدیجۃ الکبریٰؑ اور آپ کے سب سے بڑے ہمدرد و حامی حضرت ابوطالبؑ سے میراث میں پایا تھا۔ زینبؑ کبریٰ نے کوفہ کے بازار میں ایک خطبہ دیا اور بالکل اپنے والد محترم کی طرح دادِ سخن دی۔ معلوم ہوتا تھا زبانِ علیؑ سے بول رہی ہیں۔ ایک ہی اشارے میں لوگوں کو یوں خاموش کیا گویا سینوں میں سانس روک دیا۔

احمد بن ابی طاہر بغدادی متوفی ۲۸۰ھ نے اپنی کتاب بلاغات النساء میں اس خطبے سے متعلق تین روایات بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک کی سند امام جعفر صادقؑ تک پہنچتی ہے۔ حضرت زینبؑ کی بہن ام کلثومؑ[1] نے بھی کوفہ کے بازار میں خطبہ دیا۔ دونوں بہنوں نے اہل کوفہ کو خوب ملامت کی۔ لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور چیخیں نکل پڑیں۔ حضرت فاطمہ بنتِ حسینؑ نے بھی کوفہ کے بازار میں خطبہ دیا اور لوگوں سے گفتگو کی اور انھیں ان کی غلطی اور بدقسمتی کی طرف توجہ دلائی۔

حضرت زینبؑ کا ابنِ زیاد کو جواب

بازارِ کوفہ میں اہلبیتؑ کا کام مکمل ہوگیا تو انھیں ابن زیاد کی مجلس میں گفتگو کا موقع ملا۔ دخترِ امیرالمومنینؑ نہایت سادہ لباس میں اپنی کنیزوں کے

---

[1] یہ ام کلثوم جنھیں ام کلثوم صغریٰ کہا جاتا تھا ان کی والدہ ام ولد تھیں۔

تاریخِ عاشورا کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس طرح کی اور خواتین کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے کمالِ خلوص سے شہیدِ کربلا کی اس عظیم تحریک میں حصہ لیا اور حق کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ جہاں تک شہیدوں کی بات ہے وہ تو سب کے سب عالی رتبہ ہیں، چاہے ہاشمی ہوں یا غیر ہاشمی لیکن کوئی دوسرا اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جو اس تحریک کے روحِ رواں امام حسینؑ کا ہے۔ اسی طرح ان خواتین میں سے جنھوں نے اس حادثۂ فاجعہ میں اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا ہے کوئی بھی اس درجے تک نہیں پہنچ سکتی جو حضرت زینبؑ کے لیے مخصوص ہے۔ اسیری کے دوران میں انھوں نے اپنے بھائی کی جگہ لے لی تھی اور عصرِ عاشورا سے ورودِ مدینہ تک اسی پروگرام کی تکمیل کی تھی، جس پر امامؑ اپنی شہادت کے وقت تک عمل کر رہے تھے۔ امامؑ نے فرمایا تھا کہ ذلت و بے بسی ہم اہلبیتؑ سے بہت دور ہے۔ حضرت زینبؑ نے اسی پر عمل کیا اور اس تربیت کا حق ادا کر دیا جو انھیں اپنی ماں سے ملی تھی۔ دخترِ امیرالمومنینؑ سے یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ صبر و شکر سے کام لیں کیونکہ ان کی ماں حضرت فاطمہؑ اور نانی حضرت خدیجہؑ کا بھی یہی شیوہ تھا۔ یہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ ہی تھیں جو سب سے پہلے رسولِ خداؐ پر ایمان لائیں اور جنھوں نے دعوتِ اسلام کو آگے بڑھانے کے لیے تکلیف اٹھائی اور بعثت کے سالِ اوّل سے لیکر سالِ دہم یعنی اپنی وفات کے وقت تک ہر آڑے وقت میں رسول اللہؐ کی ہمدم و غمگسار رہیں۔ زینب کبریٰؑ انھی خدیجہؑ کی نواسی تھیں۔ امام حسینؑ نے جو قدم اٹھایا تھا اس کا مقصد ترویجِ دین اور احیائے دعوتِ رسولؐ کے سوا کچھ نہیں تھا لہٰذا اگر دینِ مبین اور قرآن مجید کی خاطر

امرءالقیس عیسائی تھے۔ زمانۂ خلافتِ عمر میں خلیفہ کے پاس آکر اسلام لائے۔ اسی روز خلیفہ نے انھیں قبیلۂ قضاعہ کا امیر مقرر کر دیا۔ اسلام اور امارت کے بعد ان کی ایک اور عزت افزائی اس طرح ہوئی کہ ان کی تین بیٹیاں تھیں، انھوں نے بڑی بیٹی کا نکاح امام علیؑ سے منجھلی کا امام حسنؑ سے اور چھوٹی کا امام حسینؑ سے کر دیا اور اس طرح تینوں اماموں کے خسر ہو گئے۔ رباب سے امام حسینؑ کے ایک لڑکی تھی سکینہ اور ایک لڑکا تھا عبداللہ۔ لڑکا جو طفلِ شیر خوار تھا، روزِ عاشور شہید ہوا۔ یہ خود اپنی بیٹی سکینہ کے ساتھ قید میں چلی گئیں مگر خاص روزِ عاشور کے واقعات میں ان کا نام نہیں آیا۔

چوتھی وہ خاتون ہیں جن کا نام ان واقعات کے سلسلے میں لیا جا سکتا ہے جو روزِ عاشور ظہر کے بعد پیش آئے۔ اس سانحہ کے صحیح خدوخال اُجاگر کرنے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ یہ قبیلہ بکر بن وائل کی ایک خاتون تھیں۔ انھوں نے ایک مختصر بات کہہ کر تاریخ میں دشمن کی کمینگی کے ایک حساس رُخ کی تصویر کھینچ دی۔ ان کا شوہر ابن سعد کے لشکر کے ساتھ آیا تھا۔ جس وقت انھوں نے دیکھا کہ کوفہ کے لشکری امامؑ کی خیمہ گاہ میں گھس پڑے ہیں اور خواتین کے کپڑے تک لوٹ رہے ہیں تو انھوں نے باآوازِ بلند کہا: اے آلِ بکر بن وائل! کیا تم زندہ ہو؟ دیکھو! یہ لوگ دخترانِ رسولؐ کے خیمے لوٹ رہے ہیں، آؤ اور خون کا بدلہ لو۔ اس خاتون نے یہ مختصر سی بات کہہ کر واضح کر دیا کہ دشمن کمینگی میں کہاں تک پہنچ گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ خاتون آج بھی ابو عبداللہ کی خیمہ گاہ کے دروازے پر فریاد کناں ہیں اور ان کی فریاد کی بازگشت قیامت تک گونجتی رہے گی۔

عبداللہ بن عمیر نے اجازت طلب کی اور تن تنہا ان دونوں کا مقابلہ کر کے انھیں جہنم واصل کیا۔ عبداللہ کی زوجہ اپنے شوہر کی اس دلاوری کو دیکھ کر خود بھی خیمے کی ایک چوب لیے ہوئے میدان میں نکل آئیں اور اپنے عالی ہمت شوہر نامدار کو خطاب کر کے کہنے لگیں کہ میرے ماں باپ تم پر قربان رسولؐ خدا کے فرزندانِ پاک کے لیے جاں نثاری کا یہی وقت ہے۔ اس باہمت خاتون کے جوش اور حوصلے کو دیکھ کر امامؑ نے ان سے فرمایا: جزاک اللہ! مگر تم خواتین کے خیمے میں واپس جاؤ اور وہیں رہو۔ عورتوں پر جہاد نہیں ہے۔ عبداللہ دوسرے شخص تھے جو روزِ عاشور شہید ہوئے۔ شہیدِ اوّل مسلم بن عوسجہ تھے۔

ایک اور قابلِ فخر خاتون جن کا نام نامی واقعاتِ عاشورا کے ضمن میں آیا ہے، امامؑ کی زوجۂ محترمہ رباب بنتِ امرء القیس ہیں۔ امامؑ کی صرف یہی زوجہ سفرِ کربلا میں ان کے ہمراہ تھیں۔ امام سجادؑ کی والدہ شہربانو جو ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی بیٹی تھیں، تقریباً چوبیس سال قبل وفات پا چکی تھیں۔ علی اکبر کی والدہ لیلیٰ بنتِ ابی مرّہ بن عروہ بن مسعود ثقفی کا نام بھی واقعاتِ کربلا کے ضمن میں کہیں نہیں آیا۔ معلوم نہیں یہ اس وقت زندہ تھیں یا نہیں۔ جعفر بن حسینؑ کی والدہ کا تعلق قبیلۂ قضاعہ سے تھا۔ ان کا بھی ان واقعات کے سلسلے میں نام نہیں آیا۔ فاطمہ بنت حسینؑ کی والدہ امّ اسحاق بنتِ طلحہ بن عبیداللہ تیمی کا بھی تذکرہ نہیں، البتہ فاطمہ خود کربلا میں موجود تھیں اور کوفہ و شام بھی گئی تھیں۔ امامؑ کی ازواج میں سے صرف رباب بنت امرء القیس کلبی اس سفر میں امامؑ کے ہمراہ تھیں۔ انکے والد

"تذکرۂ سبط جوزی کے مطابق ایک اور فخر بھی اس خاتون کو حاصل ہے۔ جب زہیر شہید ہو گئے تو اُن کی بیوی نے اپنے غلام سے کہا: "جاؤ اپنے آقا کو کفن پہنا دو۔" غلام آیا تو دیکھا امامؑ کا لاشہ بے کفن ہے۔ اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے آقا کو تو کفن دوں اور امامؑ کو ایسے ہی چھوڑ دوں چنانچہ پہلے اس نے امامؑ کو کفن پہنایا اور پھر اپنے آقا زہیر کو۔

ایک اور خاتون جن کی شخصیت اور قربانی تحسین و آفرین کی مستحق ہے، عبداللہ بن عمیر کلبی کی بیوی ام وہب ہیں۔ ان عبداللہ بن عمیر کا تعلق بنی علیم کی برادری سے تھا اور وہ کوفہ کے باشندے تھے۔ ایک دن دیکھا کہ ایک لشکر کوفہ کے قریب نخیلہ میں جمع ہے۔ پوچھا کہ یہ لشکر کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ حسینؑ فرزندِ فاطمہؑ دخترِ رسولؐ سے جنگ کے لیے عراق جا رہا ہے۔ عبداللہ نے کہا خدا جانتا ہے کہ میری آرزو تھی کہ راہِ خدا میں مشرکوں سے جنگ کروں۔ اب میرا خیال ہے کہ ان لوگوں سے لڑنا جو دختر زادۂ رسولؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے جا رہے ہیں، کچھ کم ثواب کی بات نہیں۔ عبداللہ نے روانگی کا عزم کر لیا تو اپنی بیوی ام وہب بنتِ عبداللہ سے تذکرہ کیا۔ بیوی نے کہا: تمہارا خیال بڑا ہی اچھا ہے۔ اللہ تمہاری مدد کرے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ عبداللہ رات کے وقت کوفہ سے نکلے اور شاید آٹھویں محرم کو کربلا پہنچے۔ صبح عاشور جب جنگ کا آغاز ہوا تو دشمنوں کی طرف سے عبیداللہ بن زیاد کے دو غلام میدان میں آئے۔ ادھر سے حبیب بن مظاہر اسدی اور بریر بن خضیر ہمدانی ان کے مقابلے کے لیے آمادہ ہوئے۔ امامؑ نے ان دونوں سے فرمایا تم ٹھہرو۔ اس موقع پر

تاریخ میں قابلِ فخر مقام حاصل کر لیا۔ قبیلۂ بنی فزارہ کا ایک شخص بیان کرتا ہے کہ ہم مکہ سے عراق آ رہے تھے۔ امام حسینؑ بھی اسی راستے پر جا رہے تھے لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ کسی منزل پر ہمارا اور ان کا ساتھ ہو۔ چنانچہ جب وہ کسی منزل سے روانہ ہوتے ہم پڑاؤ کر دیتے اور جب وہ کسی منزل پر اترتے تو ہم روانہ ہو جاتے لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک جگہ ہمارا اور ان کا ساتھ ہو ہی گیا۔ ہم نے ایک کنارے پر خیمہ نصب کیا، انھوں نے دوسرے کنارے پر۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک امامؑ کا آدمی آیا۔ اس نے سلام کیا اور کہا: زہیر بن قین! تمھیں ابو عبداللہ بلا رہے ہیں۔ یہ پیغام ہمیں برا بھی لگا اور اس پر حیرت بھی ہوئی لیکن زہیر کی بیوی دلہم بنت عمرو نے زہیر سے کہا: فرزندِ رسولؐ نے آدمی بھیجا ہے، تمھیں بلا رہے ہیں۔ ضرور جاؤ، کوئی حرج نہیں، بات سن کر چلے آؤ۔ اس خاتون کی اس گفتگو نے اپنا اثر دکھایا۔ اس کے شوہر کا نام بزرگ ترین شہدائے اسلام کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ زہیر اپنی بیوی کے کہنے پر امامؑ کی خدمت میں گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ آتے ہی کہا کہ میرا خیمہ بھی امامؑ کے کیمپ میں منتقل کر دیا جائے۔ بیشک:

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (سورۂ بقرۃ آیت ۲۵۷)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

زہیر امامؑ کے ہمراہ گئے اور شہادت کا شرف حاصل کیا۔ انکی بیوی اپنے عزیزوں کے پاس چلی گئیں۔

حساب کتاب میں غلطی نہیں کرتی اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرے کی گردن پر نہیں ڈالتی۔ بہت سے لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تاریخی حقائق پر پردہ ڈال دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ معاصرین کو حقیقت کے سمجھنے میں جو دقتیں ہوتی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں اور بعد میں آنے والے' معاصرین کے مقابلے میں تاریخی حقائق سے بہتر واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ وقت تحقیق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ بے غرض محققین کے لیے تحقیق کی راہ آسان اور روشن بناتا ہے۔ آج ہمارے لیے واقعاتِ عاشورا کی تحقیق تیرہ سو سال پیشتر کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ ہمارے سامنے وہ مشکلات نہیں جو ان لوگوں کے سامنے تھیں جو سنہ ۶۱ھ میں موجود تھے اور آئندہ بھی کتنی ہی صدیاں بیتیں اور کتنے ہی جگ پلٹیں اس واقعہ کی تحقیق کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

تحریکِ کربلا کی گرامی قدر خواتین

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تاریخ عاشورا بہتر افراد کی بدولت وجود میں آئی۔ اس واقعہ کی سربراہی انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس قابلِ قدر اور زندۂ جاوید کارنامے میں متعدد بزرگ خواتین نے بھی نمایاں حصہ لیا اور قربانی دی' یہاں تک کہ بعض شہید بھی ہوئیں۔ ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ ہم ان خواتین کے نام اور کام کا تذکرہ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ پہلی قابلِ صد احترام خاتون زہیر بن قین بجلی کی اہلیہ ہیں جنھوں نے ایک مثبت اقدام کے ذریعے اسلامی

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بیشتر لوگ ان خطبوں کے اس گہرے اثر سے واقف نہیں تھے جو تاریخ پر مرتب ہونے والا تھا۔ جنھوں نے حضرت زینبؑ کا خطبہ دمشق میں سنا وہ عموماً یہی سوچتے تھے کہ ایک غمزدہ خاتون شدتِ غم اور وفورِ جذبات سے ایسی باتیں کر رہی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ جب کل اسکے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو وہ اس صدمے کو بھول جائیگی اور اسے آج کی باتوں کا دھیان بھی نہیں رہے گا۔ یہ کوتاہ بین اس حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے کہ آج زینبِ کبریٰؑ کی زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے، تاریخ کا طاقتور قلم اس کا ایک ایک لفظ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رہا ہے۔ تاریخ کے قلم نے صرف وہی کچھ محفوظ نہیں کیا جو دخترِ امیرالمومنینؑ نے کہا تھا بلکہ ساتھ ہی خلیفۂ وقت کے اشعار بھی محفوظ کر لیے جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گئے۔

حیرت ہے کہ اگر دشمنانِ اہلبیتؑ کو خدا سے خوف اور رسولِ خداؐ سے حیا نہیں آتی تھی تو یہ خیال تو آنا چاہیے تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں یہ سب تاریخ میں لکھا جائے گا، کتابوں میں درج ہو گا اور دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ رہے گا۔ امام سجادؑ یا زینب کبریٰؑ کے کسی خطبے کو نابود کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ دنیا کے تمام کتب خانوں کو تباہ کر دیا جائے۔ تاریخ اگلوں اور پچھلوں کا نامۂ اعمال ہے۔ تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر شخص کا چہرہ جیسا تھا ویسا ہی نظر آتا ہے۔ افراد فنا ہوتے رہتے ہیں، قومیں بدلتی رہتی ہیں لیکن تاریخ اپنی جگہ قائم ہے اور کمال ہوشیاری سے افراد کی نیکی یا بدی اور قوموں کے عروج و زوال کی نگرانی کرتی ہے تاریخ

وجود میں آیا اور سوگوار عورتوں اور بچوں نے اس کے خاکے میں رنگ بھرا۔ ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے کہ کس طرح اہلبیتؑ کے فصیح وبلیغ اور دلیر مقرروں نے لوگوں کے سینوں میں تلاطم برپا کردیا۔ ان کے دل ہلادیے' غلط فہمیوں کے پردے چاک کردیے' لوگوں کی سوچ بدل دی' انھیں اس واقعہ کی قدر وقیمت کی جانب توجہ دلائی اور دشمن کے ہاتھ سے صورتِ واقعہ اور اس کی تاریخی حیثیت میں ادل بدل کا موقع چھین لیا۔ دشمن کی بھی ہر تحریر وتقریر اور اس کی ہر بیہودگی اور رکیکنگی جزوِ تاریخ بن گئی۔ تاریخ میں جو واقعاتِ عاشورا کی واضح اور صاف تصویر نظر آتی ہے اس کی اصل وجہ وہ خطبے ہیں جو امام حسینؑ نے مسجد الحرام میں' حجاز اور عراق کے راستے میں اور عاشورے کے دن دیے۔ دوسرے شہداتے عاشورا' امام سجادؑ اور دیگر اسیرانِ اہلبیتؑ کے خطبوں نے اس تصویر کو مزید مکمل اور واضح کردیا لیکن جب یہ زندہ جاوید خطبے دیے گئے تھے تو اس وقت بہت ہی کم لوگوں کا دھیان ان کی قدر وقیمت اور تاثیر کی طرف گیا ہوگا' صرف مقرروں کو ہی پورا اندازہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' کیا کررہے ہیں اور ان کی باتوں کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ جس طرح کہ خود امام حسینؑ کو اسی وقت سے جب وہ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے' معلوم تھا کہ وہ کیا کررہے ہیں' کہاں جارہے ہیں اور ان کی تحریک کا عالمِ اسلام پر کیا نتیجہ مرتب ہوگا! اسی طرح ان کے شیعہ اور اسیرانِ اہلبیتؑ بھی علیٰ وجہ البصیرت جانتے تھے کہ کب اور کہاں بات کرنے کی ضرورت ہے اور پھر اسکے باوجود کہ ان کے دل بجھے ہوئے تھے اور ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا' خوب دادِ سخن دیتے تھے حقائق پر سے یوں پردہ اٹھاتے رہے کہ دشمنوں کیلئے تاریخ میں تحریف کی راہ بند کردی۔

شب و روز خیال رکھو۔ یہ معلوم رکھو کہ فوجی چھاؤنیاں اور چوکیاں کہاں کہاں ہیں۔ خدا ہی تمہیں پناہ دینے والا اور قوت بخشنے والا ہے تمہیں اسی پر بھروسا کرنا چاہیے کیونکہ تمہارے لیے اسی کی مدد کافی ہے۔

یہ ایک عباسی خلیفہ کی نصائح کا نمونہ ہے۔ عبارت آرائی اور انشا پردازی کے لحاظ سے یہ نمونہ بہت قابلِ قدر اور موثر ہے لیکن پھر بھی اسلامی تاریخ میں دینی مواعظ اور آسمانی حکمتوں کی صف میں جگہ نہیں لے سکا۔ بنی امیہ اور بنی عباس اپنی تمام دولت و طاقت کے باوجود اس قسم کے وصیت ناموں سے کوئی نہج البلاغہ یا صحیفۂ سجادیہ نہیں مرتب کر سکے اور نہ تحف العقول جیسی کوئی کتاب جو رسولِ خداؐ اور ائمہ اطہارؑ کے مواعظ کا مجموعہ ہے ترتیب دے سکے۔ تاریخ کو شخصیتوں اور ان کے کلام کو پرکھنے کی جو مخصوص قدرت و بصیرت حاصل ہے وہ اس کی بنا پر کچھ خطبوں، خطوط اور اقوال کو زندۂ جاوید بنا دیتی ہے اور بظاہر انہی جیسے دوسرے اقوال کو رد کر دیتی ہے۔ یہ کام تاریخ کا ہے جو وقت گزرنے کیساتھ انجام پاتا ہے۔ معاصرین عموماً حقیقت کا کماحقہ ادراک نہیں کر سکتے۔

تحریکِ کربلا کیوں ناقابلِ فراموش ہے؟

جب واقعۂ کربلا پیش آیا تو اس وقت بہت تھوڑی تعداد میں اہل بیتؑ اور شیعیان حسینؑ ایسے تھے جو اس واقعہ کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے تھے یا تاریخ پر اس کے آئندہ مرتب ہونے والے اثرات پر گفتگو کر سکتے تھے اور ایک حد تک لوگوں کی غلط فہمیاں دور کر سکتے تھے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانحہ بہتّر مردوں کے جان دینے سے

مانگ رہے ہوں گے۔

اس وقت تمہارا کوئی قریبی عزیز تمہاری حمایت نہیں کریگا۔ ہر عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔ کسی کی سفارش قبول نہیں ہو گی۔ میزان عدل درمیان میں ہو گی ہر فیصلہ ناطق ہو گا۔ اللہ تعالٰے نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس روز کسی پر ظلم نہیں ہو گا اور سب کا حساب جلد چکا دیا جائیگا۔ ضروری ہے کہ اس دن کے لیے ابھی سے تیار رہو اور اپنی نجات کے لیے کوشش کرو۔ اپنی گردن کو گناہوں کے پھندے سے چھڑاؤ۔ آج جو موقع ہے اسے غنیمت سمجھو اور کل آنے والی قیامت سے ہوشیار رہو۔ دنیا دھوکے باز ہے اس سے بچتے رہو۔ اپنی نیت کو درست رکھو اور ہر حاجت خدا ہی سے طلب کرو۔ ضروری ہے کہ تمہارا انصاف ہمہ گیر ہو۔ ہر ایک سے انصاف کرو۔ کسی پر ظلم نہ کرو اور رعایا میں سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرو۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ دیندار لوگوں میں سے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کا انتخاب کرو۔ مسلمانوں کو ان کے مال میں سے جائز حصہ دو۔ خراج اور مالِ غنیمت میں سے ان کا حق ادا کرو۔ انکے وظائف اور تنخواہیں باقاعدگی سے اور بروقت دو۔ شہروں اور دیہاتوں پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کرکے ان کی آبادکاری میں اضافہ کرو۔ اپنے حسنِ سلوک اور خوش تدبیری سے لوگوں کی اصلاح کرو۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کرو اور ان کی نگرانی رکھو۔ جہاں ضرورت ہو وہاں فوجی دستے بلا تاخیر روانہ کرو۔ جہاد اور دین کی حمایت میں کامیابی کی دعا اللہ تعالٰی سے کرتے رہو۔ وہی مسلمانوں کو کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازتا ہے۔ اس کی راہ میں جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی سے دریغ مت کرو۔ اپنی فوج کا

وقت تمھارا خاندان تمھارے کسی کام نہیں آئے گا۔ تم ہو گے اور تمھارے اعمال! اس وقت تمھارے اعمال تمھارے سامنے ہونگے۔ تمھارے اعضا تمھارے اعمال کی گواہی دینگے چونکہ ہر نیکی اور بدی کی جزا اور سزا ملے گی اس لیئے تمھیں چاہیے کہ تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ اور ہمہ تن خدا کی اطاعت میں مصروف رہو۔ خدا سے دینداری کی توفیق مانگو اور دین کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کرو۔ اپنے نفس کا مواخذہ کرتے رہو اور اسے ہوا و ہوس کا کھلونا نہ بننے دو۔ کسی برائی پر ضد مت کرو کیونکہ تمھارے اوپر بڑی ذمے داری ہے۔ تمھیں گناہ بھی اوروں سے زیادہ ہوگا اور جوابدہی بھی زیادہ کرنا ہوگی چونکہ خدا نے تمھیں رعیت کا سرپرست بنایا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے کا فیصلہ تمھارے ہاتھ میں دیا ہے اس لیے تمھیں ہر ایک کو جواب دینا ہے۔ اپنے عمائل اور کارگزاروں کے مظالم کی سزا بھی تمھیں ہی بھگتنا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"تو بھی مرجائے گا اور دوسرے بھی مرجائیں گے اور پھر سب تیرے پروردگار کے سامنے جھگڑیں گے"۔ میں گویا دیکھ رہا ہوں کہ تم سے خدا تمھارے کے سامنے سوال و جواب ہو رہا ہے۔ دوستوں نے تمھارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ تمھارے حامیوں نے تمھیں تمھاری قسمت کے حوالے کر دیا ہے تمھاری لغزشیں اور گناہ تمھارے گلوگیر ہیں۔ خوف سے تم پر لرزہ طاری ہے اور بے بسی سے تمھارے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ تم سب چوکڑی بھول گئے ہو۔ کوئی تدبیر بن نہیں آتی۔ لوگ تم سے اپنا حق مانگ رہے ہیں، بدلہ لے رہے ہیں۔ اس دن کیا ہوگا جب ہر طرف خوف و ہراس طاری ہوگا اور آنکھیں خیرہ ہونگی۔ ظالموں کی نہ کوئی بات پوچھنے والا ہوگا نہ ساتھ دینے والا! لوگ تمھیں گھیرے ہوئے ہونگے اور اپنا حق

سمجھ بیٹھتے ہیں جو ذاتی اغراض کے اسیر اور حرص و ہوا کے بندے ہیں لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ لوگ چاہے غلطی کریں، تاریخ غلطی نہیں کرتی اور زمانہ گزرنے کے ساتھ غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اسی تاریخ نے امیر المومنین امام علیؑ کے مختصر فقروں کو بہترین مذہبی اور دینی نصیحتوں کا درجہ دیا ہے اور بہت سے دوسرے خلفا کی بے روح طولانی تقریروں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم یہاں بطور نمونہ خلفائے بنی عباس میں سے منصور دوانیقی کی ان نصیحتوں کا ذکر کرتے ہیں جو اس نے اپنے بیٹے مہدی عباسی کے لیے لکھی تھیں۔ مشہور مورخ ابن واضح یعقوبی نے انھیں اس طرح نقل کیا ہے:

منصور دوانیقی کا وصیت نامہ

یعقوبی کہتا ہے کہ منصور کے بیٹے مہدی نے اپنے باپ ابو جعفر منصور کا وصیت نامہ مجمع عام میں پڑھ کر سنایا۔ اس میں لکھا تھا:

یہ وصیت ہے بندۂ خدا امیر المومنین کی اپنے بیٹے محمد مہدی ولی عہد کو جسے امیر المومنین نے اپنے بعد تمام مسلمانوں اور ذمیوں پر اور حرم اور بیت المال پر اپنا وصی اور جانشین مقرر کیا ہے۔ زمین خدا کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اچھا انجام پرہیز گاروں ہی کا ہو گا۔ امیر المومنین تمھیں وصیت کرتے ہیں کہ جہاں بھی رہو تقویٰ کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور بندگانِ خدا کے بارے میں خدا کے احکام کی اطاعت کرو تاکہ روزِ محشر ندامت و پشیمانی اور رسوائی نہ ہو۔ جب موت آئے گی تو پھر نیکیوں کی مہلت نہیں ملے گی۔ اس

واقعہ ہے کہ کہنگی و فرسودگی کبھی اس تک راہ نہ پاسکے گی۔ شاید اس وقت اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ جیت قاتلانِ حسینؑ کی ہوئی ہے اور صرف شہیدوں ہی کا قصہ تمام نہیں ہوا بلکہ آئندہ بھی کسی کو بنی امیہ کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوگی اور آئندہ تاریخِ اسلام میں امام علیؑ اور ان کی اولاد کا نام عزت و احترام سے نہیں لیا جائیگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ شہید کربلا اور ان کے اصحابِ باوفا کی شہادت کا زخم بھر جائے گا اور دوسرے مصائب کی طرح یہ مصیبت بھی بھلادی جائے گی لیکن تاریخ نے ثابت کردیا کہ وہ لوگ غلطی پر تھے جو ۶۱ھ کے عاشورے کے واقعہ کو محض معمولی اور سیاسی معرکہ سمجھ رہے تھے۔ ان کی نظریں مقصد کی اس بلندی تک نہیں پہنچ رہی تھیں جو امامؑ کے پیشِ نظر تھا اس لیے وہ واقعہ کی روح کو نہیں پاسکے تھے۔

جو مشکل اکثر لوگوں کی غلط فہمی کا باعث بنتی ہے، یہی ہے کہ لوگ ملتی جلتی باتوں اور کاموں میں تمیز نہیں کر سکتے چاہے ان میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ لوگوں نے اکثر دیکھا ہے کہ کوئی شخص حق کے نام پر اٹھا، اس راہ میں قربانیاں بھی دیں لیکن انجام کار اس کے اقدام کا ذرا بھی اثر نہ ہوا یا بعض لوگوں نے وعظ و نصیحت کے دریا بہا دیے۔ حق کی حمایت اور مظلوم کی طرفداری میں فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے، خوفِ خدا کی تلقین کی اور روزِ جزا سے ڈرایا۔ عذاب و ثواب کی باتیں کیں لیکن نہ لوگ پارسا ہوئے نہ تاریخ پر کوئی اثر مرتب ہوا۔ یہی دیکھ کر بسا اوقات لوگ مردانِ حق کی باتوں اور ان کے کاموں کو بھی خود غرضی پر محمول کرتے ہیں اور ان کی جد و جہد کے ربانی محرکوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے۔ وہ ان لوگوں کو جن کا ہر قول و عمل صرف خدا کے لیے ہے انھی جیسا

ہیں جمع کیے ہیں ان میں سے حسن اخلاق اور حسن سلوک کے بارے میں ایک قول ہے۔ امیرالمومنینؑ نے فرمایا:

"خَالِطُوا النَّاسَ مُخَالَطَةً إِنْ مِتُّمْ مَعَهَا بَكَوْا عَلَيْكُمْ وَإِنْ عِشْتُمْ حَنُّوا إِلَيْكُمْ"۔

یعنی لوگوں سے اس طرح پیش آؤ کہ اگر تم مرجاؤ تو وہ تم پر روئیں اور اگر زندہ رہو تو تمھاری طرف جھکیں۔

یعنی لوگوں کے ساتھ تمہارا سلوک ایسا ہونا چاہیے کہ تمھاری موت پر انھیں صدمہ ہو اور وہ آنسو بہائیں اور جب تک تم زندہ رہو تو تم پر فریفتہ رہیں مطلب یہ کہ آدمی حسن اخلاق سے لوگوں کے دل جیت سکتا ہے۔

صرف نیکی اور حسن سلوک ہی سے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ امیرالمومنین علیؑ کی اس نصیحت پر ان کے فرزند دلبند امام حسینؑ سے زیادہ کون عمل پیرا ہو سکتا تھا اور آپ سے بڑھ کر کون اپنی زندگی میں اور اپنی شہادت کے بعد لوگوں کو اپنا والہ و شیدا بنا سکتا تھا؟

محرم ۶۱ھ میں سرزمینِ عراق پر دریائے فرات کے کنارے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں متعدد بزرگ اور مقدس ہستیوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس وقت بہت سے لوگ اسے ایک عام تاریخی حادثہ سمجھتے تھے اور شاید ان کا خیال تھا کہ تاریخ کے دوسرے سیکڑوں قدیم فرسودہ حوادث کی طرح یہ بھی چند سال میں تاریخ کی کتابوں کے کسی گوشے میں دفن ہو جائیگا اور اس کی وقعت ایک قصہ پارینہ سے زیادہ نہیں رہے گی لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ امام حسینؑ کی شخصیت زندہ و پایندہ ہے۔ انکی تحریک تاریخ عالم کا ایسا زندہ جاوید

طریقے سے دولت کما رہے ہوتے ہیں۔ وہ ہر اس انقلاب کی مخالفت کرتے ہیں جس سے موجودہ صورتِ حال بدل جائے) پھر قیصر نے کہا کہ اس کے بعد میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تم نے کہا کہ روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ سچے مذہب کا یہی حال ہوتا ہے کہ اس کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا کوئی دینِ اسلام کو برا سمجھ کر چھوڑ بھی دیتا ہے؟ تم نے کہا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ایمان کا یہی حال ہے۔ جب ایمان دل میں گھر کر لیتا ہے تو پھر آدمی اس سے کبھی بد دل نہیں ہوتا۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا تمھارے اور اس کے درمیان کبھی کوئی جنگ ہوئی ہے؟ تم نے کہا کہ ہاں ہوئی ہے اور کبھی تم غالب آئے ہو اور کبھی وہ۔ پیغمبرانِ خدا کا یہی حال ہے۔ کبھی کبھی انھیں تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے لیکن انجام کار فتح اور کامیابی انھیں ہی حاصل ہوتی ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ تمھیں کن کاموں کا حکم دیتا ہے؟ تم نے کہا کہ نماز پڑھنے، صدقہ دینے اور پارسائی، پاکدامنی، ایفائے عہد اور دیانتداری کا حکم دیتا ہے۔ تم نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ خود بھی مکّار اور دھوکے باز نہیں ہے۔ پیغمبروں کی یہی شان ہوتی ہے۔ وہ مکّار اور دھوکے باز نہیں ہوتے۔ مجھے اس سوال و جواب سے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی سچا پیغمبرؐ ہے۔

یہ ایک مثال تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح دشمن بھی کسی شخصیت کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے اور حقائق میں ہیر پھیر کی جرأت نہیں کر سکتا۔

کلماتِ امیر المومنینؑ

امیر المومنینؑ کے جو اقوال سید رضی رضوان اللہ علیہ نے نہج البلاغہ

ابوسفیان: کہتا ہے ایک خدا کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ
ٹھہراؤ۔ ہمیں بتوں کی پرستش سے (جو ہمارا آبائی طریقہ ہے)
منع کرتا ہے۔ کہتا ہے نماز پڑھو، صدقہ دو، سچ بولو،
پاکدامنی اختیار کرو، عہد و پیمان کی پابندی کرو، دیانتداری
سے کام لو۔

قیصر نے رسول اللہ کی شخصیت کے بارے میں اتنی ہی تحقیق کو کافی سمجھا۔ پھر ابوسفیان کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے تم سے اس کے حسب نسب کے بارے میں پوچھا تو تم نے اسے شریف النسب بتایا۔ پیغمبر ہمیشہ شریف النسب ہی ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا اس خاندان میں پہلے بھی کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ تم نے کہا کہ نہیں۔ اگر تمھارے خاندان میں کسی نے پہلے بھی دعویٰ کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ اسی کی تقلید کر رہا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے یہ جھوٹ تو نہیں بولتا رہا ہے؟ تم نے خود اعتراف کیا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے سمجھ لیا جو لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر بہتان کیوں باندھے گا۔ میں نے پوچھا کہ اسکے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ تم نے کہا نہیں۔ اگر اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ ہوا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ بھی بادشاہت کی ہوس میں اٹھا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آیا اشراف اور طاقتور اس کے پیروکار ہیں یا کمزور اور غریب؟ تم نے کہا کہ زیادہ تر غریب اور کمزور۔ پیغمبروں کے پیروکار ہمیشہ غریب ہی ہوا کرتے ہیں (یعنی پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے، وہ لوگ جنھیں مستضعفین کہا جاتا ہے، ان کے برخلاف جو لوگ موجودہ نظام کے تحت ہر جائز اور ناجائز

قیصر: سمجھ بوجھ میں کیسا ہے؟
ابوسفیان: ہم نے اس کی سمجھ بوجھ میں کوئی نقص نہیں دیکھا۔
قیصر: جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کیسے لوگ ہیں؟ اشراف اور باا ثر یا کمزور اور غریب؟
ابوسفیان: غریب اور کمزور۔
قیصر: اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟
ابوسفیان: روز بروز ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔
قیصر: کوئی اس کے دین سے پھر بھی جاتا ہے؟
ابوسفیان: نہیں۔
قیصر: کبھی عہد شکنی اور قول و قرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟
ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی۔ حال ہی میں ہم نے اس سے معاہدہ کیا ہے معلوم نہیں آئندہ کیا ہوگا (معاہدہ صلح حدیبیہ مراد ہے)
قیصر: کبھی تم نے اس سے جنگ بھی کی ہے؟
ابوسفیان: ہاں کی ہے۔
قیصر: نتیجہ کیا رہا؟
ابوسفیان: کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔ جنگِ بدر میں اُسے کامیابی ہوئی تھی لیکن میں اس موقع پر موجود نہیں تھا۔ ایک سال بعد (یعنی جنگ اُحد میں) ہم نے اس کے شہر پر حملہ کیا اور پیٹ پھاڑ دیے اور ناک کاٹ دیے۔
قیصر: وہ کیا سکھاتا ہے اور کن کاموں کا حکم دیتا ہے؟

قیصر نے کہا: تمہاری محمدؐ سے کیا قرابت ہے؟

ابوسفیان نے جواب دیا کہ میرے چچا کا بیٹا ہے۔

قیصر نے کہا نزدیک آجاؤ!

اس کے بعد حکم دیا کہ ابوسفیان کے ہمراہی اس کی پشت کے پیچھے کھڑے ہو جائیں۔ پھر اپنے مترجم سے کہا کہ ابوسفیان کے ساتھیوں کو بتاؤ کہ میں نے اس آدمی کو تمھارے آگے اس لیے بٹھایا ہے کہ جب میں اس پیغمبرؐ کے بارے میں پوچھوں اور اگر یہ جھوٹ بولے تو تم بغیر کسی جھجک کے اس کی تردید کردو۔ ابوسفیان خود بعد میں کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ میری تردید کریں گے تو میں ضرور جھوٹ بولتا لیکن شرماحضوری مجھے سچ ہی بولنا پڑا۔

ذیل میں ہم قیصر اور ابوسفیان کا مکالمہ نقل کر رہے ہیں:

قیصر نے ابوسفیان سے پوچھا:

قیصر: اس مدعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: اصل ونسل سے شریف ہے:

قیصر: اس سے پہلے تمھارے یہاں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: دعوائے نبوت سے پہلے جھوٹ بولتا تھا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

بھی اس سے بہتر نہیں کرسکتا تھا۔ ۶ھ کے اواخر اور ۷ھ کے اوائل میں رسول اللہ نے جزیرۂ عرب کے قرب وجوار کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو خطوط ارسال کیے جن میں انھیں دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دیگئی تھی۔ جیسا کہ صاحب طبقات نے لکھا ہے آپ نے محرم ۷ھ میں چھ ایلچی چھ خط دیکر بھیجے۔ عمرو بن امیہ ضمری حبشہ کے نجاشی کے نام خط لیکر گئے۔ دحیہ بن خلیفہ کلبی مشرقی رومی سلطنت کے قیصر کے نام عبداللہ بن حذافہ سہمی ایران کے خسرو پرویز کے نام حاطب بن ابی بلتعہ اسکندریہ مصر کے حکمران کے نام، شجاع بن وہب اسدی شام کے غسانی حکمران حارث بن ابی شمر کے نام اور سلیط بن عمرو یمامہ کے حکمران ہوذہ بن علی حنفی کے نام۔

ابوسفیان کا عظمتِ پیغمبرؐ کا اعتراف

جب دحیہ بن خلیفہ کلبی نے رسول اللہ کا مکتوب قیصر روم کو پہنچایا تو جیسا کہ انسان العیون، سیرۂ نبویہ، تاریخ طبری اور کامل ابنِ اثیر میں لکھا ہے، قیصر کو تجسس ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ اہلِ حجاز میں سے کسی شخص کو میرے سامنے پیش کیا جائے تاکہ میں اس سے محمدؐ کے بارے میں تحقیق کرسکوں۔ اس زمانے میں ابوسفیان اور قریش کی ایک جماعت تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے۔ انھیں بیت المقدس میں قیصر کے پاس لیجایا گیا۔ وہ دربار میں حاضر ہوئے قیصر نے قریشیوں سے پوچھا کہ تم میں سے کون اس پیغمبر کا سب سے قریبی رشتہ دار ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں ہوں۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ اس قافلے میں ابوسفیان کے سوا اور کوئی بنی عبد مناف میں سے نہیں تھا۔

مقابلے میں تحریف سے محفوظ رہی ہے۔ یہ واقعہ اس قدر صاف، روشن اور غیر متوقع تھا کہ اس کے سامنے امام علیؑ اور امام حسنؑ کے مخالفوں کے سر بھی جھک گئے اور ان کی زبان سے بھی سوائے تحسین و آفرین کے کچھ نہ نکلا۔ جس کسی نے بھی اس موضوع پر لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے، چاہے وہ مؤرخ طبری ہوں یا ابو الفرج اصفہانی، ابنِ واضح کاتب ہوں یا چوتھی صدی ہجری کے عالی قدر شیعہ رہنما شیخ مفید، سب ہی نے اس تحریک کے قائد کی عظمت و بزرگی، شجاعت و صاف گوئی، مردانگی و حریت، آزاد منشی و جواں مردی کی داد دی ہے۔ ۶۱ھ میں امام حسینؑ کی تحریک کچھ ایسے حالات میں انجام پائی کہ وہ لوگ بھی جو تاریخ میں تحریف سے ذرا نہیں ہچکچاتے، تاریخ کے اس مقدس باب میں نہ کوئی پھیر بدل کر سکے نہ اس تحریک کو کوئی اور رنگ دے سکے۔ جو لوگ تاریخ میں تحریف کرنے یا کسی شخصیت کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ فقط اسی وقت اس کام کی جرأت کرتے ہیں جب ایسا کرنے کے لیے حالات سازگار ہوں ورنہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دشمنوں اور مخالفوں کو بھی کسی ہستی کی عظمت و بزرگی کا اعتراف اور پاکیزگی و پارسائی کی تعریف کرنا ہی پڑتی ہے:

"وَالْفَضْلُ مَاشَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَآءُ"

۶ھ میں ابوسفیان اموی کی دشمنی اس امر کی مقتضی تھی کہ قیصرِ روم کے سامنے رسول اللہ کی بدگوئی کرے، آپ کی امانت و دیانت کو چھپائے اور آپ کو دروغ گو اور جاہ پسند بتلائے لیکن اسے ایسا کرنے کا موقع نہیں ملا اور اپنی مصلحت اور طبیعت کے رجحان کے برخلاف رسول اللہ کی تعریف ہی کرنی پڑی۔ اس نے جس طرح آپ کی عظمت کا اظہار کیا کوئی مسلمان

لکھا ہے کہ اہلبیتؑ شام سے واپسی میں عراق و حجاز کے دوراہے سے عراق کی طرف چلے گئے اور چہلم کے دن کربلا پہنچے لیکن اس کی کوئی تاریخی سند نہیں اور نہ جغرافیہ داں عراق و حجاز کے اس دوراہے سے واقف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سید ابن طاؤس بہت بڑے بزرگ تھے۔ علامہ حلی رضوان اللہ علیہ نے ان کے صاحب کرامات ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ ان کی جلالتِ قدر میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن ان کے بیان کردہ اس واقعہ کی تاریخی حیثیت کا قائل ہونا مشکل ہے۔ معلوم نہیں سید خود بھی اس ضعیف اور بے سند بات پر یقین رکھتے تھے یا نہیں!

بہر صورت یہ معاملہ تحقیق کا متقاضی ہے۔ یہ طرزِ فکر کہ ہر بات کو بلا تحقیق اور بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے، حقیقت شناسی سے بعید ہے۔ اگر سید ابن طاؤسؒ ہمارے زمانے میں ہوتے، تب بھی ہم اس معاملۂ خاص میں ان کی طرف رجوع نہ کرتے۔ تنہا ان کا قول اور وہ بھی ایک ایسی کتاب میں جو اہل تحقیق کے مطابق انھوں نے اوائل جوانی میں تصنیف کی تھی، ہمارے لیے تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ محض عامیانہ سوچ ہے کہ ہر اس بات کو جو کسی نے کہی ہے یا کہیں لکھی ہوئی ہے، صحیح تصور کر لیا جائے۔ وہ لوگ جن کا قول سرِ مو غلط نہیں ہو سکتا عام مسلمانوں کے نزدیک صرف رسولؐ اللہ اور اثنا عشری شیعہ مسلمانوں کے نزدیک حضرت رسولِؐ خدا، حضرت فاطمہ زہرؑا اور ائمہؑ اثنا عشر ہیں اور ان کی عصمت عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت ہے۔

تحریک کربلا تحریف سے محفوظ رہی

بہ ایں ہمہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ عاشورہ دوسرے اکثر واقعات کے

اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دمشق میں کب تک قیام رہا اور وہاں سے روانگی کب ہوئی اور کس تاریخ کو مدینہ پہنچے۔ اگر کوئی قابل اعتماد سند ایسی ہوتی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اہل بیتؑ امامؑ کے چہلم کے موقع پر کربلا میں تھے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ شام جاتے ہوئے پیش آیا نہ کہ شام سے واپسی میں۔ اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اہلبیتؑ وسطِ صفر سے دو تین دن بعد شام بھیجے جانے کا حکم موصول ہونے پر شام کے لیے روانہ ہوئے تو یہ کچھ بعید نہیں کہ وہ کربلا کے راستے سے گزرے ہوں اور ۲۰ صفر کو وہاں موجود ہوں اور اپنے عزیزوں اور شہیدوں کی زیارت کے بعد دمشق کے لیے روانہ ہوئے ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ اس کی کوئی قابلِ اعتماد سند موجود نہیں۔ تاریخ کے جستہ جستہ مقامات سے کچھ شواہد البتہ ڈھونڈ کر نکالے جا سکتے ہیں لیکن اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں کہ شام سے واپسی پر اہلبیتؑ چہلم کے دن کربلا آئے ہوں۔ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا یقین کیا جا سکے۔ مناسب یہی ہے کہ ایامِ عاشورا یا اربعین کی مجالس میں اس قسم کی باتوں کا کوئی تذکرہ نہ کیا جائے اور انہی باتوں پر اکتفا کیا جائے جن کا معتبر مآخذ میں تذکرہ ہے۔ نہ امام سجادؑ شام سے عراق آئے، نہ اہلبیتِ عصمتؑ واپسی میں کربلا پہنچے اور نہ جابر بن عبد اللہ انصاری اور عطیہ بن سعد بن جُنادہ عوفی نے جب وہ اربعین کے دن زیارت کے لیے آئے تھے، امامِ چہارم اور اہلبیتؑ سے ملاقات کی۔ جو روایات جابر و عطیہ کی زیارت کے بارے میں ہیں ان میں امام سجادؑ یا اہلبیتؑ سے ان دونوں بزرگوں کی ملاقات قطعاً مذکور نہیں۔ یہ کہانی صرف قصہ گو حضرات کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ صرف سید بن طاؤس رضوان اللہ علیہ نے

امام حسینؑ نے مدینہ سے مکہ روانگی کا قصد کیا اور ان کی انتہا اہلبیتؑ عصمت و طہارت کی مدینہ واپسی کو سمجھنا چاہیے۔ اہلبیتؑ کی مدینہ واپسی کی قطعی تاریخ کا علم نہیں اور نہ یہ صحیح طور پر معلوم ہے کہ اہلبیتؑ نے دمشق میں کتنے مہینے قیام کیا اور کتنی مدت میں شام سے مدینہ کا سفر طے کیا لیکن اجمالاً یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ابھی ماہِ رجب میں ان کی مدینہ سے روانگی کو ایک سال نہیں ہوا تھا کہ امام سجادؑ قید میں ایک مدت گزارنے کے بعد اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ دمشق سے براہِ راست مدینہ واپس تشریف لائے۔

لیکن یہ کہانی کہ اہلبیتؑ شام سے عراق آئے اور چہلم کے دن یعنی ۲۰ صفر کو کربلا پہنچے، کسی طرح بھی قابلِ یقین نہیں اور نہ اس کی کوئی قابلِ اعتماد تاریخی سند ہے۔ اہلِ بیتؑ رجب ۶۰ھ میں مدینہ سے مکہ گئے اور اسی سال ماہ ذی الحجہ میں عراق کے لیے روانہ ہو گئے۔ محرم ۶۱ھ میں امامؑ اور ان کے اصحاب کی شہادت کے بعد بطور قیدی کوفہ لے جائے گئے۔ وہاں شام سے حکم آیا کہ انھیں دمشق بھیج دیا جائے۔ اس کے کچھ مدت بعد — یہ معلوم نہیں کہ کتنی مدت بعد — مدینہ واپس آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلبیتؑ کی کوفہ سے شام روانگی، دمشق میں آمد، وہاں قیام، وہاں سے مدینہ روانگی اور اس مقدس شہر میں آمد، ان میں سے کسی کی بھی صحیح تاریخ معلوم نہیں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس کس تاریخ کو یہ واقعات پیش آئے۔ ہاں قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲ محرم ۶۱ھ کو کوفہ پہنچے اور تقریباً ایک ماہ یعنی وسط صفر سے کچھ بعد تک وہاں قید رہے اور شاید چہلم سے ایک دو روز پیشتر انھیں شام روانہ کیا گیا اور جیسا کہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ربیع الاوّل کے وسط میں دمشق پہنچے۔

اہلبیتؑ سے چھین کر اپنے نام منتقل کرے پھر ہم سے الجھے ورنہ جب تک یہ اعزازات ہمارے پاس ہیں کوئی ہمیں بدنام کیسے کر سکتا ہے ؟ گمنام کیسے کر سکتا ہے اور ہمارا حق غیروں کو کیسے مل سکتا ہے ؟ جو دل ہمارے ساتھ ہیں وہ کسی دوسرے کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتے ہیں؟

اس کے بعد امام نے اپنا تعارف کرایا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجبور ہو کر امامؑ کی تقریر کو روکنے کے لیے اذان دلوادی گئی۔ امامؑ کو بھی ناچار سکوت کرنا پڑا لیکن انھوں نے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھایا۔ جب مؤذن نے کہا "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ" - آپ نے اپنا عمامہ سر سے اتار لیا اور کہا اے مؤذن! تجھے محمدؐ کی قسم ذرا چپ رہ۔ پھر یزید کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: یزید! یہ محمدؐ تیرے نانا ہیں یا ہمارے ؟ اگر تو اپنے نانا بتائے گا تو جھوٹ بولے گا۔ اگر تو مانتا ہے کہ ہمارے نانا ہیں تو پھر تو نے میرے باپ کو کیوں قتل کیا ؟ ان کا مال و اسباب کیوں لوٹا ؟ ان کے اہلِ حرم کو کیوں قیدی بنایا؟ یہ کہہ کر آپ نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا۔ آپ نے اتنا ہی کہا تھا کہ سننے والوں کے سینوں میں ہلچل مچ گئی اور افراتفری کے عالم میں مجمع منتشر ہو گیا۔

اہلِ بیتؑ کا سفر کوفہ و شام

امام حسینؑ کی مقدس تحریک اسلامی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ یہ ایک سال سے بھی کم مدت بظاہر مختصر تھی لیکن اس دوران میں جو واقعات پیش آئے انہوں نے بڑے گہرے اور لازوال اثرات چھوڑے۔ ان واقعات کی ابتدا اس وقت سے قرار دی جا سکتی ہے جب رجب ۶۰ھ کے اواخر میں

ہوں یعنی اس خطیب کی باتوں کا سننا سوائے گناہ وبدبختی کے اور کچھ نہیں اور اس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ لوگ دینِ حق سے منحرف ہو جائیں۔ بہرحال لوگوں نے اصرار کیا کہ علیؑ بن الحسینؑ کو بولنے کی اجازت دیدی جائے۔ یزید انکار کرتا رہا۔ پھر بولا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ علم ودانش ان کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ اگر ان کو بولنے کی اجازت دی گئی تو میں رسوا ہو جاؤں گا۔ آخر لوگوں کے اصرار نے اپنا کام کیا۔ امام عالیمقامؑ نے منبر پر قدم رکھا اور اس طرح تقریر کی کہ سننے والوں کے دل لرز اُٹھے، آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور چیخیں نکل گئیں۔ آپ نے اپنے خطاب میں اسلامی نظام میں اہلبیتؑ کی اہمیت کو واضح کیا اور فرمایا: اے لوگو! حق تعالےٰ نے ہمیں چھ نعمتوں سے نوازا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں ہماری برتری کے بنیادی ستون سات ہیں۔ وہ چھ نعمتیں جو ہمیں عطا ہوئی ہیں یہ ہیں: (۱) علم (۲) حلم (۳) جود وکرم (۴) فصاحت (۵) شجاعت اور (۶) مومنین کی قلبی محبت یعنی لوگوں کو زور اور زبردستی سے عقیدتمند وطرفدار نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ خدا ہی کی مرضی ہے کہ مومنین ہم سے محبت کریں۔ کوئی ان کے دلوں کو پھیر نہیں سکتا اور نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی غیر سے محبت کرنے لگیں اور ہم سے دشمنی رکھیں۔ اس کے بعد آپ نے کہا کہ دوسروں پر ہمارے تفوق کے بنیادی ستون سات ہیں۔ رسولؐ اللہ ہم میں سے ہیں۔ آپ کے وصی علی بن ابی طالبؑ ہم میں سے ہیں۔ سید الشہداء حضرت حمزہؓ ہم میں سے ہیں۔ جعفر طیارؓ ہم میں سے ہیں۔ اس امت کے سبطین حسنؑ اور حسینؑ ہم میں سے ہیں۔ اس امت کے مہدی اور قائمؑ ہم میں سے ہیں یعنی اگر ہو سکے تو یزید ان اعزازات کو

جانشین رسولؐ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسیرانِ اہلبیتؑ میں سے جس نے بھی یزید کو پکارا اس کا نام لیکر ہی پکارا۔

دمشق کی مسجد میں امام سجادؑ کا خطبہ

امام عالیمقامؑ کو شام میں بہترین موقعہ اس دن ملا جب سرکاری خطیب نے منبر پر امیرالمومنین علیؑ اور ان کے فرزندوں کے بارے میں بدگوئی کی اور معاویہ اور ان کے فرزندوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ امام سجادؑ نے یزید سے کہا کہ مجھے بھی اجازت دے کہ میں بھی ان لکڑیوں پر کھڑا ہو کر کچھ کہوں جس سے خدا بھی خوش ہو اور سامعین کے لیے بھی اجر و ثواب کا باعث ہو۔ اس مختصر فقرے میں بھی امامؑ نے بڑی عمدہ بات کہدی۔ یوں کہنا چاہیے کہ امامؑ نے اپنی ساری گفتگو کا خلاصہ اس فقرے میں سمو دیا۔ اول تو آپ نے منبر کو لکڑیوں سے تعبیر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہر اس چیز کو جسے منبر کی شکل دیکر تقریر کے لیے رکھ دیا جائے منبر نہیں کہا جاسکتا۔ دراصل منبر کی عظمت تو اس پر کھڑی ہونے والی ہستی کے دم سے ہوتی ہے۔ یہ لکڑیاں تو منبروں کا وجود مٹانے کے لیے رکھی گئی ہیں۔ یہ خطیب دنیا کے عوض دین فروخت کر رہا ہے کیونکہ یہ مخلوق کو خوش کرنے کے لیے خالق کو ناراض کر رہا ہے۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہوگا۔ اس کے بعد امامؑ نے کہا کہ میں کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتا ہوں جس سے خدا خوش ہو یعنی یہ خطیب جو کچھ کہہ رہا ہے، خدا کی ناراضگی کا سبب ہے۔ امام علی بن ابی طالبؑ جیسی ہستی کی بدگوئی سے اللہ کبھی خوش نہیں ہوسکتا۔ آپ نے کہا کہ میں کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتا ہوں جو سامعین کے لیے موجب اجر و ثواب

پڑھی ہے ؟ اس نے کہا کیوں ؟ آپ نے فرمایا بخدا رسولؐ کے قرابتدار ہمیں تو ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ امام سجادؑ نے اسی ایک سوال سے اس کے ضمیر میں ہلچل پیدا کر دی ہو گی۔ پھر آپ نے پوچھا تم نے قرآن میں آیت "وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ" نہیں پڑھی جس میں ذوی القربیٰ کا حق ادا کرنے کو کہا گیا ہے؟ کہا کیوں ؟ آپ نے فرمایا کہ اس آیت کے مصداق بھی ہمیں ہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کیا تم نے آیہ تطہیر "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا" پڑھی ہے ؟ اس نے کہا کیوں ؟ آپ نے فرمایا: ہمیں تو اہلبیت رسولؐ ہیں جن کی عصمت وطہارت کی گواہی خدا نے دی ہے۔ شامی نے امامؑ کی یہ بصیرت افروز گفتگو سنکر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور تین مرتبہ کہا: یا الٰہی میری توبہ! میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں میں دشمنانِ آلِ محمدؐ اور قاتلانِ اہلبیتؑ سے بیزار ہوں۔ یہ کیسی بات ہے کہ میں قرآن پڑھتا تھا مگر کبھی ان آیات کی طرف توجہ نہیں کی۔

امامؑ چہارم کو ایک اور موقع اس وقت ملا جب یزید کے دربار میں اہلبیتؑ کو پہلی بار پیش کیا گیا۔ امام عالیمقامؑ جو کوفہ سے اب تک بستۂ زنجیر تھے، یوں گویا ہوئے۔ یزید! تجھے خدا کی قسم! تیرا کیا خیال ہے، اگر رسولؐ خدا ہمیں اس حال میں دیکھیں تو کیا کہیں ؟ یہ جملہ بڑا اثر انگیز تھا۔ اسی پر یزید نے زنجیر کھلوادی اور اسی کے اثر سے سب حاضرین مجلس رونے لگے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ امامؑ نے یزید کو نام لیکر مخاطب کیا اور دستور کے مطابق امیرالمومنین نہیں کہا۔ تاریخ میں یہ بات بھی درج ہو گئی کہ اہل بیتؑ زنجیروں میں جکڑے ہونے پر بھی یزید کو امیرالمومنین نہیں کہتے اور نہ اس کی خلافت اور اس کے

اور اہل بیتؑ کے بے مثال تدبر کے قائل ہو جائیں گے۔

امام سجادؑ کو ایک اور موقع اس وقت ملا جب اہل بیتؑ کو دمشق کی مسجد کے دروازے پر لیجا کر کھڑا کر دیا گیا۔ قیدی عموماً وہیں رکھے جاتے تھے۔ ایک شامی بڈھا وہاں پہنچا اور کہنے لگا: " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ قَتَلَكُمْ وَ اَهْلَكُمْ وَقَطَعَ قَرْنَ الْفِتْنَةِ" اللہ کا شکر ہے کہ تم لوگ مارے گئے۔ خدا نے فتنہ پردازوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد دیر تک اہل بیتؑ کو بُرا بھلا کہتا اور گالیاں دیتا رہا۔ امامؑ خاموش رہے اور اسے بکنے دیا۔ جب وہ بک جھک چکا تو امامؑ نے اسے مخاطب کر کے اس کی اس بات کا جواب دیا۔ امامؑ نے اُسے بُرا نہیں کہا، کوئی نامناسب بات نہیں کہی، نہ اس سے شکایت کی کہ تو نے ہمیں گالیاں کیوں دیں؟

امام سجادؑ اس موقع پر بیمار بھی تھے اور مسافر بھی، کوفہ سے دمشق تک کے راستے کا تعب بھی تھا اور تھکن بھی، یوں بھی غمزدہ اور مصیبت زدہ تھے۔ پھر ایک ایسے شہر میں آئے تھے جو دشمن کا مرکز تھا اور جہاں کے در و دیوار اہلبیتؑ عصمت کے مخالف تھے۔ اس شامی بڈھے نے گالیاں بھی دی تھیں۔ بُرا بھی کہا تھا اور اہلبیتؑ پر جو مصیبت پڑی تھی اس پر خوشی کا اظہار بھی کیا تھا اور خدا کا شکر بھی ادا کیا تھا۔ کون ہے جو ایسے میں جھنجھلا نہ اُٹھے اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دے۔ کوئی بھی ان حالات میں ضبط نہیں کر سکتا مگر امامؑ نے ایک مہربان و ہمدرد معلم کی طرح اور اس طرح گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی، اس سے پوچھا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا۔ کیوں؟ فرمایا آیتِ مودت قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى

غرض شام میں بھی امامؑ کو کئی مواقع ملے اور ہر موقع سے آپ نے حتی الامکان فائدہ اٹھایا۔ آپ قید میں تھے کہ دمشق کے بازار میں ابراہیم بن طلحہ بن عبیداللہ تیمی سامنے آیا اور چڑانے کے لیے امام سجادؑ سے کہا: کہو علیؑ بن الحسینؑ! اس معرکے میں فتح کس کی ہوئی؟ مطلب یہ کہ اچھا ہوا کہ تمھیں شکست ہوئی اور تمھارے دشمن کامیاب ہوئے۔ امامؑ نے کہا ابھی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ اذان دو اور اقامت کہو تمھیں معلوم ہو جائیگا کہ جیت کس کی ہوئی یعنی تو چونکہ قریش کے خاندانِ تیم سے ہے اس لیے شاید ہاشم کی شکست سے خوش ہے لیکن جب تک تو مسلمان ہے تجھے اذان و اقامت میں "اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کہنا ہی پڑے گا۔ ہم اسی محمدؐ کے فرزند اور وارث ہیں جن پر درود بھیجے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ جب تک اسلام قائم ہے ہم آلِ محمدؐ کا یہ فخر بھی برقرار رہے گا۔ یہ چھوٹا سا جملہ امامؑ نے ایک شخص کے جواب میں کہا اور شاید آہستہ سے کہا لیکن تاریخ میں آج تک اسکی گونج سنائی دے رہی ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی جملہ ان گنت مقالوں، کتابوں اور تقریروں کے وجود میں آنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس وقت ان باتوں کا حساب نہ ابراہیم لگا سکتا تھا نہ طلحہ نہ کوئی اور۔ اس وقت کسے ہوش تھا کہ مختصر جملے کی کمیت سے قطع نظر کر کے اس کی کیفیت کی طرف توجہ کرے لیکن امامؑ بخوبی جانتے تھے کہ وہ چھوٹا سا جملہ کہنے کے لیے شام آئے ہیں۔ انھوں نے اس سفر میں اس چھوٹے سے جملے کے سوا کچھ نہیں کہا۔ جو مقصد ان کے پیشِ نظر تھا اس کے حصول کے لیے یہی جملہ کافی تھا۔ جو لوگ آج بھی اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے، وہ بھی مستقبلِ قریب میں امام حسینؑ ان کے اصحاب

جواب میں قرآن کی یہ آیت پڑھی: اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا
یعنی اللہ جانوں کو لے لیتا ہے جب ان کی موت آتی ہے لیکن قاتل خدا نہیں ہوسکتا۔ ابنِ زیاد یہ دیکھ کر کہ ایک بیمار قیدی بار بار الٹ کر اسکی بات کا جواب دے رہا ہے غصے میں لال پیلا ہوگیا اور کہنے لگا "اب بھی تجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میرے سامنے زبان چلائے؟ لیجاؤ اسے" اسکی گردن ماردو۔

زینب کبریٰؑ تو یہ فقرہ سن کر بہت پریشان ہوگئیں لیکن امامؑ نے ابن زیاد سے صرف اتنا کہا کہ تو مجھے مار ڈالے گا تو ان پاکباز خواتین کو کس کے ساتھ بھیجے گا۔ پھر فرمایا کہ کسی پرہیزگار مسلمان کو ان کے ساتھ بھیجنا جو اسلامی آداب کے مطابق ان سے برتاؤ کرے۔

امام زین العابدینؑ نے اپنی جاں بخشی کی قطعاً کوئی درخواست نہیں کی بلکہ یہ فرمایا کہ میرے قتل کے بعد ان پاکباز خواتین کو ایسے لوگوں کے ہمراہ مدینہ نہ بھیجنا جو متقی نہ ہوں [۱]

---

[۱] لہوفِ سید میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح ہے کہ جب ابنِ زیاد نے علیؑ ابن الحسینؑ کے قتل کا حکم دیا تو زینب کبریٰؑ نے فرمایا: "یَا ابْنَ زِیَادٍ اِنَّکَ لَمْ تُبْقِ مِنَّا اَحَدًا فَاِنْ کُنْتَ عَزَمْتَ عَلٰی قَتْلِہٖ فَاقْتُلْنِیْ مَعَہٗ" ابنِ زیاد! اگر تو نے ان کے قتل کا فیصلہ کرلیا ہے تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہی قتل کردے۔

امامؑ نے فرمایا: پھوپھی جان! آپ نہ گھبرایئے۔ میں خود اسے جواب دونگا۔ پھر ابن زیاد کو مخاطب کرکے کہا: "أَبِالْقَتْلِ تُهَدِّدُنِیْ یَا ابْنَ زِیَادٍ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْقَتْلَ لَنَا عَادَةٌ وَکَرَامَتُنَا الشَّہَادَةُ" ابن زیاد! تو مجھے قتل کی دھمکی دے رہا ہے، کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہمارے لیے عزت ہے۔

میرے والد اور میرے بھائیوں کا غم ہی تازہ ہے۔ میں ابھی اسی صدمے سے جانبر نہیں ہوا ہوں۔ بس تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم نہ ہمارا ساتھ دو نہ ہماری مخالفت کرو۔ حسینؑ ابن علیؑ کے قتل پر ہی کیا موقوف ہے علیؑ جو اُن سے بہتر تھے، اے اہل کوفہ! تم نے انھیں بھی قتل کیا۔ میری جان صدقے میرے پدر گرامی پر، تم نے فرات کے کنارے انھیں بھی شہید کر دیا۔ ان کے قاتلوں کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

کچھ دیر توقف کے بعد فرمایا:

اگر تم ایک دن ہماری موافقت اور اگلے دن ہماری مخالفت چھوڑ دو تو ہم تم سے بہت خوش ہیں۔

اس کے بعد امام سجادؑ کو گفتگو کا موقع اس وقت ملا جب انھیں ابن زیاد کے سامنے مجلسِ عام میں لایا گیا۔ آپ نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور مختصر جملے کہہ کر ساری مجلس کو متاثر کر دیا۔

جب آپ کو ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے پوچھا: تم کون ہو؟ فرمایا علیؑ ابن الحسینؑ۔ اس نے کہا علیؑ کو تو خدا نے مار ڈالا۔ امامؑ نے فرمایا: میرا ایک بھائی تھا۔ اس کا نام بھی علیؑ تھا، لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔

مطلب یہ تھا کہ معصیت کو خدا کی طرف منسوب مت کرو اور الٹی سیدھی ٹانگ مت بول۔ کربلا میں علی بن الحسینؑ (حضرت علی اکبر) کے قاتل لوگ تھے نہ کہ خدا۔

ابن زیاد نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے کہ خدا نے اسے مار ڈالا؟ امامؑ نے

اور جس کی آپ کے ساتھ صلح ہوگی، اس کے ساتھ ہماری بھی صلح ہوگی۔ ہم یزید کو گرفتار کرنے کی بھی فکر کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ پر ظلم کیا ہے ہم ان سے بیزار ہیں۔

لوگوں کی اس گفتگو سے جو ابن طاؤس رضوان اللہ علیہ نے نقل کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اب بھی امامؑ کا مقصد نہیں سمجھے تھے اور یہ خیال کر رہے تھے کہ آپ جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں اور سپاہ و لشکر کی تیاری کی فکر میں ہیں۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ تحریک کا وہ حصہ جس کے لیے مسلح جدوجہد اور شہادت کی ضرورت تھی مکمل ہو چکا ہے۔ اب جنگ، خونریزی اور شمشیر کشی کی ضرورت نہیں۔ اب جو حصہ باقی ہے وہ بھی غیر فانی خطبے ہیں جن کے ذریعے سے اسلامی تاریخ میں واقعاتِ عاشورا کی عکاسی ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ جو وعدے امام سجادؑ سے کر رہے تھے اور جو اطمینان انھیں دلا رہے تھے وہ اس عہد و پیمان سے زیادہ تو نہیں تھا جو انھوں نے امام حسینؑ سے کیا تھا اس لیے نہ اس کی کوئی وقعت تھی نہ اس پر کوئی بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ یہ وعدے ایسے ہی بے معنی تھے جیسے وہ بیعت جو انھوں نے مسلم بن عقیل سے کی تھی یا وہ خطوط جو انھوں نے امام حسینؑ کو لکھے تھے۔

اس لیے امام سجادؑ نے فرمایا:

اے بے وفا مکارو! تمھاری خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ تم میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہتے ہو جو تم نے میرے پدر بزرگوار کے ساتھ روا رکھا تھا۔ خدا کی قسم ابھی تک وہ زخم نہیں بھرا۔ ابھی کل ہی میرے پدر بزرگوار اور ان کے ساتھی شہید ہوئے ہیں ابھی تو

خدا تمھیں غارت کرے، تم نے اپنی عاقبت کا یہ سامان کیا ہے! یہ تو
تم نے اپنی روسیاہی کا انتظام کر لیا۔ کل جب رسولِ خداؐ سے سامنا
ہوگا تو انھیں کیا منہ دکھاؤ گے؟ اس وقت آنحضرتؐ تم سے کہیں
گے کہ تم نے میرے فرزندوں کو قتل کیا ہے اور میرے ساتھ بے حرمتی کا
سلوک کیا ہے، تم میری امت نہیں ہو۔"

امامؑ کے ان چند جملوں نے اہلِ کوفہ کی سوچ بدل دی۔ جو لوگ قیدیوں کا تماشا دیکھنے ہنستے ہوئے آئے تھے ان کے چہروں پر رنج و فکر کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ان کے گلے رندھ گئے۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ لوگ ہر چند ضبط کرنا چاہتے تھے مگر نہیں کر سکتے تھے۔ آخر اِدھر اُدھر سے چیخوں اور سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ ایک دوسرے کو ملامت کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا: تو نے بہت بُرا کیا، اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ دوسرے نے کہا: اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں!

لوگ آنسو بہا رہے تھے، آہیں بھر رہے تھے کہ امامؑ نے پھر کہا: ان پر خدا کی رحمت ہو جو میری بات سنیں اور خدا و رسولؐ اور اہلبیتِ پیغمبرؐ کے بارے میں میری نصیحت قبول کریں۔ رسولِ خداؐ کی پیروی ہمارا فرض ہے۔

اس مختصر سے خطبے سے ایسا انقلاب نظر آنے لگا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ اے فرزندِ رسولِ خداؐ ہم آپ کی باتیں سنیں گے، آپ کا کہا مانیں گے، آپ سے کیے ہوتے وعدوں پر کاربند رہیں گے اور آپ سے منہ موڑ کر کسی اور کا ساتھ نہیں دیں گے۔ آپ جو فرمائیں ہم اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ جس سے لڑیں گے، ہم بھی اس سے لڑینگے

یہ کون سی فخر کی بات ہے کہ کسی کو لوٹ لیا گیا' اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی' اس کے رشتے دار مارے گئے۔ یہ مصیبت تو ہے' فخر کی بات نہیں چنانچہ اس فقرے نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ تحقیق و تجسس اور مزید غور و فکر سے کام لیکر تاریخ اسلام میں اس تحریک کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں اور معلوم کریں کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کی بات میں کتنا وزن ہے اور یہ باقی مسلمانوں کی طرح خاموش کیوں نہیں بیٹھے؟ انھوں نے کیوں دربارِ خلافت کی ہر پیشکش مسترد کر دی؟ اس میں کیا حرج تھا اگر امام حسینؑ یزید کی بیعت کر لیتے اور مسلمانوں میں عزت سے زندگی گزارتے؟ نہ عزیزوں کو ہاتھ سے کھوتے نہ اپنی جان ہی جھگڑے میں گنواتے۔ امام سجادؑ کے انہی فقروں نے لوگوں کو جھنجھوڑا اور انھیں بات سننے پر آمادہ کیا۔ شاید بہت سے لوگ کہہ رہے ہوں گے کہ اچھا ہی ہوا کہ یہ لوگ مارے گئے" زندگی معمول پر آ گئی۔ عراق کے راستے جو کچھ دنوں سے بند تھے پھر کھل گئے۔ آمد و رفت میں جو دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دُور ہو گئیں۔ عام لوگوں کی تو یہ سوچ تھی۔ ایسے میں امام سجادؑ نے بہ بانگ دہل کہا کہ ہمارے لیے یہی فخر کافی ہے کہ ہمیں قتل کیا گیا اور ہمارا اسباب لوٹ لیا گیا۔ بات کہنے کے اس انداز سے لوگوں کو ایک جھٹکا سا لگا اور ان میں تحقیق و تجسس کی لہر دوڑ گئی۔

امام سجادؑ نے فرمایا:

"لوگو! تمھیں خدا کی قسم! تمھیں معلوم ہے کہ تم نے میرے پدر بزرگوار کو خط لکھے تھے لیکن پھر تم نے ان کو دھوکا دیا۔ تم نے ان سے پختہ وعدے کیے تھے لیکن پھر ان سے جنگ کے لیے کھڑے ہو گئے۔

امام سجادؑ نے ایک کوفی سے دشمن کی بیہودگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا دریائے فرات کے کنارے سر قلم کر دیا گیا حالانکہ اس نے نہ کسی کا خون بہایا تھا نہ کوئی حق غصب کیا تھا یعنی اسے بے جرم و خطا قتل کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں کہ جب اس میں مقابلے کی طاقت نہ رہی اور وہ گر گیا تو اس کی چھاتی پر چڑھ کر اسے شہید کیا گیا، ہمارے لیے یہی فخر کافی ہے۔

امامؑ چہارم نے اس فقرے میں لوگوں کو شہادت کے واقعہ پر مزید غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ آپ نے بے کسی کی حالت میں مارے جانے کو قابلِ فخر بات قرار دیا ہے اور فخر بھی ایسا جس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے فخر کی حاجت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے یہی فخر کافی ہے کہ ہمارا خون بہایا گیا، ہمارا مال لوٹا گیا، ہماری بے حرمتی کی گئی اور ہماری عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا۔ امامؑ چاہتے ہیں کہ لوگ اس پر غور کریں کہ اس جد و جہد کا مقصد کیا تھا، اس تحریک کا سربراہ کیا چاہتا تھا اور اس نے کیا کیا۔ اگر صرف اتنی سی بات تھی کہ وہ خلیفہ بننا چاہتا تھا اور چونکہ خلافت کسی اور کو مل گئی تھی اس لیے بے چین تھا اور اسی آرزو میں جان کی بازی لگا دی تھی اور اسی ہوس میں جان اور مال سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا تو اس طرح تو کوئی فخر کی بات نہیں بلکہ یہ تو شرم کی بات ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امام سجادؑ ایسی بات پر فخر کریں اور یہ کہیں کہ ہمارے لیے یہی فخر کافی ہے!

ان کے اس فقرے پر لوگوں کو ضرور تعجب ہوا ہوگا کہ آخر یہ واقعہ فخر کا موجب کیسے بن گیا؟ کیا لوگ مارے نہیں جاتے؟ سیاسی جنگوں میں کیا کم جانیں تلف ہوتی ہیں؟ ہنگاموں اور فسادات میں کیا جان و مال کا کم نقصان ہوتا ہے؟

داستان بیان کر رہے ہیں اور غم زدہ اپنے باپ، بھائی کی موت پر گریہ و ماتم کر رہے ہیں۔ انھیں قطعاً یہ خیال نہیں تھا کہ اہلبیتؑ دراصل اس تحریک کے خدائی نقشے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

واقعات کی جو تشریح و توضیح وہ کر رہے تھے اس کے بغیر سید الشہداءؑ کا کارنامہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بات کا قرار واقعی اندیشہ تھا کہ کہیں کل کلاں اس جدوجہد کو جس کی سربراہی مقدس و معزز ترین اسلامی ہستیوں نے کی تھی دنیاوی اور مادی اغراض کی تحریک ظاہر کر کے اصل حقیقت مسلمانوں اور آئندہ نسلوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ کر دی جائے اور تاریخ میں من گھڑت کہانیاں درج نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ زینب کبریٰؑ، ام کلثومؑ اور سید سجادؑ نے اسیری اور رنج و الم کے باوجود عزم صمیم کے ساتھ لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ انھوں نے سوگواروں کی سی صورت نہیں بنائی اور نہ ہی دشمن کی خوشامد کی، بلکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے موقع سے اپنے عظیم تر مقصد کے حصول کے لیے فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے ناواقفیت یا گمراہی کے باعث انھیں برا بھلا بھی کہا یا دشنام طرازی بھی کی تو انھوں نے اسی بہانے اس سے بات چیت شروع کر دی اور اس طرح اس کے خیالات بدلے کہ آخر اس بدگو نے وہیں توبہ کر لی اور اہلبیتؑ کا حامی بن گیا۔

اہلبیتؑ نے اپنی ذہانت سے وہ کام لیا کہ دشمن کی گالیوں سے بھی انھیں ہی فائدہ پہنچا۔ وہ اس بات کو غنیمت سمجھتے تھے کہ کوئی ان سے بات کرے چاہے گالیاں ہی دے یا مذاق ہی اڑائے کیونکہ اس طرح انھیں اپنی بات کہنے اور لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کا موقع ملتا تھا۔

کرنے کے لیے رضا کار طلب کیے اور شاید یہ بھی احتیاط کی کہ خود ہی کچھ لوگوں کو نامزد کر کے انھیں حکم دے کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ اس شرمناک حرکت میں شرکت سے انکار نہ کر دیں لیکن احتیاط غیر ضروری اور اندیشہ بیجا تھا۔ مؤرخوں کے بقول دس رضا کار فوراً ہی آمادہ ہو گئے جنھوں نے گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو کر مطلوبہ کام بڑے جوش و خروش سے انجام دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ تاریخ میں ان دس کمینوں کا نام بہ نام تذکرہ موجود ہے۔ طبری اور مفید نے دس میں سے دو کا نام لیا ہے۔ ایک تو اسحاق بن حیوۃ حضرمی جس نے امامؑ کا پیراہن لوٹا تھا اور دوسرا اخنس بن مرثد حضرمی جو امامؑ کا عمامہ اچک کر بھاگا تھا۔ اگر امام سجادؑ بیماری، سفر کی تھکن، اسیری کی پریشانی یا صدمے سے نڈھال ہونے کے سبب خاموشی اختیار کر لیتے اور روزِ عاشورا کے واقعات کی کوفہ کے بازار میں تصویر کشی نہ کرتے یا زینبؑ و ام کلثومؑ اور فاطمہ بنتِ حسینؑ کوفہ کے بازار میں تقریریں نہ کرتیں تو دشمن کو تاریخ کے مسخ کرنے کا موقع مل جاتا۔ پھر بنی امیہ کہاں اجازت دیتے تھے کہ ان کی رسوائی اور بدبختی کی کہانی اسلامی تاریخ کا جزو بن سکے اور بنی ہاشم ہمیشہ کے لیے اپنے حریف کو بیداری، انسانیت اور حسنِ اخلاق کے میدانوں سے نکال باہر کریں۔ جس وقت یہ تقریریں ہو رہی تھیں اس وقت مقرروں کو تو بخوبی معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور اس کا کیا اثر ہوگا، البتہ باقی لوگوں کو قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ تقریریں جو کبھی بازار میں، کبھی دربار میں اور کبھی مسجد میں کی جا رہی ہیں، ان کا تاریخ پر کیا اثر پڑے گا اور مستقبل قریب میں لوگوں کی سوچ کس حد تک بدل جائے گی۔ لوگوں کی اکثریت محض یہ سمجھ رہی تھی کہ مصیبت زدہ بیچارے اپنی مصیبت کی

میں درج ہوگئیں۔

شیخ مفید اور طبری نے لکھا ہے کہ جو لباس امامؑ کے جسم پر باقی رہ گیا تھا وہ شہادت کے بعد لوٹ لیا گیا۔ امامؑ کا پیراہن اسحاق بن حیوۃ نے بدن پر سے اتارا۔ امامؑ کا زیر جامہ بحر بن کعب تمیمی لے گیا۔ امامؑ کا عمامہ اخنس بن مرثد لے بھاگا۔ امامؑ کی شمشیر قبیلۂ بنی دارم کا ایک شخص لے گیا۔ امامؑ کی مخملی چادر قیس بن اشعث بن قیس کندی لے اڑا۔ بعد میں وہ کوفہ میں قیس قطیفہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ امامؑ کے جوتے قبیلۂ اود کے اسود نامی ایک شخص نے امامؑ کے پاؤں سے اتار لیے۔ اس کے بعد یہ لوگ خیموں پر ٹوٹ پڑے اور جو کپڑے اور برتن، سامان اور اونٹ وہاں تھے سب لوٹ کر لے گئے۔ کمینہ پن کی انتہا یہ کہ خواتین کے سروں پر سے چادریں گھسیٹ لیں۔ یہ تمام تفصیلات تاریخ میں کہاں سے آئیں؟ اہلبیتؑ کے انہی خطبوں اور تقریروں سے جنھوں نے عاشورے کی روداد کو اس قدر تفصیل اور وضاحت سے تاریخ کے صفحات پر منتقل کر دیا۔

تاریخ میں نہ صرف اس کی تصریح ہے کہ ابن زیاد نے ابن سعد کو یہ حکم دیا تھا کہ امامؑ کا لاشہ گھوڑوں کے سموں تلے روندا جائے بلکہ اس حادثے کی تمام جزئیات بھی بے کم و کاست مذکور ہیں۔ شیخ مفید، طبری اور دوسرے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ کچھ لشکری یہ چاہتے تھے کہ امامِ چہارمؑ کو قتل کر دیں۔ ابن سعد نے خیمے پر پہنچ کر حکم دیا کہ کوئی شخص اس بیمار سے تعرض نہ کرے اور نہ غم زدہ خواتین کو ستائے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ لوگوں نے خیمے لوٹ لیے ہیں تو اس نے حکم دیا کہ سب سامان واپس کر دیا جائے لیکن پھر بھی کسی نے کوئی چیز واپس نہیں کی۔

اس کے بعد ابن سعد نے ابن زیاد کے حکم کی تعمیل میں امامؑ کے جسدِ اطہر کو بلکہ کو

لوگو! جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا اسے میں بتلاتا ہوں کہ میں اس کا بیٹا ہوں جس کی بے حرمتی کی گئی، جس کا مال واسباب لوٹا گیا، جس کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا۔

واقعی اگر امام سجادؑ عراقیوں کی لوٹ مار اور بیہودگیوں کا تذکرہ نہ کرتے اور اس وقت جبکہ حادثے کو ابھی ایک دو دن ہی ہوئے تھے دربار خلافت میں ابھی شادیانے ہی بج رہے تھے اور یہ خبر نہیں تھی کہ ظالموں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودی ہے اس وقت اگر آپ واقعہ کی تفصیل بیان نہ کرتے اور دشمن کی ناہنجاری کا پردہ فاش نہ کرتے تو کوئی بعید نہیں تھا کہ اسلامی تاریخ میں اس معاملے کو کچھ اور ہی رنگ دیدیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تک لکھ دیا جاتا کہ اہلبیت کو کوفہ اور شام احتراماً لے جایا گیا اور اس کا مقصد ان کی دلجوئی تھا، نہ اس میں زور زبردستی کا کوئی دخل تھا اور نہ انھیں قیدی بنانا مقصود تھا لیکن امامؑ چہارم نے اپنے خطبے کے پہلے ہی فقرے میں عاشورا کی صحیح تاریخ بیان کردی۔ یہاں تک کہ یہی باتیں تیسری صدی ہجری میں اسلامی تاریخ کی معتبر کتابوں میں درج ہو گئیں اور خلفائے بنی امیہ بھی اپنی تمام طاقت وقدرت کے باوجود ان میں ایک حرف کا بھی ردوبدل نہ کر سکے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ کم از کم خیموں کو لوٹنے اور امامؑ کے جسم پر سے کپڑے اتارنے کا تذکرہ تو تاریخ کے صفحات پر سے مٹا ہی دیتے اور اس شرمناک کارروائی کی یاد مسلمانوں کے دل سے محو کر دیتے مگر اہلبیت امامؑ نے قید میں ہوتے ہوئے بھی بنی امیہ کے ہاتھ سے یہ طاقت چھین لی اور ایسی کارروائی کی کہ نہ صرف واقعات میں ردوبدل کی راہیں مسدود ہو گئیں بلکہ قاتلان امامؑ کے کمینہ پن کی تمام جزئیات تاریخ

کی ترغیب اور برائیوں سے تنبیہہ ہی کی بات ہے۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور وہاں بت پرستی کی بساط لپیٹ دی گئی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے حنین میں قبیلۂ ہوازن کے مقابلے میں جس نے مسلمانوں پر حملے کا ارادہ کیا تھا کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد رسولؐ اللہ نے طائف کا قصد کیا تاکہ وہاں سے بھی بت پرستی کا خاتمہ کیا جائے اور لات کا بت خانہ جو طائف کا کعبہ کہلاتا تھا مسمار کر دیا جائے لیکن ایک مدت تک طائف کا محاصرہ کرنے کے باوجود طائف فتح نہ ہو سکا۔ رسولؐ اللہ وہاں سے پہلے مکہ اور پھر مدینہ واپس تشریف لے آئے لیکن ۹ھ میں طائف کے سردار اور وہاں کے قبائل کے نمائندے خود رسولؐ اللہ کے پاس مدینہ آئے اور پیشکش کی کہ ہم مسلمان ہو جاتے ہیں مگر اس شرط پر کہ ایک تو ہمیں نماز سے معاف رکھا جائے اور دوسرے تھوڑی ہی مدت کے لیے سہی بت کدۂ لات کو مسمار نہ کیا جائے۔

اگر مقصد صرف طائف کی فتح ہوتا تو چاہیے تھا کہ رسولؐ اللہ بلا تامل یہ تجویز منظور کر لیتے اور غنیمت سمجھتے کہ شہر ہاتھ آ رہا ہے۔ شہر کو اسلامی حکومت میں شامل کر لیتے اور طائف کے نومسلموں سے زکوٰۃ اور دوسرے ٹیکس وصول کرتے۔ وہاں کے مردوں کو اسلامی جنگوں میں شرکت کی دعوت دیتے اور اس طرح اسلامی لشکر کی تعداد میں اضافہ کر لیتے لیکن اگرچہ فتوحات اور دوسرے فوائد کے نقطۂ نظر سے ان شرائط پر اہل طائف کے اسلام قبول کرنے میں مسلمانوں کا فائدہ تھا لیکن رسولؐ اللہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے اور جب تک اہل طائف اپنی شرائط پر اصرار کرتے رہے، آپ نے ان کا اسلام قبول نہیں کیا۔ آخری جواب جو آپ نے دیا وہ یہ تھا:

'جہاں تک اپنے ہاتھوں سے اپنے بت توڑنے کا سوال ہے تو

ہم تمھیں یہ کام معاف کیے دیتے ہیں۔ اس کام کے لیے دوسرے آدمی بھیج دیے جائیں گے۔ رہی نماز تو جس دین میں نماز نہ ہو اس کا کچھ فائدہ نہیں یعنی شہر طائف کیا، اگر کوئی ملک بھی فتح کیا جائے اور وہاں کے لوگ نماز نہ پڑھیں تو ایسی فتح بیکار ہے۔"

اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر لوگ دیندار ہوں مگر دین شناس نہ ہوں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

Knowledge for All
٧٨٦
٩٢-١١٠
یا صاحب الزماں ادرکنی
DVD Version
یا عباس
لبیک یا حسینؑ
خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی
اسلامی کُتب (اردو) DVD
ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔
www.ziaraat.com
SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com
NOT FOR COMMERCIAL USE